

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_224275

UNIVERSAL
LIBRARY



نیاز فحیم پوری لکھا

قواعد رسالہ نگار

- ۱ رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شائع ہوتا ہے۔
- ۲ رسالہ نہ پہنچنے کی صورت میں میں تاریخ سے پہلے دفتر کو اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائے گا
- ۳ خط و کتابت کے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھئے جو نمبر خریداری نہیں ہوتا ایسے خطوط ضائع کر دیے جاتے ہیں
- ۴ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا اگر کالکٹ آنا ضروری ہے
- ۵ مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہئیں
- ۶ سالانہ قیمت پانچ روپیہ ہشتماہی تین روپیہ

(نگار)

تصویر قاصد

بنگلہ کے مشہور مصور مرزا کے قلم کی
بہترین صناعی یہ تصویر بھی رنگیں آرت
سپریمر طبع کرا لی گئی ہے اور یہ تصویر
رسالہ نگار ماہ ایچ میں شائع ہو چکی
ہے آپ دیکھیں گے تو بہت خوش ہونگی
قیمت فی کاپی صرف ۲۰

تصنیفات

مولانا نیاز
فتح پوری

صحائیات

یعنی عہد سعادت کی اظہار و غنائیں
نمائات صبح اور مستند حالات خواتین
کے مطالعہ کے لئے ضروری چیز ہے

تصویریں بالاسریم

یہ تصویر صنعت و نقاشی کا ایک نادر نمونہ
ہے رنگیں آرت سپریمر طبع کرا لی گئی
ہے یہ وہی تصویر ہے جس کو حکومت
نے نہایت گراں قیمت پر خرید کر کے
پرنس میوزیم کو دیا ہے نہایت نفیس
چیز ہے قیمت صرف ۱۸

تاریخ الدولین	نگارستان	شہاب کی سرگزشت گوارہ تمدن	جذبات بھاشا	المسلۃ الشرعیہ
علامہ جرجی زیدان کی تاریخ تمدن اسلامی پانچویں حصہ ترجمہ ابو مضاہرین کا مجموعہ	حضرت نیاز کے تمام بہترین نفسی کے اصول پر لکھا گیا علم اردو میں پہلا نامور کتب خانہ	اس میں ثابت کیا گیا ہے کہ ہندو وہاں نشانی کی ترقی کی قدر و کامیابی کی نعمت ہے قیمت ۱۲	ہندی شاعری کے بیشل نمونے قیمت ۱۲	مصطفیٰ کامل پاشا کی مشہور عربی کتاب کا ترجمہ

نرخ نامہ اجرت اشتہارات	تعداد طبع ایک صفحہ	تعداد طبع ایک صفحہ	تعداد طبع ایک صفحہ	تعداد طبع ایک صفحہ
(۱) اجرت ہر حال میں پیش کی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان تین ماہ سے زیادہ اشتہار دیں گے ان کو میں فیصدی کمیشن دیا جائے گا (۳) مسیاد اشتہار کے اردو نمونے قبل اطلاع دینی ضرور ہونے چاہئے	بارہ مرتبہ ۱۰۰ روپیہ	چھ مرتبہ ۶۰ روپیہ	تین مرتبہ ۳۰ روپیہ	ایک مرتبہ ۱۲ روپیہ
	۲۰ روپیہ	۱۰ روپیہ	۴ روپیہ	۲ روپیہ

باشنم
نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

شمار ۱

فہرست مضامین جولائی ۱۹۲۷ء

جلد ۱۲

۸۹	تجدد اسرائیلی	۲	ملاحظات
	امین حزمین	۵	غالبہ کا ذوق فارسی
	بارہ محبوبانی	۱۲	طنزیات
	نائب کانپوری	۱۸	نخانے کا راز (فضا)
	دل شاہجہانپوری	۳۲	ابن یسین
	جگر بریلوی	۴۷	علم فراست الید
	فرخ بخاری	۵۵	مراد (فضا)
	نظیر نودھیانوی	۶۸	اگر آئین اکبری میں
	مجنوں گورکھپوری	۷۳	تاریخ کا ایک گشدہ ورق (فضا)
۹۲	استغارات	۷۷	✓ حالی اور شاعری
۹۶-۹۴	معلومات	۸۳	مکالمات
			مارموزی

ہر قسم کا عطر صفر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے عمدہ رنگا کر استعمال کرنا

CHECKED 1951

CHECKED. 1951

برائش

۵۵

مفتی

سلیط

Checked 1965

نگار

اڈیسٹر۔ نیاز فتحپوری

1952

شمار (۱)

جولائی ۱۹۲۶ء

جلد (۱۲)

ملاحظات

جیت لوگوں کو گرمی اور بارش کا زمانہ بھوپال میں بسر کرنے کا موقع ملا ہے وہ واقف ہیں کہ یہ دونوں موسم دہاں کے کس قدر
 بچے اور بزرگ لطف ہوتے ہیں۔ اس لئے اب جو میں بارہ سال تک ان دونوں کا لطف اٹھانے کے بعد یہاں آیا ہوں، تو ایسا
 محسوس کرتا ہوں کہ گرمی شاید خدا کا کوئی عذاب ہے جو ہر سال نیند پر نازل ہوتا ہے اور جس سے نجات پانے کی کوئی
 تدبیر انسان کے پاس نہیں ہے۔ باوجودیکہ تمام وہ ذرائع جو تمدن کی اس عمدہ ترقی میں تمازت آفتاب اور برہمی موسم سے بچنے
 کے لئے دیا ہو سکتے ہیں مجھے حاصل ہیں، لیکن اس کا کیا علاج کہ گرمی خود اپنے اندر سے اہلٹی ہوئی نظر آتی ہے اور معدوم
 ناکام دل کی نفس سر پہی آہ زباں سوز ہو کر نکلتی ہے پھر جس وقت یہ خیال کرتا ہوں کہ موت و حیات کے درمیان یہ کشمکش یہاں
 تقریباً اکتوبر تک اسی طرح رہیگی تو دل میٹھنے لگتا ہے اور بے اختیار دل چاہتا ہے کہ ہمارے لئے پہلے ہی دامن و گرمیاں
 کے فاصلہ کو کم کر دیا جائے حقیقت یہ ہے کہ جس ملک میں سال کا نصف حصہ اس طرح بسر ہو جہاں سال میں چار مرتبہ
 ”مداخلت نصیبتیں“ آدمی کو مہینوں صاحب فرما رہے رکھے، وہ ملک کیا خاک تر تری کر سکتا ہے اور وہاں کے بد نصیب افراد
 کیا دائمی و ذہنی امتیاز حاصل کر سکتے ہیں۔ آخری کابی کسی جا رہی تھی اور میں گرمی کے خلاف ستیا گرہ کے ہوسے بیکار پڑا ہوا تھا

فر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے خرید کر لایا جا رہا ہے

کہ مولوی نور الرحمن بی لے (بھکاری بی) کو جو حسن اتفاق سے آج کل میرے ہمارے ہیں، مجھے رحم آیا اور انھوں نے معلومات کا حصہ دے کر دیا۔ جب سے بھکاری جاری ہوا ہے، غالباً یہ پلا موقوف ہے کہ ماحول سے متاثر ہو کر بھکاری کی ترتیب کی طرف میں نے اپنے آپ کو مشغول پایا ہو ہی سبب ہے کہ میں اس مینے باب استفسار کی طرف بہت کم توجہ کر سکا۔

مقالہ آرگس کے جواب میں ابن یمن اور حافظ کی نزاع پر جناب میر ولی اللہ صاحب بی لے کا مضمون حسب وعدہ اس مینے میں شائع ہو رہا ہے۔ گو آرگس کے استدلال پر اس سے زیادہ بحث و تحقیق کی ضرورت نہ تھی لیکن اگر میر ولی اللہ صاحب سعی فرماتے تو اس سے زیادہ تکمیل اس مضمون میں پیدا کر سکتے تھے۔ بہر حال اس مضمون کے بعد جناب آرگس کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اس کا جواب دین یا اپنی غلطی کا اعتراف کریں۔

جناب آسی کا مضمون طنزیات جاری ہے اور غالباً آئندہ ماہ کے رسالہ میں ختم ہو جائے گا خالص بھتیوں پر ایک مضمون فوجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی نے بھی ازراہ کرم عنایت فرمایا ہے جسے آپ اگلے مینے کے رسالہ میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

اس وقت تک رسالہ "قشاش" کا اجراء التوا میں ہے، لیکن جیسا کہ وعدہ کیا گیا تھا دو جزو کے فسانے بھکاری میں شائع لئے جا رہے ہیں۔ یہ خانے کا راز۔ کینٹل ڈائل کے فسانہ کا ترجمہ ہے اور مراد حضرت مجنوں گورکھپوری کا طبع زاد فسانہ ہے جس میں انھوں نے اپنی انداز تحریر کی خصوصیات کو پوری طرح قائم رکھا ہے اور شخصیت بھکاری کی ایک اچھی شائستگی

تیسرا فسانہ عبدالرحمن الدافل کے متعلق ہے جو باوجود تاریخی واقعات ہونے کے صفحات تاریخ سے معدوم ہے اس ناظر سے یہ فسانہ بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے، گزشتہ ماہ کے رسالے میں نیولین کی بیوی جو ز فائین کے متعلق بھی ایک ایسا ہی سجاد اقدہ درج کیا گیا تھا جو تاریخ کی کتابوں میں نظر نہیں آتا۔

حالی کی شاعری کے متعلق سید اعجاز حسین صاحب بی لے کا مضمون آئندہ مینے میں ختم ہوگا۔ ہر چند سید صاحب نے کافی محنت کے ساتھ یہ مضمون مرتب کیا ہے۔ لیکن یہ موضوع اس سے زیادہ وسعت کا محتاج ہے اور خالص شاعرانہ

اعلیٰ درجہ کا عطر صفر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگا کر استعمال کرنا چاہیے

نقطہ نظر سے بھی نہایت غائر نقد و تبصرہ چاہتا ہے، کیونکہ حالی کے متعلق ان حلقوں میں جہاں شاعری نام صرف ایک مخصوص رنگ تغزل کا ہے، یہ سورتین پایا جاتا ہے کہ حالی ناظم ضرور تھے لیکن شاعری سے انھیں کوئی نگاہ نہ تھا۔ حالانکہ اس سے زیادہ تنقیدی مصیبت اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ یہ الزام رکھ کر حالی کو شاعروں کے گرد سے جدا کیا جائے۔ کیونکہ اس مخصوص رنگ تغزل کے لحاظ سے بھی حالی کامرتبہ بہت بلند ہے اور ان کی قدیم رنگ کی شاعری میں وہی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جن پر دہلی کے شعراء متقدمین میں کوئی بہتر سے بہتر شاعر ناز کر سکتا تھا۔ افسوس ہے کہ یہ اعجاز حسین صاحب نے اس پہلو کی طرف توجہ نہیں کی اور حالی کی صرف اس شاعری کو پیش نظر رکھا جس میں انھیں انفرادیت کی حیثیت حاصل تھی۔

حصہ سے میری خواہش ہے کہ کلام مومن پر ایک فاضلانہ تنقید کی جلسے اور میں نے اپنے بعض احباب کو اس طرف متوجہ بھی کیا۔ لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا، جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ کلام مومن ان کا درخور ذوق نہ تھا یا یہ کہ میری التجالاتی التفات نہ تھی بہر حال اب میں پھر ارباب علم و ادب کو اس طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں اور اس خیال سے کہ شاید اس روحانی خدمت کے لئے کوئی مادی ترغیب کارگر ہو سکے۔ یہ اعلان بھی کرتا ہوں کہ جن صاحب کامضمون سب سے بہتر ہو گا ان کی خدمت کا محقر ہدیہ پیش کیا جائے گا۔

آئندہ مہینے کے رسالہ میں "فنت" کا حصہ زیادہ وسیع ہو گا اور منجملہ دیگر افسانوں کے ایک فسانہ جو اس کتاب جرم اور انکشاف جرم دو حصوں میں منقسم ہے اور جو اپنی ترتیب اور نوعیت کے لحاظ سے بالکل نئی چیز ہے خصوصیت کے ساتھ نہایت دلچسپ ہو گا۔ علاوہ افسانوں کے اور مضامین بھی بعض معرکہ آرا مباحث پر پیش کئے جائیں گے۔

عام طور پر رسائل مضمون کی کمی کے شاکر رہتے ہیں، مجھے یہ شکایت ہے کہ رسالہ کے سو صفحات بھی کافی نہیں ہوتے۔ چنانچہ آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ گزشتہ دو اہ سے رسالہ کی کتابت بہت گنجان کر دی گئی ہے لیکن اس پر بھی ایک مسلسل مضمون "لارڈ رین کا عہد حکومت" نہیں دیا جاسکا، حالانکہ اس کو اپنی اہمیت کے لحاظ سے برابر جاری رہنا چاہئے تھا۔ آئندہ کے لئے میں نے ارادہ کیا ہے کہ اگر رسالہ کے موجودہ صفحات نا کافی ہوئے تو میں اس مضمون کے لئے اور چند صفحات کا اضافہ کر دوں گا۔

نیاز فوری

ہریش گمان مبرک خالی است شاید کہ پلنگ خفیہ باشد

بلکہ وہ نسخہ بہت صحیح اور محشی تھا اس میں گفیہ اور نفیہ کے کچھ معنی بھی لکھے تھے۔

ظاہر ہے کہ انشایات جلتے تھے کہ گفہ نہفہ خفہ، سب قوافی ہیں اور صحیح ہیں مگر استعارے کے طریق پر تجاہل کے کیے میرشی صاحب کو بنانے کے لئے یہ کہا۔

۱۲۔ ایسے ہی اوج غالب ذوق وغیرہ کے معاصر تھے۔ وہ ایک معمولی بلکہ غلط گو شاعر تھے جب غالب کو شعر سناتے تھے تو عمر آگے تھے کہ واقعہ کیا خوب، وہ لوگ کافر ہیں جو تم کو شعر گوئی کا استاد جانتے ہیں۔ شاعری کے خدا ہو خدا، یہ کہہ کر دوسرا شعر سنتے اور سبحان اللہ کہہ کر سجدہ کرنے کے طریقہ پر گردن جھکالتے تھے۔

کبھی استہزا اس طریقہ سے کیا جاتا ہے کہ ایک دوسرا واقعہ دوسرے کو مخاطب بنا کر یا نبیہ خطا کہتے ہیں اور اصل میں مقصود کسی اور کو بنانا اور کسی دوسرے واقعہ پر اس کو شرمانا ہوتا ہے۔ کہتے کچھ اور ہیں اور مطلب کچھ اور لیتے ہیں۔ جیسے نعمت خان عالی نے اراکین شاہی اور خود اور نگریب عالمگیر پر اس قصیدہ میں استہزا کیا ہے۔

معراج و سلم آمدہ زینہ بہت کند زیں ہر دو بیچ کا نیاید بہ انصرام

ظاہر انصاف خان عالی، الفاظ کے معنی بیان کرتا ہے کہ معراج اور سلم زینہ کو کہتے ہیں اور بہت کند کو، مگر ان دونوں سے انتظامی معاملات میں کوئی کام نہیں نکلتا۔ اور دراصل اس واقعہ پر بادشاہ اور فیروز جنگ بہادر کو بنایا گیا ہے، کہ انھوں نے شہنشاہ کے طریقہ پر قلعہ گوگندہ پر ایک کو کندہ اور زینہ لگا کر دیوار قلعہ پر چڑھنا چاہا تھا۔ مگر قلعہ میں خیر ہو گئی اور الٹا انھیں پر حملہ ہو گیا اور فوج شاہی نہایت ناکامی کے ساتھ پسپا ہو گئی۔

انکسرو السقوط شکستن فتان است آنم شد و حصار نیفتاد از نظام

مطلب ظاہری یہ ہے کہ کسر ٹوٹنے اور سقوط گرنے کو کہتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہو گیا مگر حصار کا نظام برقرار رہا مگر دراصل کہا یہ گیا ہے کہ کندین جب کاٹ ڈالی گئیں اور زینہ واہوں پر جب حملہ کیا گیا تو یہ لوگ گرے بھی، ہڈیاں بھی ٹوٹیں، مگر خرم نہیں آئی کہ اب تک حصار کئے ہوئے پڑے ہیں۔ نعمت خان عالی کے یہاں وقایع میں اکثر قصیدہ اسی قسم کے ہیں بخت طوالت ہم سب کو لکھنے سے مجبور ہیں کبھی کبھی صرف تحریر نام مقصود ہوتا ہے۔ مثلاً ایک مشہور شعر ہے کہ

ہزار شے نے ڈاڑھی بڑھائی سن کی سی مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

اس میں صرف شیخ اور مولوی مدن پر استہزا کیا گیا ہے۔ اسی طرح یہ شعر ہے
(سبھا کے سر پہ رکھ کر مہا چاک لے چلے) وڈا کہہ مار شیخ کی دستار دیکھ کر

ہرسم کا عطر ہر غزل، محمد علی تاج سیر عطر لکھنؤ سے منگانا چاہئے

اس میں تمہارے ساتھ شیخ کے اہم کا بھی اظہار کیا گیا ہے یا یہ شعر

شیخ نے مانگی ہے اپنے وقت کی میکدے سے اب پُرانی جائیگی
شب ماہ کا لطف اور شیخ جب ہے کہ ہالانے تیری پگڑی اچھلکر
مغرب نے خرد پیش کر رکھی دیکھ لی مشرق کی شاعری کا مزہ اکر کر اہوا
زادہ کو ایک قطرہ زمزم پہ ناز ہے یان خم کے خم اڑا دیں پیر مخاں کی تھنا
انہیں لوگوں کے آنے سے تو بچانے کی غلت ہے قدم تو شیخ کے تشریف ناز بادہ خواروں میں
غالب طنز کو استہزا میں شریک کرتا ہوا کہتا ہے

دوسرے مصرع میں صرف استہزا اور تمسخر ہے۔ قوم۔ شورا بہ زمزم۔ عجیب عجیب استہزا کی صورتیں پیدا کر رہے ہیں اور ساتھ ہی ایک طنز بھی شامل ہے۔ کسی جگہ مخاطب کو حماقت کا احساس کر کے اس پر استہزا کیا جاتا ہے جیسے اکبر کا یہ شعر۔
(بڑھویاں بھی خیر سے گاندھی کے ساتھ ہیں گوشت خاک ہیں گھر آندھی کے ساتھ ہیں)

کیں استہزا اظہار واقعات کی صورت میں کیا جاتا ہے جیسے ریاض صاحب کہتے ہیں
جناب شیخ نے پی اور منہ بنا کے کہا مزا بھی تلخ ہے کچھ بوجھی خوشگوار نہیں
بیخود دہلوی پی کے زاہد نے مونا بے یہ ارشاد کیا اس کا انگور کے شربت میں مزا ملتا ہے
کامگار خاں پسر دوم عہدۃ الملک جعفر خاں وزیر اعظم بادشاہ عالمگیر ایک سادہ مزاج آدمی تھے انھوں نے جب حیدر آباد فتح ہوا تو ابوالحسن تانا شاہ والی سابق دکن کے وزیر ناکتھ الر کی کے ساتھ شادی کی نعمت خاں عالی نے استہزا کے طریق پر ایک قصیدہ لکھا جس کے ہر ہر لفظ سے استہزا پٹکتا ہے۔
عونی اور فیضی میں کچھ چٹک ہو گئی تھی اسپر طرہ یہ ہوا کہ عونی سے کسی ستم ظریف نے یہ کہہ دیا کہ عونی تم کو اپنا شاگر بتاتا ہے اسی واقعہ پر عونی نے یہ رباعی کہی اور فیضی کا تمسخر کیا۔

اخوند من اند کے زانواں کجاست دردِ توبہ سے ہمتِ موصاف کجاست
ابن بے آدباں آرتو سوائے دارند عنقائے فضیلت تراقان کجاست
انشاء انشاء انشاء ایک مکان پر یہ تاریخ لکھی ہوئی دیکھی ہے
حویلی علی نقی خان بہادر کی

چونکہ یہ مصرع موزوں نہ تھا لہذا تسخیر کے طریقہ پر آپ نے اس کو دو بیٹی - یار باغی کی صورت میں کر دیا اور کہا ۵

تال کی نہ سسم کی نہ سُر کی فارسی نہ عربی نہ ترکی

تاریخ کئی ہوئی ہے کسی لڑکی حویلی علی نقی خاں بہادر کی

ایک شاعر نے اتفاق سے بجائے اجناس کے اجناس لکھ کر دیا یعنی سین گریگیا انشا یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں

اجناس کے موقعن پہ اجناس آیا سلمائے علوم کا یہ سنجہ آیا تو

اجناس چیزے بہت کال برودیدہ میں ہو تخم لنت کا تو اپنجا آیا تو

دوسری رباعی دیکھئے وہ بھی اسی رنگ میں ہے -

دستا لنت تمھیں نہ سنجہ آیا اجناس میں کو دیکھو نکرا اجناس آیا تو

اجناس کوئی ڈھول دالہ ہوگا سکا کاغذ میں کہاں سے ڈھول نکرا آیا تو

اسی قسم کی اور کئی رباعیاں انھوں نے کہی ہیں جن میں بچارے غلطی کرنے والے کو خوب خوب بنایا ہے تسخیر جس سے

کسی کو بنایا جاتا ہے کبھی اس طرح بھی ہوتا ہے کہ اپنا عجز بیان کیا جائے اور دوسرے کو اپنی حرکات یا اقوال سے برتر ثابت کیا جائے۔ مگر دراصل اس شخص کو بیوقوف بنانے کا ارادہ کیا جاتا ہے جیسے انشا اللہ خان انشا ایک جگہ کہتے ہیں :-

خیال کیجئے کیا آج کام میں نے کیا جب استودی مجھے گالی سلام میں نے کیا

سلام کرنا ایک ایسی حرکت ہے بونظا ہر اپنے آپ کو عاجز اور دوسرے کو برتر ثابت کرتی ہے مگر دراصل گالی دینے والے

کو اس صورت سے بنایا گیا ہے۔ پایہ شعر بالکل اسی انداز کا ہے

مجھ میں ایک عیب بڑا ہو کہ وفادار ہوں سیا تم میں دو ضعف ہیں بدنو بھی جفا کا۔ بھی ہو

کبھی تسخیر اور استہزا اس طریقہ سے کیا جاتا ہے کہ اپنے کو مہمل طریقوں سے بدتر ثابت کیا جاتا ہے اور اس سے نتیجہ یہ مرتب کیا

جاتا ہے کہ دوسرے کو ذلیل ثابت کیا جائے۔ اور آوازہ کی سی ایک صورت پیدا کر دی جائے جیسا کہ جعفر زبلی نے اپنے کسی حریف کو یہ فتویٰ لکھ کر بنایا ہے

من آں رستم دقت روئیں تنم کہ وہ پا پڑ از مشت خود بشکم

یہ پوری فتویٰ تیس چالیس شعروں کی ان کے کلیات میں موجود ہے۔

طنز کی یہ بھی ایک قسم ہے جلال مرحوم سرمایہ زبان میں اس کے معنی صرف تشبیہ کے کہتے ہیں۔ غالب مرحوم بھی تشبیہ

پہبتی

اور پہبتی میں کوئی فرق نہیں کرتے مگر دراصل یہ ایک غلطی ہے پہبتی کوئی تشبیہ نہیں ہے بلکہ استعارہ ہے جس کی

ہمارے بحث کے موافق یہ تعریف کیجا سکتی ہے کہ کسی کو دیکھ کر اس کے حسب حال دفعتاً کوئی چھتا ہو مختصر فقرہ کہنا جو اسپر بہت جگہ
یعنی کسی شخص کو کوئی دوسری چیز فرض کر لیا جائے اور مستعار لکے مستعار منہ ہمیشہ بدتر ہو جس چیز سے استعارہ کیا جائے اس کی
بدتری کی وجہ سے وہ شخص جیسے بہت ہی گئی ہے بدتر معلوم ہونے لگے۔

جس استعارہ میں ظرافت اور ہجو کا جزو غالب ہو اسی کو بہت ہی کہا جائے گا۔ بہت ہی کی اقسام مختلف ہیں کبھی بہت ہی کسی شخص کی
ذات پر کہی جاتی ہے اور کبھی اس سے صفات پر روشنی ڈالی جاتی ہے اور ایک چھوٹا سا جملہ اس شخص کے اکثر حالات کا ایک
آئینہ ہو جاتا ہے حسین دہندی دہندی بہت سی تصویریں نظر آتی ہیں ایسی بہت ہی کو تشبیہ نام کے درجہ پر رکھا جائے گا۔ مثال کے لئے
ملاحظہ فرمائیے۔

اشرف علی خان فغان، ناگرمل دیوان تن پر کو جوان کی معاصر اور امراء شاہی میں سے تھے (گھی کی منڈی کا ساٹھ) کہنتو
اس بہت ہی کے سنتے ہی ناگرمل کی ایک تصویر آنکھوں کے سامنے چھ جاتی ہے کہ ناگرمل ایک بھیدہ اور عقل و خرد سے بے بہرہ
انسان ہے، اسی طرح حکیم معصوم اشرف علی خان فغان کے معاصر تھے چونکہ غریب ہیں کچھ ظاہری نمائش نہیں تھی، ایک بھولے
بھالے فریجیم کے آدمی تھے فغان نے انپر ”گاؤ گجراتی“ کی بہت ہی کہی۔

رشید الدین ایران کا ایک نہایت مشہور و معروف شاعر گزر رہا ہے۔ اتفاق سے وہ پستہ قد اور حقیر تھا، خاقانی یا اور
کسی بڑے آدمی نے اسپر (دطواط) کی بہت ہی کہی دطواط ایک بہت چھوٹا سا بزدل ہوتا ہے مگر اس کی زیر کی مشہور ہے۔ یہ بہت ہی
کچھ ایسے مبارک وقت میں کہی گئی تھی کہ رشید الدین کے ساتھ لفظ دطواط ہمیشہ کے لئے شامل ہو گیا۔ اور آج تک رشید الدین
دطواط نہ کہا جائے کوئی رشید کو سمجھ نہیں سکتا۔

ایک رئیس نے بگن نامی طوائف کو اس وقت ملازم رکھا جب وہ صحیح طریقہ سے سن شعور کو بھی نہ پہنچی تھی ایک دوست نے میں جفا
سے کہا کہ ابھی تو یہ پوری بگن بھی نہیں ہوئی۔ ”ادھا بگن“ ہیں، تو کر رکھنے سے قائدہ۔ یہ بہت ہی اس قدر مقبول ہوئی کہ آج بگن ہر جگہ
ادھا بگن ہی کے نام سے مشہور ہے۔ کبھی کبھی بہت ہی سے صرف وصف خاص پر روشنی پڑتی ہے شیخ شرف الدین مضمون کے
دانت گر گئے تھے اس لئے خان آرزو دان کے استاد نے ایک مرتبہ انپر (شاعر میدانہ) کی بہت ہی کہی

خدمت گار خان ایک خوب تھا ان سے اور اُردو سے کچھ چٹاک ہو گئی تھی اس لئے آبرو نے یہ شعر لکھ کر بہت ہی کہی۔

یارو خدمت گار خاں خوں کے پنج ہے تو مستثنیٰ، لیکن منقطع
بقائے شیخ چلے نشین پر یہ قطعہ لکھ کر بہت ہی کہی۔

توبہ زاہد کی توبہ تلی ہے چلے بیٹھے تو شیخ جلی ہے

دماغ مرحوم ایک سیاہ رنگ چمک روادی تھے جب رامپور میں تشریف لائے اور صہیل کی خدمت ان کے سپرد ہوئی تو لوگوں نے
شکلی کی پہنتی اسپر کی

شیخ ناسخ ایک بسیار خوبصورت آدمی تھے آزاد نے لکھا ہے کہ لوگ ان پر دم کٹا بیھنسا کی پہنتی کہتے تھے۔

چنان لکنو کے ایک ظریف شاعر تھے اپنے قریب کو وصل معشوق سے کامیاب دیکھ کر پہنتی کہتے ہیں

سہ پہلو جو رہیں انگور خاکی قدرت دماغ کی چوبچ میں انگور خاکی قدرت

سجاد حسین مرحوم اپنی تصنیف احمق الذین میں نواب احمق الذین پر اسوقت جب سہ اسمتہ نے ان پر نالاش کی اور وہ

قطعا مفلس ہو گئے نواب تحت اللفظ کی پہنتی کہی۔

ایک ریاست کے دیوان پر جو مرد متشرع مگر نہایت خشک آدمی تھے ایڈیٹر اودھ پنچ منشی سجاد حسین نے (حاریاں)

پہنتی کہی۔ اسی طرح احمق الذین نے اس جگہ جہاں بھولے نواب نے اپیل کرنی چاہی ہے اور قاضی صاحب نے منظور نہیں کی

اور یہ وہاں سے ناکام پلٹے تو ان پر (دعاے مستجاب) کی پہنتی کہی ہے۔

حاجی غفلت کی ریش مبارک نوکدار مگر اجڑی ہوئی سی تھی لہذا اس پر (پُرانی کوچی) کی پہنتی کہی گئی۔ اس طرح حاجی

غفلت کے رونے اور قطرات اشک کے آنکھوں سے نکلنے پر پہنتی کہی گئی کہ ”تبا کو بند پڑی ہوئی کوڑیوں سے شیرہ بہا“ بلبل ہی

سانس لینے سے جو حاجی غفلت کا پیٹ پھوٹا تھا اسپر (امار کی کھال) کی پہنتی کہی گئی۔ حاجی غفلت کے ایک جگہ فرسش پر

ڈھیر ہو گئے تو پہنتی کہی کہ (چھاپے کی روشنائی سل پر پھیل گئی)۔ حاجی غفلت چلتے چلتے ایک جگہ گر کر بیہوش ہو گئے ہیں ان کے

مصاحب خاص حرقہ ریوڑی پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہاں پر ایڈیٹر اودھ پنچ نے پہنتی کہی ہے مری بھینس کے قریب چرگد۔

ایک بیرسٹر صاحب ضعیف ہو کر دہرے ہو گئے تھے، اُن پر ایڈیٹر اودھ پنچ نے خط خنی کی پہنتی کہی۔ حاجی غفلت کے

تیز چلنے پر پہنتی کہی کہ (ڈھیل کرتے ہوئے جارہے تھے) اس طرح میں ایک مرتبہ بازار میں جارہا تھا دیکھا کہ ایک لنگڑے بنگالی بابو

بہت تیزی سے تشریف لجا رہے ہیں میرے ساتھ ایک دوست بھی تھے انھوں نے بابو صاحب کی چال پر یہ پہنتی کہی کہ (بابو صاحب

ٹائپ کرتے جارہے ہیں) ایک جگہ حاجی غفلت کی چکی بندھ گئی سجاد حسین مرحوم نے اس کو (سینہ میں ڈھیل چلنے لگی) کہا

لکنو کے شاعر مرحوم جو نہایت ہی کریمہ النظر سیہ فام بدہئیت شخص تھے ایک مرتبہ ایک بچہ کو کہلا رہے تھے خود بیٹے

ہوئے تھے اور بچہ کو سینہ پر بٹھا رکھا تھا ان کے ایک دوست نے پہنتی کہی۔ (نوروز مسور پر سوار ہے)۔ پندت رحن ناٹھ شار

اپنی تصنیف خدائی فوجداریں لکھتے ہیں کہ خدائی فوجدار کا گھوڑا چونکہ بہت دبلا تھا لوگ اسپر پہنتیاں کہتے تھے (پہنتے لگوائے

تو چلے، بہتی واہ رے کہہا کر کیا گھوڑا بنایا ہے) خدائی فوجدار کی صورت دیکھ کر ایک نے بہنتی کہی (قبر کی پہلی منزل سے بھگے ہیں)

تہ خانے کا راز

(فانہ)

شرلاک ہیز دیر سے خوردین پر جھکا ہوا تھا۔ اب اُس نے سیدھے ہو کر میری طرف دیکھا۔

— ”وائسن یہ گوند ہے، بلاشبہ یہ گوند ہے۔ ذرا تم بھی ان ریزوں کو دیکھو۔“ میں خود دین پر جھکا اور اپنی نظر کی مناسبت سے اسے ترتیب دیا۔

— ”یہ جو بال ہیں یہ ایک اونٹنی کوٹ کے تار ہیں، بھورے بھورے ڈلے مٹی کے ہیں، اور درمیان میں جو زرد زرد ریزے ہیں وہ یقیناً گوند کے ہیں“

— ”خیر میں آپ کے دعوے کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہوں کیا کسی مسئلہ کا انحصار اس پر ہے؟“

— ”یہ بہت اچھا ثبوت ہے تمہیں یاد ہو گا کہ سینٹ پیٹرک والی واردات میں ایک ٹوپی مقتول سپاہی کے قریب سے ملی تھی۔ لہذا میں نے انکار کیا تھا کہ وہ اس کی نہیں ہے۔ لیکن وہ تصویر دل پر فریم چڑھانے والا ہے اور اسے اکثر گوند سے کام پڑتا ہے۔“

— ”کیا تم اس معاملے کی تفتیش کر رہے ہو؟“

”نہیں بلکہ میری دہلی نے جو پولس کا ملازم ازبیرا دوست ہے مجھ سے اس معاملے میں مدد چاہی ہے جب سے میں اس کے بنانے والے کو تانبے کے ان ذرات کے ذریعے سے

— جو اس کے کف کی سیوں میں باسے گئے تھے پکڑا ہے تب سے پولیس والے خوردین کی قدر و قیمت سے واقف ہو گئے ہیں۔“ یہ کہہ کر اُس نے اپنی گھڑی دیکھی اور بولا ”مجھے ایک شخص کے آنے کی امید تھی مگر اس کا وقت گزر گیا ہے اور وائسن تمہیں گھوڑ دوڑ کی بابت کچھ معلوم ہے؟“

— ”ہو تا تو چاہئے میں اپنی پیشین گوئی کا نصف حصہ جو مجھے زخمی ہونے کی وجہ سے ملتی ہے گھوڑ دوڑ میں صرف کرتا ہوں۔“

— ”سر رابرٹ ناربرٹن کا نام کوئی یاد تھا رے دل میں نہ تارے؟“

— ”مغز کرتا ہے۔ وہ شاسکپ کے محل میں رہتے ہیں اور میں اس جگہ کو اچھی طرح جانتا ہوں کیونکہ میں موسم گرما میں وہاں ٹھہرا تھا۔ اور ایک مرتبہ تو سر رابرٹ قریب قریب قانونی حدود میں پھنس گئے تھے۔“

— ”وہ کیونکر؟“

— ”وہ یوں کہ ایک مرتبہ انھوں نے سام بردورڈ کرزن اسٹو کے مشہور سا ہوکار کو خوب زد و کوب کیا اور قریب الموت کر دیا۔“

— ”خوب خوب۔ کیا وہ اکثر اسی قسم کا شوق فرماتے ہیں؟“

— ”اسین شک نہیں کہ وہ ایک مخدوش آدمی ہیں۔ انگلستان بھر میں سب بیچوف دوڑ کھیلنے والے میں چند سال گزرے ان کا گھوڑا اگر انڈیا میں منتقل میں دوسرے نمبر پر

جانکد کی کل آمدنی لیڈی فالڈ کو ملتی ہے۔“ اور غالباً رابرٹ اس آمدنی کو خرچ کرتے ہو گئے۔

”ہاں قریب قریب یہی بات ہے۔ رابرٹ بڑے حضرت ہیں۔ اور ان کی بہن کی جان ان کے ہاتھوں ضرور ضیق میں ہوگی میں نے سنا ہے کہ لیڈی فالڈ کو ان سے بہت محبت ہے۔ لیکن آخر شاسکب میں غیر معمولی بات کیا ہے“

— لیڈی میں بھی معلوم کرنا چاہتا ہوں اور میں امید کرتا ہوں کہ آدمی جو ہمیں بتا سکتا ہے اسے ہمارے

آیا تھا وہ ان آدمیوں میں سے ہیں جو اپنے حسب حال زمانہ گزار رہے جانیے بعد پیدا ہوئے۔ اگر وہ اونیسویں صدی کے شروع میں جب جارج چارم اپنے باپ کے بجائے حکومت کو لے آیا تھا پیدا ہوتے تو خوب بنتی کیونکہ وہ بڑے ماہر گھونے باز، پہلوان، دوڑ کھیلنے والے اور عاشق مزاج آدمی ہیں۔ یہ بھی ہر جگہ افواہ ہے کہ وہ قرض کے جال میں ایسے پھنسے ہوئے ہیں کہ نکلنا مشکل ہے۔“

”اچھا اب تم دو شاسکب کے محل کا نقشہ تو بتاؤ۔“
— ”محل باغ کے درمیان واقع ہے اور اس کے شہر پہلے وغیرہ بھی دہرائیں۔“

اتنے ہی میں دروازہ کھلا اور ملازم نے ایک طویل قامت آدمی کو داخل کرنا جس کی ڈاڑھی موچھ صاف تھیں اور جس کے حیرت سے ایسا استقلال اور سکون ٹپکتا تھا جو صرف سائیسوں اور گھوڑوں کی نگہداشت کرنے والوں کے لئے مخصوص ہے۔ جان میں گھور رہا اور سائیسوں کی کافی تعداد اپنے زیرِ حکومت رکھتا تھا اور وہ اس فرض کی انجام دہی کا اہل معلوم ہوتا تھا۔ اس نے نہایت اطمینان سے سلام کیا۔ ہومز نے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور وہ بیٹھا۔
”سٹر ہومز آپ کے میرا تعذر کیا تھا؟“

”جی ہاں مگر اوس سے کسی بات کی تشریح نہ ہوتی تھی۔“
”سناٹے کی نزاکت ہی اس بات کی متقاضی تھی کہ معروض تحریر میں نہ لایا جائے میں اُسے زبانی ہی بیان کر سکتا ہوں۔“
”ہم لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہیں۔“
”سٹر ہومز سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ میرے مالک سٹراپرٹ باگل جو کئے ہیں“ ہومز نے تیوری چوڑھائی۔ ”جناب

— ”اور داروغہ پہلے غالباً سٹراپرٹ جان میں ہیں۔ میری اس واقعیت پر حیران ہونے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ یہ خطہ جیکوز، کھول یا ہوں اخصیں کا بھیجا ہوا ہے۔ شاسکب کے بارے میں کچھ اور بتاؤ۔“
— ”شاسکب کے مشہور کئے ہیں۔ کتوں کی نمائش میں تم نے بھی ان کا تذکرہ کیا ہو گا۔ انگلستان میں خاص ترین نسل ہے اور شاسکب کے محل کی مالکہ کا بطور پرانہ فخر کرتی ہے۔“
— ”شاسکب کے محل کی مالکہ سر رابرٹ ناربرٹن کی بیوی ہوگی۔“
”سر رابرٹ نے کبھی شادی نہیں کی اور یہ اچھا ہوا کیونکہ انکی موجودہ مالی حالت اچھی نہیں۔ وہ اپنی بیوہ بہن لیڈی فالڈ کے پاس رہتے ہیں۔“

”یعنی انکی بیوہ بہن لیڈی فالڈ ان کے پاس رہتی ہیں؟“
”ہیں وہ محل ان کے شوہر مرحوم سرجیس کا ہے اور ناربرٹ کا اسپر کوئی حق نہیں ہے۔ لیڈی ناربرٹن تا عین حیات اسپر قابض ہیں۔ بعد وہ سرجیس کے بھائی کو ٹیگا۔ فی الحال

خطرناک کیونکہ اگر وہ ہمیں دیکھ لیتے تو کمین بھگانا ہی نہ تھا وہ گھونسا بازی کے لحاظ سے محذوف آدمی ہیں اس لئے ہم قریب جاتے ہوئے تو گھبراہٹ سے مگر ہم نے ان کو نگاہ میں رکھا۔ وہ تہ خانے کی طرف جا رہے تھے۔ اور ایک آدمی وہاں انکا انتظار کر رہا تھا۔

”یہ تہ خانہ کیا بلا ہے؟“

”یہاں میں ایک پُرانا منہدم کر جا رہا ہوں۔ اتنا بڑا نا ہے کہ کراچ تک کوئی اس کے زمانہ تعمیر کا یقین نہیں کر سکا اس گرجا کے نیچے تہ خانہ ہے۔ ہم لوگ اس میں آسیب کا خیال کرتے ہیں۔ یہ تہ خانہ دن میں بھی بید تار یک اور سنسان رہتا ہے اور ایسا آدمی جو رات کو اس کے قریب جانے کی ہمت کر سکے اس نواح میں شاید ہی کوئی ہو۔ لیکن سر رابرٹ بالکل بیخون آدمی ہیں انھیں نے اپنی تمام عمر میں کسی شے سے خوف نہیں کیا۔ لیکن وہ رات کو وہاں کیا کر رہے ہیں؟“

”زرر صبر کیجئے آپ نے کہا تھا کہ وہاں ایک آدمی اور بھی آتا ہے۔ وہ ضرور ملازمین یا اہل خانہ میں سے ہو گا پس آپ اس کو شناخت کر کے اس سے دریافت کیجئے۔“

”میں یہ صورت آشاؤں میں سے تو وہ کوئی ہے نہیں۔“

”یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟“

کیونکہ بس نے اسے دیکھا ہے۔ دوسری شب کا واقعہ ہے سر رابرٹ واپس ہو کر میرے اور بلر کے قریب سے نکلے چلے گئے۔ ہم دونوں ترگوش کی طرح بھاڑیوں میں چھپ گئے تھے کیونکہ جاننا تھا ہوا تھا ہنسنے دوسرے آدمی کو پیچھے کی طرف جاتے دیکھا اس سے ہمیں بالکل خوف نہ تھا۔ اس لئے جب سر رابرٹ چلے گئے تو ہم اُٹے

۔۔۔ اور نزار بھی نہایت شدید اور تلخ۔ درمزد وہ لیڈی فالڈر کے ہاتھ کو جسے وہ اپنے پیچ کی طرح عزیز رکھتی تھیں کیوں الگ کرتے چند روز ہوئے انھوں نے وہ کتابارنس کو دیدیا جو گرہین ڈرگین نامی سراسے کا مالک ہے۔“

۔۔۔ ”یہ بات یقیناً عجیب معلوم ہوتی ہے۔“

۔۔۔ ”یہ صبح ہے کہ مرض استدعا اور کمزوری قلب میں مبتلا ہوں ہوئے لیڈی فالڈر سے یہ امید تو نہ تھی کہ وہ عرصہ تک نباہ سکیں گی۔ لیکن اس سے قبل دونوں روز شام کو دو گھنٹے باہم صرف کرتے تھے اور وہ ان کی بہترین رفیق ثابت ہوئی تھیں لیکن اب یہ بات نہیں ہے۔ اب وہ ان کے پاس بھی نہیں جاتے اور لیڈی فالڈر کچھ تفکر اور پریشان سی رہتی ہیں غم غلا کر کے لئے اب وہ شراب پینے لگی ہیں۔“

۔۔۔ ”کیا اس بخش اور نیکوئی سے پہلے بھی دوڑتی تھیں؟“

”ہاں لیکن بہت تلیل مقدار میں۔ مگر اب تو روزانہ ایک بوتل خالی ہوتی ہے۔ یہ مجھے بلر سے معلوم ہوا۔ یعنی صورت حال ہی بدل گئی ہے اور کچھ نہ کچھ بھید ضرور ہے۔ اس کے علاوہ آخر وہ رات کو گر جا کے تہ خانے میں کیا کیا رہتے ہیں؟ اور وہ کون آدمی ہے جو ان سے رات کو وہاں ملتا ہے؟“

۔۔۔ ”ہو مرنے سے بے خطر اب سے ہاتھ ملنے شروع کئے۔“

۔۔۔ ”سٹر میں آپ کے جانے آپ کا بیان دلچسپ ہوتا جا رہا ہے۔ بلر نے ان کو جلتے ہوئے دیکھا۔ رات کا وقت تھا اور سخت بارش ہو رہی تھی۔ پچھلی رات کو میں بھی مکان پر بیدار رہا اور سر رابرٹ کو میں نے جاتے دیکھا۔ بلر اور میں ان کے پیچھے چلے مگر یہ حرکت بھی

میں کا ترع اسی بنا پر ہوا ہو بخار کیا خیال ہے؟

— ”مگر یہ معاملہ تو مدت سے طشت از بام ہے“

— ممکن ہے کہ لیڈی فالڈر کی پہلے سے اس کا علم نہ ہو۔

فرض کیجئے کہ انہیں یہ ابھی معلوم ہو اسے۔ اور وہ خادسہ کو بھلا کر

کرنا چاہتی ہیں۔ ان کے بھائی اس کی اجازت نہیں دیتے اور

وہ اپنے کمزوری قلب کے مرض اور خرابی صحت کی وجہ سے اپنی

ارادے میں کامیاب نہیں ہو سکتیں اور اس وجہ سے وہ قابل

تفریق خادسہ ہنوز ان کے ساتھ ہے۔ انہوں نے بولنا ترک کر دیا

ہے اور غلط کرنے کے لئے شراب پی پی شروع کر دی ہے۔ کیا یہ

تمام مفروضہ باتیں معقول اور ممکنات سے نہیں ہیں؟

— ”ہاں ہیں تو ٹھیک مگر صرف وہیں تک جہاں تک ان کا تعلق ہے“

— یہ سچ ہے کہ جہاں تک ان کا تعلق ہے رات کو تہ خانے کی آمدور

سے ان کا تعلق کیسے قائم ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس واقعہ

کو ہم اس ضمن میں نہیں لاسکتے“

— ہرگز نہیں اور جناب اس کے علاوہ ایک اور بھی بات ہو

جو اس ضمن میں نہیں آتی وہ یہ کہ آخر سربراہ برٹ کو مردے کی

ہڈیاں کھودنے کی کیا ضرورت ہے؟

ہومز چونکہ گرسیدھا ہو بیٹھا۔

— ”یہ جتنی کل ہی معلوم کیا ہے۔ آپ کو اطلاع دینے کے بعد۔

کل سربراہ برٹ لندن چلے گئے تھے۔ بس میں بنگر کے تہ خانے

میں گیا۔ کوئی بات غیر معمولی نہ تھی لیکن ایک گوشہ میں آدمی کی

ایک لاش تھی“

— ”میں خیال کرتا ہوں کہ آپ نے پوس کو اطلاع دی ہوگی“

اور سیدھے اس کے سامنے جا کھڑے ہوئے گویا ہم چاندنی

میں چن ندی کر رہے تھے اور اتفاق سے اسے مل گئے تھے۔

میں نے فوراً آواز دی اور نام پوچھا اس نے نہیں آتے

ہوئے نہیں دیکھا تھا میں آواز سنتے ہی اسے پیچھے مڑ کر

دیکھا اور اس کے چہرے سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ گویا اس نے

دور رخ سے نکلتے ہوئے شیطان کو دیکھ لیا ہے وہ چلایا اور

بھاگا۔ وہ خوب بھاگ سکتا تھا۔ ایک منٹ میں وہ نظروں

سے غائب ہو گیا اور میں یہ پتہ نہ چلا کہ وہ کون تھا“

— ”لیکن آپ نے اسے چاندنی میں بخوبی دیکھا ہے“

— ”ہاں میں تم کھل کر کہہ سکتا ہوں کہ وہ مرد رنگ کا آدمی

تھا اور ذلت اس کے چہرے سے عیاں تھی

— ”ہومز کچھ دیر تک خیال میں محو بیٹھا رہا“

لیڈی فالڈر کے ساتھ کون رہتا ہے؟“ اس دریافت کیا

— ”ان کی ملازمہ کیری الونس ہے نو پانچ سال سے ان کے

پاس ہے؟“

— اور اس میں بھی شک نہیں کہ بہت مانوس ہے؟“

— ”سٹرٹین نے ذرا گھبرا کر کہا“ ہاں وہ انوس تو ضرور ہے

مگر میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ کس سے مانوس ہے؟“

— ”اچھا؟“

— ”میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا“

— ”سٹرٹین میں خوب سمجھتا ہوں۔ ڈاکٹر وائس نے جو تصویر

سربراہ برٹ کی پیش کی ہے اس سے میں سمجھ سکتا ہوں کہ کوئی

— عورت ان کے ہاتھوں محفوظ نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ بھائی

ہمارا احسان یہ سکر مٹنا۔

”جناب میں نے یہ خیال کیا کہ معاملہ پوس کے لئے چند دنوں کیچسپ ثابت نہ ہوگا۔ ایک بوسیدہ فرش کی چند ہڈیوں اور کھوپری کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ لاش ایک ہزار سال پرانی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اس سے قبل یہ فرش وہاں نہ تھی اس بات کی میں تمکھا سکتا ہوں اور بلکہ بھی ہڈیاں ایک کونے میں رکھ کر تختے سے ڈھک دی گئیں تھیں لیکن پہلے وہ کونا بالکل خالی تھا“

— ”آپ نے ان ہڈیوں کا کیا کیا؟“

”سمنے تو انھیں میں چھوڑ دیا“

— ”بہت ہی اچھا کیا۔ اور آپ نے کہا تھا کہ سربراہ رٹ

باہر گئے ہوئے ہیں۔ کیا وہ واپس آ گئے؟“

”امید ہے کہ آج واپس آئیں گے“

— ”سربراہ رٹ نے اپنی بہن کا کتا بائیس کو کب دیا تھا؟“

”آج پورا ایک ہفتہ ہوا وہ مکان کے باہر کھڑا بھونک رہا تھا

اور اس روز سربراہ رٹ غصے میں تھے۔ انھوں نے پکا کر ملازم کو

دیکھا اور حکم دیا کہ ”اسے بائیس کو دے آؤ کیونکہ اب میں اس کی

صورت نہیں دیکھنا چاہتا“

ہومز کچھ دیر خیالات میں غرق خاموش بیٹھا رہا اس نے اپنا

پرانا پاپ سلاٹ لایا تھا۔

”مسٹر مین میری سمجھ میں نہیں آ سکا کہ آپ مجھ سے اس معاملے

میں کیا چاہتے ہیں کیا آپ اس سے زیادہ تشریح نہیں کر سکتے؟“

— ”شاید اس سے کچھ اور تشریح ہو سکے“ ہمارے جہان نے

کہا: ”اور یہ کہ اگر اس نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور ہتیاہ سے اُسے کھول کر ہڈی کا ایک حلقہ ہوا نکڑا دکھایا۔ ہومز نے اسے بڑے غور سے ملاحظہ کیا۔

— ”یہ آپ کو کمان سے ملی؟“

— ”لیڈی فالڈر کے کمرے کے نیچے کوٹھری میں ایک آتشدان ہوا

دو ت سے سرد تھا، لیکن سربراہ رٹ نے سردی کی شکایت کی اور اسے

روشن کر لیا میرا لڑکا ہاروے اس کی دیکھ بھال رکھتا ہے آج

صبح وہ میرے پاس اس ہڈی کو لایا جو اسے رکھا اٹھاتے وقت

ملی اسے دیکھ کر وہ بہت گھبرایا“

— ”اور میں بھی بہت گھبرا آہوں“ ہومز نے کہا ”ڈاکٹر واٹسن

اس کی بابت تمھاری کیا رائے ہے؟“ ہڈی جھلکریا ہوا جیسی تھی

لیکن اس کی شناخت میں کوئی شبہ نہ ہو سکتا تھا۔

یہ آدمی کے گھٹنے کی ہڈی ہے، ”میں نے کہا۔

— ”ٹھیک ہے“ ہومز نے کہا ”تمھارا لڑکا آتشدان میں کوئلے

وغیرہ کس وقت ڈالتا ہے؟“

— ”شام کو۔ اور پھر چلا آتا ہے“

— ”تو گویا رات کو وہاں ہر شخص آ سکتا ہے؟“

— ”وہاں“

— ”کیا تم باہر سے جا سکتے ہو؟“

”یا ایک دروازہ باہر سے ہے اور دوسرا وہ ہے جو رینہ چڑی

کے بعد لیڈی فالڈر کے کمرے کے راستے میں مل جاتا ہے“

— ”سربراہ رٹ کل مکان پر نہ تھے؟“

— ”جی نہیں“

”تو یہ بڑی سررا برٹ نے نہیں بلکہ کسی اور آدمی جلائی؟“

”ظاہر ہے“

”اس سراس کا کیا نام ہے جس کا آپ نے بھی تذکرہ کیا تھا؟“

”گرین ڈریگن“

”برک شاہ کے اس حصے میں مچھلی کا شکار کیا ہے؟“

سیدھے سادے مسٹر مین کے چہرے سے ظاہر تھا کہ اسے یقین

ہو چلا تھا کہ اسے اپنی زندگی میں ایک اور پاگل سے سابقہ پڑا ہے

”سنا تو ہے کہ پن بجلی والی ندی میں سول اور غیث شاہسکر کے

یاغ میں جو چھیل ہے اس میں روہو پائے جاتے ہیں“

دائیں ادا میں بڑے مشہور شکاری ہیں۔ دائیں! ہونہ یہی بات

آئندہ تم گرین ڈریگن کے پتے پر خط و کتابت کر سکتے ہو۔ ہم آج شکو

دہاں جائیں گے۔ یہ کہنا فضول ہے کہ وہاں ہم آپ سے ملنا نہیں

چاہتے لیکن پرچے ہم تک پہنچ جائیں گے اور اگر ضرورت ہوئی تو

اس میں بھی شبہ نہیں کہ میں آپ کو تلاش کروں گا جب ہم معاملات

کی گہرائی تک پہنچ جائیں گے تو میں آپ کو زیادہ پر وثوق رائے

دے سکوں گا“

گاڑی میں سوار ہوئے اور تھوڑی دیر بعد ایک بڑانی وضع کی سڑ

کے مالک جو شیا بارنس نے بڑے شوق سے ہمسے قرب وجوار کی مچھلیوں

کو تباہ کرنے کے متعلق گفتگو کی۔

شاسکب کے باغ میں جو چھیل ہے وہاں سے کوئی روہو ملنے

کی بھی امید ہے یا نہیں؟“ ہومز نے پوچھا۔ سرائے دالے کا چہرہ

اداس ہو گیا ”جناب وہاں گزرنا نہیں ہے قبل اس کے کہ آپ چھیل میں

کوئی مچھلی پائیں آپ خود چھیل میں ہوں گے“

”یہ کیوں؟“

— ”کیا جناب نے سررا برٹ کو کوئی معمولی آدمی خیال کیا ہے

جناب وہ ان لوگوں کی تو فکریں رہتے ہیں جو گھوڑوں کی خیر خبر

لینے آتے ہیں اگر آپ دونوں صاحب اس کے اصطبل کے قریب

پھٹکے تو وہ شیطان کی طرح آپ کے سر پہ جائینگے اس گھوڑ دوڑ میں تھو

نے لگی لپٹی تو رکھی ہی نہیں ہے“

— ”میں نے سنا ہے انھوں نے ڈربی کی دوڑ میں ایک گھوڑا داخل

کیا ہے؟“

جی ہاں کیا ہے اور بہت اچھا کیا ہے ہمارا تو سارا روپیہ ایسی

پر لگا ہوا ہے اور سررا برٹ کا بھی۔ اور یہ تو بتائے! اس نے

ہمیں غور سے دیکھتے ہوئے کہا ”میں خیال کرتا ہوں کہ آپ خود

گھوڑ دوڑ میں حصہ نہیں لیتے ہیں؟“

نہیں ہم تو لندن کے دو آدمی ہیں جو وہاں کی ابرا کو دوہوا سے

متنگ آکر برکشائر میں تبدیل آج وہو کی غرض سے آئے ہیں“

اس بحث سے تو آپ بالکل ٹھیک جگہ آئے آج وہو ایماں

اچھی ہے۔ لیکن سررا برٹ کی بابت میں نے آپ سے جو کچھ کہا ہے

یہ تھے وہ واقعات جن کی بنا پر میں اور ہومز می کی ایک خوشگوار شام

کی وقت ریل میں سفر کر رہے تھے اور ہماری جیب میں فرسٹ کلاس

کے ٹکٹ شاسکب اسٹیشن کے تھے جہاں پر معمولاً نہیں بلکہ اگر کوئی

مسافر خواہش کرے تو خصوصاً اس کے واسطے گاڑی ٹھرائی جاسکتی

تھی..... اور ریل کا تختہ بنیوں، ٹوکریوں اور

ڈوبکی ریلوں سے بری طرح لدا ہوا تھا منزل مقصود پہنچ کر

اور غیر دلچسپ رہو“

”اچھا جو ادا ہمارے پاس جمع ہے اس کا انتخاب کریں بھائی نے اپنی بہن کے پاس آنا جانا ترک کر دیا ہے اس کا پیارا کتا دوسرے کو دیدیا ہے۔ ڈائسن کیا اس سے کچھ تپہ چلتا ہے؟“

— ”دوسرے بھائی کے غصے کے اور کیا معلوم ہو سکتا ہے؟“

”ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ یا ممکن ہے کہ — خیر ایک دوسری صورت بھی ہے۔ اچھا صورت حالات پر برا بھلا سے نفاصت سے اگر کوئی نفاصت ہے۔ نظر ڈالنی چاہئے۔ لیڈی فارلڈر اپنے کمرے میں رہتی ہیں، اپنا طریق عمل تبدیل کر دیا ہے۔ سوائے اس کے کہ جب وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر ٹھٹھنے جائیں، انکو کوئی نہیں دیکھتا وہ صمٹیل پر اپنے عزیز گھوڑوں کو دیکھنے کے لئے بھی نہیں رکھتیں۔ اور ظاہر ہے کہ شراب پیتی ہیں یہی ہے ہر سارے معاملے کی کیفیت“

— ”اے ترخانے والے معاملے کے“

”وہ علمدہ بات ہے۔ دو پہلو ہیں اور میں تم سے درخواست کروں گا کہ رونوڈ کو آپس میں نہ ملاؤ پہلے سلسلہ خیالات سچا جکا تعلق لیڈی ڈارلڈر ہے، بظاہر آثار اچھے نہیں معلوم ہوتے“

”نیری سپریم، تو کچھ آتا نہیں“

”اچھا اب سلسلہ دوم کو لیجئے جس کا تعلق سربراہ برٹ سے ہے ڈربی کی دو بیٹے کاشوق جنوں کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ وہ ہمارے جولو کے بھندوں میں گرفتار ہیں اور ان کے ہاتھوں غیر محفوظ۔ وہ تیار تو اسوقت قری کر کر ان کے صمٹیل پر قابض ہو جائیں۔ وہ بہت تندر اور عیاں آدمی ہیں۔ ان کی گزراوقات کا سہارا انکی بہن کو

اس کا خیال رکھئے گا۔ وہ اس قسم کے آدمی ہیں جو ہاتھ پہلے چھوڑتے ہیں اور سہال بعد میں کرتے ہیں۔ باغ سے تو آپ بچے ہی رہیں“

— ”سٹر پارس اگر واقعی یہ بات ہے تو ہم ضرور اس کا خیال رکھیں گے۔ ادھر ہوا یہ کتا جو ابھی ہال میں مڑا رہا تھا بہت خوبصورت ہے۔ یقیناً وہ شامسکب کی اصلی نسل کا کتا ہے۔ انگلستان بہترین اس سے اچھا کتا نہیں ہے۔“

میں خود بھی کتوں سے شوق رکھتا ہوں، ہومز نے کہا، اگر آپ کو ناگوار نہ ہو تو یہ کتا مجھے دیدیجئے اور جو قیمت مناسب ہو لے لیجئے“ قیمت تو اس کی اتنی ہے کہ میں خود دے نہیں سکا یہ تو مجھے سٹراٹ نے عنایت کیا تھا۔ اسی وجہ سے میں اُسے بندھار رکھتا ہوں اگر کوئی کھول دے تو منٹوں میں وہیں پڑوے گا“

”ڈائسن ہمیں کھوج ملتا جا رہا ہے“ ہومز نے سرسارے واسلے کے جانے پر کہا۔ ”م کھیل نہیں ہے لیکن دو ایک روز میں یہیں معلوم ہو جائیگا کہ کیا طریق عمل اختیار کرنا چاہئے۔ میں نے سنا ہے کہ سٹراٹ ہتوز لندن میں ہے اس صورت میں ہم آج ملاؤ، فوجان ان کے مالک مقبوضہ میں داخل ہو سکتے ہیں۔ دو چار باتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں مزید تصدیق کرنا چاہتا ہوں“

”ہومز کیا تم نے کوئی نظریہ قائم کر لیا ہے؟“

”ڈائسن صرف یہ کہ پچھلے ہفتے میں کوئی واقعہ ہوا ہے جسے شامسکب کے باشندوں کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ وہ کیا ذات ہے اس کی بابت ہم صرف ان نتائج سے خیال کر سکتے ہیں جو رونوڈ ہاؤس میں اور وہ نتائج کچھ عجیب طرح پر الجھے ہوئے ہیں۔ یہ الجھاؤ ہماری مدد کریگا۔ صرف وہی تفتیش ناکام رہتی ہے جو معمولی، سادی

ہیں ایک معمولی سا تجربہ کرنا ہوگا۔ فی الحال اگر ہمیں اپنا یہ قریب قائم رکھنا ہے تو میرے خیال میں سراسر اے کو ہٹا کر اس فنکاروں کی طرح سول اور رد ہو چھیلوں کے بارے میں دانتھکڑا گفتگو کرنی چاہئے۔ یہی اسکو دوست بنالیت کا سیدھا سادہ ذریعہ ہے۔ اور ممکن ہے کہ دوران گفتگو میں اس نولج کے متعلق کوئی مفید بات معلوم ہو جائے۔“

صبح اٹھ کر ہومز نے یہ ہانا تراشا کہ ہم غلطی سے مچھیلوں کے واسطے چارہ بھول آئے ہیں اس لئے آج فنکار ناممکن ہے۔ گیارہ بجے کے قریب ہم سراسر سے چلے اور ہومز نے کتے کو اپنے ہمراہ لے چلنے کی اجازت لے لی

اُس نے ایک بحالی نشان باغ کے دو بلند دروازوں کے قریب پہنچ کر کہا۔ ”یہ وہ مقام ہے جہاں سے دہر کے قریب لیڈی فالڈر کی گاڑی میں سوار ہو کر نکلتی ہیں جب وہ باہر آجائے اور قبل اس کے کہ تیزی سے روانہ ہو م گاڑیاں سے کوئی سوال کر کے اسے روک لینا۔ میں اس جھاڑی کے پیچھے بیٹھ کر دیکھوں گا کہ کیا ہوتا ہے۔“

تین دیر تک انتظار نہ کرنا پڑا۔ پندرہ منٹ کے اندر ہی اندر ایک عمدہ زردنگ کی گاڑی آتی ہوئی نظر پڑی جس میں دو خوبصورت مشکی گھوڑے جتے ہوئے تھے۔ ہومز نے اپنے کتے کے جھاڑی میں پیچھے چھپا رہا اور میں نہایت سادگی سے ہلاتا ہوا سڑک پر گھڑا رہا۔ ایک ملازم دوڑتا ہوا آیا اور دواڑہ کو کھولا

گاڑی بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھی اور میں نے یہ آسانی

اور انکی بہن کی خادمہ ان کے ہاتھ میں ہے۔ یہاں تک تو ہم بالکل مطمئن ہیں نہ؟“

— ”یہ ممکن تہ خانہ؟“

”ہاں تہ خانہ۔ فرض کیجئے۔ یہ بیہودہ قیاس صرف ضرورتاً ہے۔ کہ سررا برٹ نے اپنی بہن کو ہلاک کر دیا ہے“

”ہومز یہ تو بہت بعید از قیاس بات ہے“

”ہاں بہت بعید کیونکہ سررا برٹ ایک شریف خاندان کے رکن ہیں لیکن اہل کبوتر کے غول میں کبھی کبھی جھگی بھی آلتا ہے اگر ہم اسی فرض کردہ دعوے کی بنا پر اپنی بحث قائم کریں تو ظاہر ہے کہ سررا برٹ اس ملک سے اس وقت تک نہیں بھاگ سکتے جب تک کہ ان کی قسمت پٹا نہ کھاجائے اور ان کی قسمت اس وقت پٹا کھا سکتی ہے جب ان کا گھوڑا اسامکب پرنس جیت جائے اس لئے ان کو رہنا یہیں رہنا لازم ہے۔ پس یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے شکار کی نقش کو پوشیدہ کرنے کا انتظام کریں اور کسی ایسی جگہ کو تلاش کریں جو لیڈی فالڈر کے روپ میں ہر خادمہ کے ہمراہ ہوتے ہوئے یہ بات شکل نہیں رہی نقش سودہ تہ خانہ میں جہاں شاؤنا دور ہی کوئی آجاتا ہے لیچا کر پوشیدہ کی جاسکتی ہے اور وقتاً فوقتاً آئندہ ان میں سپرد آتش کیجا سکتی ہے ایسی نشانیاں جیسی کہ ایک اسوقت ہمارے پاس ہے اسی صورت میں باقی رہ سکتی ہیں۔ تمھاری کیا رائے ہے؟“

— ”یہ تمام ممکنات میں سے ہیں اگر ابتدائی مہیب قیاس کو مان لیا جائے“

میرا خیال ہے کہ اس معاملے پر مزید روشنی ڈالنے کے لئے کل

ہوے باغ کے دروازے کے قریب ایک بلند بالا آدمی کوٹ میں
پٹا ہوا ہمارا منظر تھا جو قریب پہنچنے پر ہمارا لہجہ
مستر جان مینس دار دغا اصدطل ثابت ہوا۔ معمولی رسم ملاقات
کے بعد اس نے کہا کہ مجھے آپ کا قہر مل گیا تھا سربراہ ابھی
تک واپس نہیں آئے ہیں لیکن سنا ہے کہ آج رات کو وہی نہیں گئے
— ”تہ خانہ مکان سے کتنی دور ہے؟“ ہومز نے پوچھا
— ”قریب دو فرلانگ کہے۔“

— ”تو ہمیں سربراہ کی طرف سے خوف نہ کرنا چاہئے“
— ”مجھ سے تو یہ نہیں ہو سکتا۔ آتے ہی وہ مجھ سے ملنا چاہیں گے
تاکہ پرنس کی بابت معلوم کریں۔“
— ”اچھا۔ لیکن اگر ایسا ہے تو ہم بلا آپ کے کام کریں گے۔ آپ ہمیں
صرف تہ خانہ بتا کر واپس آجائے گا۔“

چاند آسمان پر نہ تھا اور بجید تاریکی تھی لیکن مسٹر مینس ہم کو گھانا
سے ڈھکے ہوئے راستوں کے گئے تا آنکہ ایک تاریک تودہ ہمارے
سامنے آیا جو پڑا ناگرا جھانچا ہم اس ٹوٹے ہوئے حصے میں داخل ہوئے
جو کسی زمانے میں گر جا کا برآمدہ ہو گا اور ہمارے رہنا سندھم
عمارت کے ڈھیروں میں سے گوتے پڑتے ہیں گر جا کے ایک گوشہ
کی طرف لے گئے جہاں ایک زینہ تہ خانے میں اترتا تھا۔ دیا سلائی
جل کر انھوں نے اس سنان جگہ کو روشن کیا جو نہایت منحوس اور
بتھری پڑانی دیواروں میں ریہہ لگ جانے کی وجہ سے بدبودار تھی
بتھری اور سیسے کے تابوتوں کے انبار چھت تک لگے ہوئے تھے جو
تاریکی میں ہمیں نظر نہ آتے تھے۔ ہومز نے اپنی لائٹیں روشن کر لی

اس میں بیٹھنے والوں کو دیکھا گدی پر بایں طرف ایک گوری چٹی
بھروسے والی شوخ چشم عورت بیٹھی تھی اور اس کے دائیں
جانب کوئی اور کمر جھکائے مثال سے سر اور شانے ڈھکے بیٹھا تھا۔
جو بظاہر مریض معلوم ہوتا تھا۔ جب گھوڑے شایع عام پر آگئے تو
تو میں نے کافی مرعوب کن طریقے سے اپنا ہاتھ اٹھایا۔ کوچران نے
باگ کھینچی تو میں نے اسے پوچھا کہ ”سربراہ شام تک میں نہیں
ٹھیک اس وقت ہومز جھاڑی سے نکلا اور کتنے کی زنجیر کھول دی وہ
خوش ہو کر غراتا، دم ہلا آہو گاڑی کی طرف دوڑا اور پادمان پر چڑ گیا
دوسرے لمحے میں اس کی خوشی غصے سے بدل گئی اور گاڑی میں بیٹھنے
والوں کی طرف بھونکتا ہوا جھپٹا۔

— ”گاڑی ہانگو۔ گاڑی ہانگو!“ ایک کرخت آواز نے کہا۔ کوچران
گھوڑوں کے ایک ہنٹر رسید کیا اور ہم سڑک پر کھڑے رہ گئے۔
”وائسن اب سب کچھ ہو گیا۔“ ہومز نے پر غضب کتے کے گلے میں
زنجیر باغڑھتے ہوئے کہا۔ اس نے خیال کیا تھا کہ وہ اسکی مالگوتی
لیکن اس نے دیکھا کہ وہ کوئی اجنبی ہے۔ کتے ایسے معاملات میں غلطی
نہیں کیا کرتے۔“

”مگر وہ ایک آدمی کی آواز تھی!“ میں نے کہا۔
”ہاں وائسن ہمیں ایک اور راز معلوم ہو گیا ہے۔ تاہم بڑی
احتیاط کی ضرورت ہے۔“

میرے دوست کو غالباً اس دن اور کچھ فکر نا تھا۔ بن چکی والی
ندی میں اپنی ڈوروں اور بیسیوں کو ڈالاجس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شام کے
کھانے پر پچھلیوں کی بھی ایک قاب تھی۔ کھانے کے بعد ہومز نے پھر
میدان عمل میں سرگرمی ظاہر کی۔ ہم پھر اسی صبح والی سڑک پر کھاروا

جیسے سے زردی مائل روشنی کی ایک تیز شعلہ اس المناک منظر پر پڑی تھی اس کی کرنیں تابوتوں کے ان بجلا کتبوں پر سے منعکس ہو رہی تھیں جن پر اس مغز خاندان کے مخصوص نشانات کندہ تھے۔

”مسٹر مین آپ نے ہڈیوں کا تذکرہ کیا تھا۔ کیا آپ جاننے سے پہلے مجھے انھیں دکھا سکتے ہیں؟“

”وہ اس کو نہ سنیں“ دادو نے ہلبل آگے بڑھا اور بھرپور تجسس میں کھڑا رہ گیا جب ہماری روشنی اس طرف پڑی اور اس نے کہا ”وہ تو غائب ہو گئیں!“

”یہ میرا بھی خیال تھا“ ہومز نے مسکرا کر کہا ”میں خیال کرتا تھا کہ ان کی راکھ اب بھی اس آتشداں میں مل سکتی ہے جیسے کہ ان کا ایک حصہ قطعاً ضائع ہو چکا ہے۔“

گورنگی کو کیا غرض بڑی تھی کسی ایسے آدمی کی ہڈیاں جلاتا جو ہزار ہا سال پہلے مر چکا ہے؟ مسٹر مین نے پوچھا۔

یہ معلوم کرنے تو ہم یہاں آئے ہیں“ ہومز نے کہا ”مگر یہ تفتیش طول کیڑا جائے اور ہم ایک دو یا دو کی حقیقت دنیا میں چاہتے ہیں خیال کرتا ہوں کہ ہم اس گہمی کو سمجھنے سے پہلے بھٹائیے“

جب جان مین یہیں تنہا چھوڑ کر چلے گئے تو ہومز نے کام شروع کیا پہلے قبروں کا بغور معائنہ کیا سب سے پرانی قبر شروع کر کے وہ سرولیم اور سرڈائیس کی قبر تک آگیا جو اٹھارویں صدی میں ہوئے تھے ایک گھنٹہ یا اس سے بھی کچھ زیادہ گزر چکا تھا قبل اسکے کو پھر تلاش کرتے کرتے ایک ایسے کے تابوت تک پہنچا جو تہ خانے کے دوسرے کے قریب قائم تھا مین نے اسکی اطمینان بخش چیخ سنی اسکی پھرتی سے مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ایک نتیجے اور مقصد پر پہنچ گیا ہے۔

وہ اپنے آتش فشانی شیشے سے وزنی ڈھکنے کے کناروں کو ملاحظہ کر رہا تھا پھر اس نے جیب سے لوہے کی ایک دھاردار سلاخ نکالی اور ایک درمیں اسے ڈال کر پورا ڈھکنے کو صرف دو قبضوں سے جڑا ہوا تھا اُپر اٹھا دیا جب وہ اُپر اٹھا تو رگڑ کی وجہ سے بڑی کڑخت آواز پیدا ہوئی۔ ڈھکنے پورا اٹھنے نہ پایا تھا اور تابوت کی اندرونی اشیا پر سے طور پر نظر بھی نہ آئی تھیں کہ ایک ناگمانی واقعہ پیش آیا تہ خانے کی چھت پر کوئی چل رہا تھا۔ قدموں کی تیزی اور استواری بتا رہی تھی کہ کوئی معینہ غرض لیکر۔ ہان آیا ہے اور گر جانے کے راستوں سے واقعہ پر روشنی کی ایک شعلہ تہ خانے میں ظاہر ہوئی اور ایک لمحہ بعد ایک آدمی حراب میں نمودار ہوا۔

وہ بڑا ہی سب صورت آدمی تھا قوی الجھنہ اور تند مزاج ایک بڑی لال لٹین جودہ ہاتھ میں لئے ہوئے تھا اس کے گھنی مونچھوں سے ڈھکے ہوئے زبردست چہرے اور خشک آنکھوں پر چمک رہی تھی۔ اسکی آنکھیں تہ خانے کے کونے کونے میں شعلہ سلوم ہوتی تھیں اور آخر کار وہ میرے سامنے اور مجھ پر ایک ہلکے ہلکے کے ساتھ قائم ہو گئیں

”تم کون ہو؟“ اس نے گرج کر کہا ”اور تم میرے تہ خانے میں کیا کر رہے ہو؟“ مگر جب ہومز نے کچھ جواب نہ دیا تو وہ قہقہے ہانگے بڑھکر اس نے وہ وزنی ڈھکنے سے وہ ہاتھ میں لئے ہوئے تھا اٹھایا ”تم سنئے ہو یا نہیں؟ وہ جیلا“ تم کون ہو؟ اور یہاں کیوں آئے ہو؟“ ہومز اس کا ڈھکنے اٹھا ہوا میں گھما لیکن اس سے بچنے کے بجائے ہومز مقابلے کے لئے آگے بڑھا ”میں بھی آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں“ اس نے

اپنی سخت ترین آوازیں کہا ”آخر یہ کون ہے؟ اور یہ یہاں کیا کر رہی ہے؟“

اسنے لوٹ کر تابوت کا ڈھکنا اکھاڑ ڈالا۔ لالین کی روشنی میں میں نے ایک جسم سر سے پیر تک چادر میں لپیٹا ہوا دیکھا جس کی شکل مسخ ہو چکی تھی، ناک اور ناک اسفل برقی طرح نمودار تھے انہیں ایک زرد چہرے میں بھیا ناک طور پر ادھر کو ٹھک رہی تھیں سر رابرٹ چلا کر لڑکھڑاتے ہوئے پیچھے کوچھے اور ایک سنگین تابوت کے سہارے کھڑے ہو گئے ”تم کو اسکی بابت کیونکر معلوم ہوا؟“ وہ چلائے اور پھر کسی قدر حواس بجا کر کے ”تم کو اس سے کیا سروکار؟“

— ”میرا نام شرلاک ہومز ہے“ میرے ساتھی نے جواب دیا۔ ”شاید آپ اس نام سے واقف ہوں گے۔ بہر حال میرا اس سے وہی تعلق ہے جو ہر انسان کا ہونا چاہئے یعنی قانون کو برقرار رکھنا میرا خیال ہے کہ آپ پر بہت سی باتوں کی جو ابدی عائد ہوئی“ سر رابرٹ کچھ دیر تک گھورتے رہے۔ لیکن ہومز کی پرکھ آواز مطمئن اور مستقل مزاجی کا اثر ہو کر رہا۔

”مسٹر ہومز، خدا شاہد ہے کہ میں بری الذمہ ہوں ظاہری واقعات ضرور میرے خلاف ہیں یہ میں تسلیم کرتا ہوں لیکن میں کے علاوہ اور کیا کر سکتا تھا؟“

”اگر ایسا ہے تو میں بہت خوش ہوں لیکن مجھے افسوس ہے کہ آپ کو یہ تمام باتیں پولس کے روبرو بیان کرنی ہونگی“ سر رابرٹ ذرا گھبرائے۔ ”اگر یہ لازمی ہے تو چارہ کیا ہے اچھا مکان چلے اور آپ خود ہی ملے کر لیجئے کہ یہ معاملہ کیا ہے

پندرہ منٹ بعد ہم اس قدیم محل کے ایک کمرے میں پہنچے جو اسلحہ خانہ معلوم ہوتا تھا کیونکہ بند دقوں کی جھلانا لیں شیشے کی الماریوں سے نظر آتی تھیں۔ سر رابرٹ چند منٹ کے لئے ہمیں وہاں چھوڑ کر چلے گئے جب وہ واپس آئے تو دو آدمی ان کے ساتھ تھے۔ ایک تو وہی گوری جیٹی جو ان عورت تھی جسکو ہم نے گاڑی میں دیکھا تھا دوسرا ایک آدمی تھا جسکے زرد چہرے سے عیاری اور بزدلی عیاں تھی۔ ان دونوں کے بشرے سے انتہائی حیرت انگیز تھی جس سے ظاہر تھا کہ سر رابرٹ کو ان سے یہ بیان کرنے کا کہہ واقعات کی رفتار کیا سے کیا ہو گئی تھی کافی وقت نہ ملا تھا۔

”دیکھئے سر رابرٹ نے ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا ”میسٹر نارلیٹ اور ان کی زوجہ ہیں مسٹر نارلیٹ چند سال سے میری بہن کی خادمہ تھیں۔ میں ان دونوں کو یہاں اس دجر سے لایا ہوں کیونکہ میں محسوس کرتا ہوں کہ اب دنیا میں میرے لئے بہترین چارہ کار یہی ہے کہ میں اصلی واقعات آپ سے بیان کر دوں اور میرے بیان کی تائید کرنے والے دنیا بھر میں یہی دو شخص ہیں“

”سر رابرٹ یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ کیا آپ نے غور کر لیا ہے کیا یہ ضروری ہے؟ عورت نے چلا کر کہا۔

”اور میری بابت تو یہ ہے کہ میں تمام ذمہ داری سے انکار کرتا ہوں اس کے شوہر نے کہا۔

سر رابرٹ نے اُس پر ایک حقارت آمیز نگاہ ڈالی۔ ساری ذمہ داری میں اپنے آپ پر لیلو نگا۔ انھوں نے کہا۔ ”مسٹر ہومز، آپ واقعات کا سیدھا سچا بیان سن لیجئے“

میری بہن مرض استقامت میں جوان کومت سے لاحق تھا۔
”خیر یہ تو ڈاکٹر خود طے کر لیا“

”ان کا ڈاکٹر تصدیق کر سکتا ہے کہ کئی ماہ سے علامات اسی تہیجہ کا خوف دلاتی تھیں“
”خیر تو آپ نے کیا کیا؟“

بہلی ہی شب کو میں اور نالیٹ لاش کو اسے کوئے والے مکان میں لے گئے جو اب غیر مستعمل ہے۔ لیکن ان کا پیارا کتا ہمارے پیچھے لگ گیا اور دروازے پر جا کر جلانے لگا۔ اس لئے میں نے خیال کیا کسی اور محفوظ جگہ کی ضرورت ہوگی کتنے سے جھپکارا پا کر ہم لاش کو گر جا کے تہ خانے میں لے گئے۔ ہم نے نقش کی کسی قسم کی توہین یا تحقیر نہیں کی میں محسوس کرتا ہوں کہ میں نے مرنے والی پر کوئی ظلم نہیں کیا۔ ”میرے خیال میں آپ کا طرز عمل ناقابل معافی ہے لہٰذا ہومرز نے کہا۔

سربراہ نے بے صبری سے سر ہلا کر کہا ”بند و نضاح“
”ہمت آسان ہیں۔ لیکن اگر آپ میری جگہ ہوتے تو آپ کے خیالات مختلف ہوتے کوئی آدمی اپنی تمام تدبیروں اور امیدوں پر آخری لمحے میں اس طرح بانی پھرتے نہیں دیکھ سکتا یہ ناممکن ہے کہ وہ کوئی نہ کرے میں نے خیال کیا کہ اگر ہم نقش کو ان کے آباد اجداد میں سے کسی کے تابوت میں جو گر جائیں مدفون ہیں رکھ دیں گے تو نقش کے لئے کوئی ناموزوں جگہ نہ ہوگی ہم نے ایک تابوت کھول کر اس میں سے قدیم نقش نکال لی اور لیڈی فالڈر کی نقش رکھ دی جبکہ آپ نے خود دیکھا۔ اور جو پرانی ہڈیاں ہم نے نکالی تھیں ان کو ہم تہ خانے کے فرش پر پر پڑا چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ نالیٹ اور میں انکو وہاں سے

آپ واقعات کی یہ تک پہنچ چکے ہیں درہ میں آپ کو وہاں نہ پاتا جاہاں دیکھ رہا ہوں۔ اس لئے میرا یہ خیال ہے کہ آپ کو معلوم ہوگا کہ میں ڈربئی کی دوڑ میں ایک گھوڑا دوڑا رہا ہوں اور ہجرات کا انحصار اس کے جیتنے پر ہے اگر میں جیت گیا تو تمام مشکلات آسان ہو جائیں گے اور اگر ہار گیا تو — نتائج کا خیال کرتے میری روح کانپتی ہے۔

”میں آپ کی حالت کو سمجھتا ہوں“ ہومرز نے کہا۔
”میں ہر چیز کے لئے اپنی بہن لیڈی فالڈر کا دست نگر ہوں لیکن یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ انکی جائیداد پر انکا قبضہ تاحیر حیات ہے اور میں بری طرح مہاجنوں کے قبضے میں ہوں میں ہمیشہ سے چاہتا ہوں کہ اگر میری بہن مر جائیں تو قصود خواتین کوؤں کی جھجھک ٹوٹ پڑیں گے اور ہر چیز پر میرے صیقل پر میرے گھوڑوں پر قابض ہو جائیں گے۔

”مٹر ہومز اب سنئے کہ میری بہن ایک ہفتہ ہوا در حقیقت مر گئی ہیں“
”اور آپ نے کسی سے نہیں کہا؟“

مٹر ہومز میں کیا کر سکتا تھا۔ تباہی کا سامنا تھا۔ اگرچہ تین ہفتے کے لئے معاملات کو سنبھال لوں تو کام چلے انکی خادمہ کے شوہر یعنی یہ جو میرے سامنے کھڑے ہیں ایکڑ ہیں۔ ہنر یہ سوچا میں نے سوچا۔ کہ وہ کچھ عرصے کے لئے میری بہن کے روپ میں ہر ضرورت صرف اس بات کی تھی کہ روزانہ وہ گاڑی میں نکلا کرے کیونکہ انکی خادمہ کے علاوہ کسی کو میرے کمرے میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ ضرورت۔ ان سب باتوں کا انتظام کرنا چند مشکل تھا۔

اور میں انکو ہمیں چھوڑتا ہوں رہا آبکا طرز عمل سوا اس کے جا کر یا بجا ہونے کی بابت رائے دینا میرا کام نہیں۔ واٹسن اب آدھی رات کا وقت ہے اور میرا خیال ہے کہ ہم اب اپنی جانے قیام کو چلیں!

یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ اس عجیب واقعے کا انجام وہ نہ ہوا سربراہ جس کے مستحق تھے اس کا سکب پرنس ڈربی کی دودھیتا اور مالک کو اسی ہزار پونڈ نقد کی آمدنی ہوئی فرض خواہ دودھ کے ختم ہونے تک ہاتھ روکے رہے اور اس کے بعد ان کا قرض ادا ہو گیا پھر بھی سربراہ اس کے پاس کافی روپیہ بچا اور وہ آئندہ زندگی میں خوشحال زندگی بسر کرتے رہے۔ پولس اور عدالت دونوں نے معاملے پر ترجمانہ نظر ڈالی اور ڈربی کے خوش قسمت فلاح کو اطلاع وفات میں غیر معمولی تاخیر کی بنا پر عدالت نے صرف تنبیہ کر کے چھوڑ دیا اور اب اس عجیب واقعہ کے مصنف بچکر اپنی آئندہ زندگی تفکرات سے بری بسر ہو رہی ہے۔ (ڈویل)

شہاب برقی

آفتاب نایاب

برقی تو ہم متاثراتی تولد.....

برقی تو ہم کی گویاں! اسٹوری فی تولد.....

شہاب تبا کو کراہی پیشل فی سیر.....

ندہ تبا کو خلی فی سیر.....

علا سٹار آف ایڈیٹیوی تولد.....

عطر گلستان ام فی تولد.....

پیری بانو میرا کیل فی خشی چاروا نس.....

عطر ساجس کی پائیزہ خوشبو ہوائے بہا کی طرح.....

عطر نے برقی تو ہم یہ دی شہرہ آفاق تو ہم ہے جو ہندوستان ہندوستان.....

تائی سیکر کیا گیا ہے.....

اگر ایک دفعہ دیکھو تو اب یہ کہہ سکتے ہو کہ یہ شہرہ آفاق.....

شہرہ آفاق تاجر عطر تبا کو نظیر آبا د لکھنؤ.....

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کی ہندوستان بھر میں مشہور ہے

لے آئے اور دو رات کو اتر کر انہیں آفتان میں جلا یا کرتے تھے یہ سارا قصہ ہے مگر آپ نے کیونکر مجھے اتنا مجبور کر دیا کہ میں اسے بیان کر رہا ہوں میری سمجھ سے باہر ہے۔ ہومز نے کچھ دیر خیال میں غور کیا۔

”سربراہ آپ کے قصے میں ایک خامی ہے“ آخر کار اس نے کہا۔ ”اگر فرض خواہ آپ کی جائداد پر قبضہ کر لیتے تب بھی دودھ کی بابت آپ کی اسیدین اور بازیاں قائم رہ سکتی تھیں“

وہ گھوڑا بچلے میرے جائداد کے ہواوران لوگوں کو میری بازیوں کی کیا پرواہ؟ یہ بالکل ممکن تھا کہ وہ اسے سر سے دودھ ہی نہ بچو اور میرا سب سے بڑا فرض خواہ بد قسمتی سے میرا سب سے بڑا دشمن ہے وہ بڑا بدصفا ہے سالم برہ دور اس کا نام ہے میں نے ایک مرتبہ مجبور ہو کر اس پر خوب ہنر چلائے تھے۔ آخر کیا آپ امید کرتے ہیں کہ وہ مجھے بچانے کی کوشش نہ کرے گا؟ خیر سربراہ برہ ہومز نے اٹھ کر کہا ”اس معاملے کی اطلاع پولس میں ضرور ہونی چاہئے۔ میرا فرض صرف یہ تھا کہ واقعات کا انکشاف کروں

ابن یمن کے گمشدہ نایاب یوں کی دستیابی

حافظ کی شاعری کے متعلق ایک جدید انکشاف

اور
تاریخ ادب فارسی میں حیرت انگیز اضافہ

مندرجہ بالا عنوان کے ماتحت رسالہ نگار (ماہ مئی ۱۹۷۷ء) میں ایک مقالہ شائع ہوا ہے۔ مقالہ نگار صاحب نے بعض وجوہ کی بنا پر جنہیں وہ خود اچھا جانتے ہیں اپنا نام آرگس بتایا ہے۔ دنیائے ادب کی خوش قسمتی سے آرگس صاحب کو کہیں سے ابن یمن کے نایاب دیوان کی ایک کاپی دستیاب ہو گئی ہے جس کے مطالعہ نے آپ کی طبیعت پر ایک حیرت انگیز اثر پیدا کیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ آپ نے خواجہ حافظ کی شاعری کو ”صرف ابن یمن کی تقلید اور نقل“ کہہ دیا کاش کہ آپ اپنے خیالات کے اظہار میں ذرا میانہ روی سے کام لیتے اور اس اضافہ معلومات کی بنا پر ادبیات فارسی میں تہلک ڈالنے کی کوشش نہ کرنے، بات بہت معمولی تھی۔ اور معمولی طور پر کہی جاسکتی تھی۔ لیکن آپ نے قطرہ شبنم میں طوفانِ یم پیدا کرنے کی جو سی سی ہے اس نے مجھے مجبور کیا ہے کہ آرگس صاحب کے اس بلند آہنگ دعویٰ کا جواب لکھا جائے آرگس صاحب لکھتے ہیں:-

”اگر ایک طرف یہ امر مسلم ہے کہ بزمِ نفوس میں اپنے لئے بجا طور پر سندِ صدارت حاصل کر چکے ہیں تو دوسری طرف اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ حافظ کی شاعری کا کوئی خصوص رنگ نہیں ہے اگر اس وقت وہ ایک صوتی باصفا ہیں تو دوسرے وقت ایک زندہ لابیائی۔ اگر ابھی انکی تسبیح و تہلیل کے نعروں سے فنا تھا تو گوج رہی تھی تو کبھی ان کے ہوش سے سے فنا نہ تھیں ہنگامہ برپا نظر آتا ہے کسی جگہ نکات تصوف بیان ہو رہے ہیں کہیں فلسفیانہ معے حل کئے جا رہے ہیں اور کہیں نہ تصوف ہے نہ حکمت نہ شریعت ہے نہ طریقت ایک اہمال ہے ناقابلِ تاویل ایک بے راہ روی ہے منزل سے کوسوں دور یہ اعتراض زمانہ حال ہی میں ان پر وارد نہیں ہوا بلکہ خود ان کے زمانے میں بھی لوگوں نے اس کو محسوس کر لیا تھا۔ چنانچہ جب شاہ شجاع خواجہ حافظ سے کہیں غلط ہو گیا۔ تو اس نے خواجہ حافظ کو بلایا کہ آج آپ کی کوئی غزل ایسی نہیں جو ہو اور ایک رنگ پر قائم۔ ایک غرض صوفیانہ نکات ہیں تو دوسرے میں بوالہوسی کے جذبات تیسرے میں مشاعرے پر طعن و تشنیع جو تھے میں فلسفہ۔ اس کا کلیا سبب ہے..... اسی طرح اور لوگوں نے بھی حافظ کے اس انداز پر اعتراضات کئے ہیں اور آج ہی نقاد نگاہیں ان کی شاعری کے اس نقص کو نظر انداز نہیں کر سکتیں.....“

مجھے معلوم نہیں کہ علاوہ شاہ شجاع کے اور کن اصحاب نے خواجہ صاحب کی شاعری پر یہ اعتراض وارد کر کے اپنی خوش مذاقی اور فیض شناسی کا ثبوت

دیباچہ۔ دنیا جانتی ہے اور مقالہ نگار صاحب ہی اس سے نا آشنا ہیں کہ شاہ شجاع نے جو وقت خواجہ حافظ پر اعتراض کیا تھا اس وقت ان کے تعلقات باہم نہایت کشیدہ تھے اور نہ صرف یہ اعتراض بلکہ ادنیٰ ایسے ہی معنی اعتراض اس نے آپ کے کلام پر کئے اور وہ ہر جیلہ سے جائز ہو یا ناجائز خواجہ صاحب کو بدنام کرنا چاہتا تھا۔ اور ان کو تکلیف دینا چاہتا تھا ایسے اعتراضات کی وجہ محرک پر کچھ لکھنا میرے خیال میں چنداں مفید کار نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اعتراض کیا ہے۔ اور ان کی وقت کیا ہے۔

میں سچ کہتا ہوں کہ جب کسی شخص کو کسی شاعر کے کلام پر میں یہ اعتراض کرتے سنا ہوں کہ کلام ہموار نہیں بہرنگ نہیں۔ کہیں ایک خیال ۶ کہیں دوسرا۔ کہیں وہ صوفی ہے کہیں رند۔ کہیں موجد ہے کہیں بت پرست۔ کہیں مست ہے اور کہیں مستور۔ کبھی جائز ہے کبھی حقیقت۔ کبھی تسبیح و تملیل ہے اور کبھی جوس رانی تو مجھے معترض کی سخن شناسی اور اس کی ادبیات سے بیگانگی پر رحم آتا ہے اور اس کی دلیری پر غصہ۔ شاہ شجاع نے یا اس کی تقلید میں کسی اور صاحب نے جب ذوق صحیح کا جنازہ نکال کر خواجہ حافظ کی شاعری پر یہ اعتراض کیا تو کیا اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ حافظ غزلیں کہتا ہے۔ احیاء العلوم کو منظم نہیں کرتا۔ وہ صوفی نہیں ہے اور فصوص الحکم پر حاشیہ نہیں لکھتا۔ وہ نقیہ نہیں ہے اور ہدایہ کی شرح نہیں کرتا وہ فلسفی نہیں ہے اور بوعلی سینا یا فارابی کے فلسفہ کی تردید یا تائید نہیں کرتا وہ مفسر نہیں ہے اور کثاف کو شعروں میں منتقل نہیں کرتا وہ کسی کلمہ کا تفسیر نہیں ہے جو چاہتا ہے کہتا ہے۔ وہ پاب زنجیر نہیں ہے جبر چاہتا ہے جانتے ہے معترض آنکھیں بند کرے تو یہ اور بات ہے وگرنہ وہ دیکھ سکتا ہے کہ حافظ جو کچھ کہتا ہے لوگ اسے گوش دل سے سنتے ہیں اور وہ جبر چاہتا ہے لوگ اس کی خاک راہ کو آنکھوں کا سرمہ نہالتے ہیں۔ شاہ شجاع کے اعتراض کے جواب میں خواجہ صاحب نے جو کچھ کہا شاہ شجاع اسے نہ سمجھا اور نہ شاہ شجاع کی کو رائے تقلید کرنے والے اسے سمجھے۔ جواب مختصر اور دندان شکن تھا۔ آپ نے فرمایا حضرت آپ کا اعتراض سر آنکھوں پر۔ لیکن آنکھوں سے تعصب کی بٹی کھولے اور دیکھئے کہ میری غزلوں کو دنیا کن نگاہوں سے دیکھتی ہے اور برخلاف اس کے ان لوگوں کے کلام کا کیا حشر ہوتا ہے جو آپ کو میرے شعروں پر اعتراض کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

حدیث سے بری اسے سست نظم بر حافظ قبول خاطر و لطف سخن خدا داد است

حیران ہوں کہ یہ اعتراض خواجہ صاحب کی شاعری کے ساتھ کیوں مخصوص کیا گیا ہے کسی ایسے فارسی یا اردو شاعر کے دیوان کو اٹھا کر دیکھئے جسے قبل عام تعصب ہوا ہو۔ اور فرمائے کہ یہ اعتراض یہاں بھی اسی شدت سے وارد ہوتا ہے یا نہیں۔ آدمی فتویٰ یا قصیدہ لکھنے میٹھے تو اہلہ وہ ایک خاص رنگ ایک خاص خیال اور ایک خاص دعا کو مد نظر رکھ سکتا ہے غزل گو شاعر کو کسی ایسی پابندی سے کیا سروکار اس کی ایک غزل کو دوسری غزل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ایک ہی غزل کے ایک شعر کو دوسرے شعر کے ساتھ کچھ واسطہ نہیں۔ یہاں ایک خیال ہے وہاں دوسرا۔ یہاں ایک رنگ ہے وہاں دوسرا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اسی رنگ آمیزی میں غزل گو شاعر کا کمال فن ظاہر ہوتا ہے مناظر قدرت میں رنگ آمیزی کے کرشمے دیکھئے کیا تو س قزح کا حسن مختلف رنگوں کی آمیزش سے پیدا نہیں ہوتا۔ دریاؤں، پہاڑوں، جنگلوں، صحراؤں، ریگستانوں اور خیابانوں کے نظاروں کی دکشی کیا اسی اختلاف کی مرہون منت نہیں مصور کے قلم کی سحر کاریاں جو طلسم پیدا کرتی ہیں کیا وہ انہی مختلف رنگوں سے پیدا نہیں ہوتی یہی کیفیت غزل کی ہے کیا آپ نہیں دیکھتے کہ غزل غزل

کئے والے شاعر ایک رنگ کے پابند رہے ہیں کبھی کامیاب نہیں ہوئے اور کیا خود ابن سینا کی غزلیات بھی اسی وجہ سے قبول عام محروم نہیں ہوئیں؟ قبول عام اور شہرت دوام کی دولت سے بہرہ اندوز ہونے کے لئے ضروری ہے کہ شاعر ہر خیال کی ترجمانی کرے تاکہ اس کے دیوان میں جہاں ایک صوفی کے لئے سامان دلکشی موجود ہو وہاں ایک زندہ بارہ خوار کی طبیعت بھی لگی رہے۔ جہاں ایک فلسفی متحقق و معارف کا خزانہ مل سکے وہاں ایک عاقلی کے لئے بھی کچھ نہ کچھ موجود ہو۔

_____ شاعر جس دور میں آنکھ اور جس دقیقہ رس تحریل سے دنیا کو دیکھتا ہے وہ ہر ایک آدمی کو نصیب نہیں۔ شاعر جس چیز کو دیکھتا ہے اس کے ختلف پہلو اسے نظر آتے ہیں۔ اس لئے اگر کج ذہن ایک چیز کے ایک پہلو کو بیان کرتا ہے تو کل اسی چیز کے دوسرے پہلو کو بیان کرے گا جسے ایک نظر نہیں آنکھ ایک ناقابل حل تضاد دیکھتی ہے اور حیران رہ جاتی ہے۔

_____ اس صورت میں کیا یہ کنسار صریح ظلم نہیں کہ بعض دفعہ حافظ اپنی راہِ روی کی وجہ سے منزل سے کوسوں دور چلے جاتے ہیں۔ کیا اگر کس صاحب بتا سکتے ہیں کہ حافظ کی شاعری کی منزل نقص و کمی تھی اور وہ اپنی بے راہ روی کی وجہ سے منزل سے کوسوں دور جا کر کہاں جا سکے۔

_____ خواجہ حافظ کی شاعری کا یہ نقص بیان کر کے مقالہ نگار صاحب اس نقص کے وجہ پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

”..... ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں تعلیم معمولی ہوئی ہوگی خود تائید تھی۔ مکتب معمولی تھا اور یوں بھی

استاد اور شاگرد کی طرف کم توجہ کرتے ہیں۔ لہذا پہلا سبب تو ان کی تعلیمی خامی ہے جس نے عمر بھر ان کو کوئی

ایک راہ اختیار نہ کرنے دی۔ دوسرا سبب غالباً یہ ہوا ہوگا کہ ان کے حلقے میں کوئی موزون طبع ہنر از رہا کرتا تھا

..... شاعر وہاں جمع رہا کرتے تھے حافظ صاحب ادھر سے گزرتے تو ان کی طبیعت میں یہ ایک قسم کی

گدگد ہی پیدا ہوتی۔ یہاں تک کہ انہوں نے بھی شاعری شروع کر دی..... مجاس میں اٹھانے ہونے لگا

جہاں لوگ ان کو بتاتے تھے..... چونکہ ہزار کی دکان پر مختلف بالکالوں کا بیچ رہتا تھا اسلئے

جو رنگ ان کو اچھا معلوم ہوتا ہوگا اسی طرف توجہ کرتے ہوں گے شاعری کی ابتدا طبیعت میں ذاتی جوہر

قابلیت مفقود۔ استاد کوئی نہیں۔ مختلف رنگوں کا ان پر اثر ہونا ضروری تھا کچی لکڑی تھی۔ جب ہر جوجا تھا

مقام لوٹتا تھا۔ الغرض یہیں سے ان کی شاعرانہ کج روی کا آغاز ہوا۔ جو رفتہ رفتہ ترقی کرتا رہا.....“

تاریخی شہادتوں اور خود خواجہ صاحب کے دیوان سے یہ امر ثابت ہے کہ وہ ایک نہایت حید عالم تھے۔ آپ کا ہمدرد اور ہم عصر محمد علی تاج تھا۔ آپ کا دیوان مرتب کیا آپ کو ان الفاظ سے یاد کرتا ہے (علی صفات مولانا الاعظم المرحوم المبرور افضل العلماء استاد و نحاریر الادباء و محدث لطائف الطوائف مخزن معارف السجانیہ) اس امر سے کون شخص انکار کر سکتا ہے کہ کتاب اللہ کے متحقق و معارف سے آپ کا سینہ روشن تھا اور شعرا سے عرب کے دیوانوں کا آپ بہت گہری دیکھی سے مطالعہ کیا کرتے تھے حتیٰ کہ انہی علی مشاغل کی وجہ سے آپ اپنا دیوان مرتب نہ کر سکے خیالات کی لمبندی الفاظ

کابے شل انتخاب بندشوں کی جیتی اور اشعار کی سلاست شیرازی اور روانی جس کا ثبوت آپ کے دیوان کے ہر صفحہ سے ملتا ہے اس امر کی وجہ اب دلی ہے کہ آپ کا مطالعہ نہایت وسیع تھا۔ اور ادبیات فارسی میں آپ کو کما حقہ دسترس حاصل تھی۔ پھر معلوم نہیں کہ مقالہ نگار صاحب نے آپ کی تعلیم کو خام کیونکر سمجھ لیا میں انکی اس منطق پر بھی حیران ہوں کہ ایک بے کس تیم بچہ کی تعلیم معمولی ہوئی ہوگی کیا دنیا کے بڑے بڑے شاعر بڑے بڑے مصنف اور ہر سر زمین کے قابل ترین افراد تمام کے تمام نوابوں اور امیروں کے بیٹے ہوئے ہیں۔ نہیں بلکہ برعکس اس کے کہ تلخ بتا رہی ہے کہ تمام وہ لوگ جو آسان علم و ادب پر سارے بن کر چکے ہیں اور جن کی ضیافتشانیوں نے روئے زمین سے جہالت کی تاریکی کو دور کر دیا ہے غریب و الدین کے بیٹے تھے۔ الاما شاء اللہ۔ اس لئے یہ دعویٰ کہ خواجہ صاحب نے چونکہ بے کسی کی حالت میں تعلیم پائی تھی۔ اس لئے ان کی تعلیم خام رہی۔ اور ابن یسین چونکہ امیر ابن امیر تھے اس لئے ان کی تعلیم نہایت مکمل تھی۔ ایک ایسا دعویٰ ہے جس کی تردید ادوکلادیب تمام اقوام عالم کی تاریخ سے ہو رہی ہے۔

———— علاوہ ابن خواجہ صاحب کے کلام پر جو اعتراض کیا گیا ہے وہ تعلیمی خامی کا نتیجہ نہیں ہو سکتا تعلیمی خامی کا لازمی نتیجہ کلام کی خامی ہے۔

لیکن خواجہ صاحب کے معاصرین نے جو ان کے دشمن تھے یا سادہ سادگی ان کے کلام کو خام نہیں کہا۔ نہ کوئی ذی شعور آدمی ان کے کلام پر یہ اعتراض کر سکتا ہے۔

———— دوسری وجہ جو مقالہ نگار صاحب نے خواجہ حافظ کی شاعرانہ کج روی کی بیان کی ہے وہ یہ ہے ”طبیعت میں ذاتی جوہر قابلیت مفقود استاد کوئی نہیں مختلف رنگوں کا ان پر اثر ہو نا ضروری تھا“ شاعری کے لئے جس ذاتی جوہر قابلیت کی ضرورت ہے۔ اگر خواجہ حافظ میں وہ مفقود تھا۔ تو معلوم نہیں یہ جوہر اور کس شاعر کو ودیعت ہوا تھا خواجہ صاحب کے بے استاد ہونے کے متعلق صرف آناکندہ تیا کافی ہے کہ شعر ا و لامیذا لرحمن اس لئے کہلاتے ہیں کہ فن شاعری اس کو لیا یا کجوں میں نہیں پڑھایا جاتا۔ ”ذاتی جوہر قابلیت“ کی ضرورت ہے اور اگر یہ جوہر موجود ہو تو استاد کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ بصورت دیگر کوئی استاد کسی شاگرد کو شاعر نہیں بنا سکتا اور دنیا سے ادب کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے۔

راہ مختلف رنگوں کا اثر۔ اس باب میں بھی زیادہ کچھ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی شاعر جتنے مختلف شعر کا کلام سے جتنے مختلف رنگوں کا استعمال کرتا ہوتا ہے مفید ہے مطالعہ کی وسعت کو تعلیم کا نقص نہیں کہا جاسکتا۔

آگے چل کر اگر گس صاحب خواجہ حافظ اور دیگر شاہیرین پر ابن یسین کی فضیلت ثابت کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

”..... مگر ابن یسین خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے کیونکہ وہ شخص جس نے سب سے پہلے کیفیات حقیقی

کو جذبات غیر حقیقی سے جدا کیا۔ اور حقیقت و اسرار حقیقت کو غیر معصوم جذبات کی آئینہ نش سے بچا یا وہ

ابن یسین ہے۔ انھوں نے جہاں جہاں فضائے قدس میں پر پرواز کھولے ہیں اس قدر بلند چلا گئے ہیں کہ

کسی دوسرے خیال کی رسائی بھی نہیں سکتی

ابن یسین کا یہ رنگ بھی ہے کہ کبھی کبھی خانقاہ سے اٹھ کر بے خانہ کی طرف بھی چلے جاتے ہیں مگر بیان بھی

صوفی قائم رہتے ہیں۔ نہ کبھی رند لابی کی طرح کسی کی بگڑی اچھالتے ہیں نہ ان کا خرقہ و سجادہ کبھی رہیں
ہوتا ہے اور نہ وہ دین و دنیا کو ساقی کی نیم نگاہی پر قربان کر دیتے ہیں۔“

ابن سینا کے متعلق یہ سب کچھ صحیح سی۔ دیکھنا یہ ہے کہ جہاں شنوی یا قطعات میں یہ رنگ کامیاب ہو سکتا ہے کیا وہاں غزل میں بھی اس
رنگ کو کامیابی نصیب ہو سکتی ہے یا نہیں۔ اس سوال کا جواب خود ابن سینا کی شاعری سے مل سکتا ہے۔ آپ کے قطعات گو زبان زد خلاق ہوئے
مقبول ہوئے اور شہرت دوام کی سند حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے لیکن آپ کی غزلیں گوشہ نگہنامی سے باہر نہ آسکیں۔ غزل و غنائیں ہے
جو ممبر پر کہا جاتا ہے اور جسے پاس ادب ضرور ہوتا ہے۔ یہ ان لا ابالی رندوں کا کلام ہے جو لوگوں کی بگڑی بھی اچھالتے ہیں مگر ان لوگوں کی جن کی
دستار فضیلت کے نیچے خدا جانے کیا کیا چھپا ہوتا ہے۔ خرقہ و سجادہ کو رہیں سے بھی کرتے ہیں لیکن اس خرقہ و سجادہ کو دنیا و دین کی تہذیب سے ہے وہ دین
و دنیا کو ساقی کی نیم نگاہی پر قربان بھی کر دیتے ہیں لیکن اس دین و دنیا کو جس سے تمام دنیا بیزار ہوتی ہے اور اس ساقی کی نیم نگاہی پر جس کی نیم نگاہی
آج بھی دنیا سب کچھ کونے کے لئے تیار ہے۔

اگر ابن سینا بھی ایسی کچھ کرتے اور اسی رنگ میں کرتے جس رنگ میں خواجہ صاحب نے کیا تو آج ان کا دیوان بھی دیوان حافظ کی طرح گھر گھر موجود
ہوتا اور ان کی غزلیں دنیا سے اس طرح مغفوق نہ ہوتیں جس طرح وہ مغفوق ہوئیں۔ یہ غلط ہے کہ چونکہ ان کا دیوان کم ہو گیا اس لئے ان کی غزلیں نکل
اور مشہور نہ ہو سکیں۔ مشہور اور مقبول غزلوں کے دیوان کے کم ہو جانے سے غزلیں کم نہیں ہو سکتیں۔ اگر گن صاحب خود فرماتے ہیں کہ ”لوگ ان کے
قطعات اور غزلوں کو بازاروں میں گاتے تھے اور سوز و درد کی مجلسوں میں ابن سینا کی غزلیں خاص عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھی جاتی تھیں“
ایک اور مقام پر فرماتے ہیں کہ ”خراسان خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے جہاں کا گوشہ گوشہ امیر امین الدین کے مایہ ناز فرزند ابن سینا کے کلمات شاعری
سے گونج رہا تھا“ پس اگر یہ سچ ہے اور صحیح ہے کہ خراسان کا گوشہ گوشہ ابن سینا کے کلمات شاعری سے گونج رہا تھا اور ان کی غزلیں بازاروں میں
اور ہر بزم طرب میں گائی جاتی تھیں۔ تو پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ ان کے دیوان کے ایک نسخے کے کم ہو جانے سے ان کی تمام تر غزلیات روئے زمین سے
گم ہو جاتیں۔ پھر اس پر طرہ یہ ہے کہ ابن سینا کے دیوان کی دستیابی اس امر کی کافی دلیل ہے کہ دنیا میں دیوان ابن سینا کا صرف ہی ایک نسخہ
تھا جو ابن سینا کا اپنا تھا اور کم ہو گیا۔ بلکہ اور نسخہ بھی موجود تھے جن میں سے بعض کو متقدمین نے بھی دیکھا اور جن میں سے ایک کو آج اگر گن صاحب
نے خود بھی دیکھا ہے۔

با این ہمہ ابن سینا کے قطعات کے نسخے تو دنیا میں موجود ہیں۔ ہر ایک تذکرہ میں ان میں سے بعض نقل بھی ہوئے اور کتابی صورت میں طبع
بھی ہوئے۔ لیکن دیوان غزلیات مغفوق ہی رہا اور غزلیں ایسی کم ہوئیں کہ گویا کبھی لکھی ہی نہیں گئی تھیں۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مغفوق
اس لئے مقبول نہ ہوئیں کہ ابن سینا کو کبھی کبھی خانقاہ سے اٹھ کرے خانہ کی طرف بھی چلے جاتے ہیں مگر وہ یہاں بھی صوفی قائم رہتے ہیں۔
ایک اور مقام پر مقالہ نگار صاحب فرماتے ہیں کہ :-

اگر آپ کو عطر خریدنا ہے تو صہر علی محمد علی تاجر عطر کنوٹ سے منگائیے

”ابن مین کے دیوان میں صوفیانہ رنگ کے ساتھ انبساطی اور خمریاتی شاعری بھی ہائی جاتی ہے۔ مگر یہ بات کس قدر عجیب ہے کہ وہ خراباتی ہونے کے بعد بھی اپنی دلیق پارسانی کی ایسی حفاظت کرتے ہیں کہ ایک چھینٹ بھی اس پر نہیں طے ہو سکتی“

پھر کیا یہی دلیق پارسانی کی حفاظت اور یہی پاس ادب غزلیات کے مقبول نہ ہونے کی وجہ نہیں ہے خراباتی ہونے کے بعد بھی دلیق پارسانی کی حفاظت کرنا اور اس کو چھینٹوں سے بچانا غزل گو شاعر کو کہیں کا نہیں چھوڑتا۔

آرگس صاحب یہ دعویٰ کر کے کہ حافظ کی صوفیانہ شاعری صرف ابن مین کی تقلید اور نقل ہے اور خواجہ صاحب نے ابن مین کے دیوان کو رد و بدل کر کے ”اپنا لیلیٰ“ اپنے اس دعوے کو مضبوط کرنے کی خاطر حافظ اور ابن مین کی ملاقات ثابت کرنا چاہتے ہیں اور اس پر تاریخی شہادت پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ :-

”حافظ کی ابتدائی زندگی نہایت آزادی سیر و سیاحت اور زندگی میں گزری اور وہ مدتوں ادھر ادھر بچھا کئے۔ چنانچہ ان کے دیوان کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ مدہ متے مجدد اقلیم خراسان و ترکستان و ہندوستان رسیدہ“ مذکورہ نویسوں نے اس بحث سے بالکل قطع نظر کر لی ہے۔ کہ خراسان کب گئے۔ کیوں گئے اور وہاں کی شاعری کا رنگ کیا تھا۔ ہمارے پاس اس بات کی شہادت میں کہ حافظ خراسا گئے وہ الفاظ کافی ہیں جو ان کے دیوان کے دیباچہ میں موجود ہیں اور جن کو ہم ابھی نقل کر چکے ہیں اب رہا یہ امر کہ وہ خراساں پوپہنچ کر ابن مین سے ملے یا نہیں۔ سو اس کے لئے خود ابن مین کی شہادت سے زیادہ معتبر گواہی کس کی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے۔

چغم از طعنه اغیار ترا ابن مین کہ چوں حافظ بچاں یا رو نگارے داری

اس شعر سے نہ صرف اس بات پر قطعی استدلال کیا جاسکتا ہے کہ ابن مین حافظ سے ملے بلکہ اس سے ان تعلقات محبت و الفت پر بھی کافی روشنی پرتی ہے جن کی بنا پر انھوں نے حافظ کو یا رو نگار لکھا ہے۔ یعنی نہ صرف حافظ کی محبوبیت اور ابن مین کی دلدادگی اس سے ثابت ہوتی ہے بلکہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپس کی یہ محبت کافی بدنام ہو چکی تھی“

معلوم نہیں آرگس صاحب نے کن آنکھوں سے دیوان حافظ کے دیباچہ کو دیکھا اور وہاں سے مذکورہ بالا عبارت نقل کی جس کی بنیاد پر ایک بے بنیاد اور بے سرو پا افسانہ مرتب کر لیا۔ اگر وہ معمولی انسانی دوا آنکھوں سے دیباچہ کو ملاحظہ فرماتے تو وہ کبھی اس خطرناک غلطی میں نہ پڑتے نہ وہ ان مذکورہ نویسوں کا گلہ کرتے جنھوں نے اس بحث سے بالکل قطع نظر کر لی ہے۔ دیباچہ کی اصل عبارت اس طرح ہے۔

..... بنا بریں غزل لیسے جا نگیرش بادی دے مجدد اقلیم خراسان و ترکستان و ہندوستان

عمدہ عطر کہاں فروخت ہے صہر علی محمد علی تاجر عطر کہنہ سے ہر قسم کا عطر منگائیے

رسیدہ و متواضع سخن ہاے دلپزیرش در اقل زباں با طراف داکتاف عرا قین دآذر با بجاں سر کشیدہ»

دیباچہ نگار کہتا ہے کہ خواجہ حافظ کے کلام کو وہ عالم گیر شہرت نصیب ہوئی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں آپ کی غزلیں خراسان، ترکستان، ہندوستان، عراق، عرب، ایران، عجم اور آذربائیجان تک پہنچ گئیں۔ لیکن مقالہ نگار صاحب نے خود خواجہ صاحب کو اٹھا کر ان تمام اقالیم کی سیر کر ڈالی بتایا کہ شاید ہے کہ خواجہ حافظ کبھی ایران سے باہر نہیں نکلے اور گو مندرجہ بالا تمام ممالک سے ان کو طلبی کے فرمان شاہی درباروں سے پہنچتے رہے لیکن اس گنج عافیت کے درویش نے کبھی باہر جانا گوارا نہ کیا۔ دیباچہ نگار کے اس مضمون کی تائید دیوان حافظ میں جابجا موجود ہے۔ مثلاً:-
عراق و پاس گزنی بشعر خود حافظ بیا کہ نوبت بند او دقت تبریز است ز شعر حافظ شیراز سے گویند و قند سید چشمان کشمیری و دیکن سمرقندی بندہ کے بادشاہ سلطان احمد بن ادیس نے کی بار آپ کو طلب کیا آپ جانے کی آرزو تو کرتے رہے لیکن گھر سے باہر قدم نہ رکھا۔ فرماتے ہیں۔

وہمیر دیم بمقصود خود اندر رشید از خرم آن روز کہ حافظ رہ بنداد کنت

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں۔
شکر شکن شوند ہمہ طویان ہند زین قند پارسی کہ بہ گالامی رود حافظ ز شوق مجلس سلطان شایس غافل مشوک کار تو از نالامی رود
خواجہ صاحب دکن آتے آتے رہ گئے جہاز میں سوار بھی ہوئے۔ لیکن پھر اتر پڑے اور شیراز واپس چلے گئے اسی تقریب پر کہتے ہیں۔
بس آسان سے نمود اول غم دریا ہوئے در غلط کردم کہ ہر مجلس بعد گہرنی ارزد
افسوس ہے کہ مقالہ نگار صاحب نے دیباچہ کے پڑنے میں زرا اسی غلطی کر کے بات کو کہاں سے کہاں پونچا دیا اور پھر اس ایک شعر سے جو انھیں دیوان ابن عربین میں نظر آیا کیا کیا نتائج اخذ کئے خدا جانے یہ شعر ابن عربین کا ہے بھی یا نہیں اور اگر ہے تو اس کا مطلب کیا ہے۔ اگر گس صاحب خواجہ حافظ کا یہ شعر بھی دیکھ پاتے تو فوراً فرماتے کہ یہ شعر حافظ نے اس شعر کے جواب میں لکھا ہے اور طرفین سے اس دعوے کی تائید کر لیتے ۵

بس دعلے سحر ت حافظ جان خواہد بود تو کہ چوں حافظ بخیر غلامے داری

مقالہ نگار صاحب نے دیباچہ کے مذکورہ بالا الفاظ اور دیوان ابن عربین کے ایک کی بنا پر خواجہ صاحب کی ایک مکمل سوانح عمری قیاسات کے زور پر مرتب کر لی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

”قیاس کی بنا پر یہ ہی کہا جاسکتا ہے کہ حافظ ترک نثر ادب تھے ممکن ہے کہ میر الدین اور حافظ کے والد بہاؤ الدین کے تعلقات اچھے رہے ہوں غرض یہ کہ حافظ یقیناً اپنی ابتدائی شاعری میں خراسان گئے اور اور قصبہ فرود میں پہنچے ابن عربین نہایت مشہور رحمان نواز تھے

حافظ ابن مبین ہاں پہنچے اور ابن مبین نے..... ان کی پزیرائی کی۔ پھر یہ وہاں مدتوں ایک محبوب
 ہماں کی حیثیت سے مقیم رہے..... یہ زمانہ ابن مبین کی شاعری کا آخری زمانہ تھا۔ وہ نکات تصوف کو
 شاعرانہ پیرایہ میں ادا کر کے داد حاصل کر چکے تھے کہ حافظ پہنچے..... اس لئے نتیجہ یہی ہونا تھا۔ کہ
 کہ ابن مبین خود ان کو انچونگ میں رنگ لیتے۔ یا خود حافظ ان کی نقل و پیردی کرنے لگ جاتے ہر صورت حافظ کی
 صوفیانہ شاعری ان کی ذاتی شاعری نہیں کسی جاسکتی وہ کسی صورت سے بھی ہوصرف ابن مبین کی تقلید و نقل ہے
 دیوان ابن مبین کا نہایت قدیم نسخہ میری نگاہ سے گزرا ہے اور اسی کا مطالعہ کرنے کے بعد
 مجھے اس حقیقت کا انکشاف ہوا۔ کہ حافظ کی صوفیانہ شاعری یکسر ابن مبین کے دیوان سے ماخوذ ہے۔.....
 ابن مبین کا دیوان ان کی وفات سے چند سال پیشتر تک ہو گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حافظ ابن مبین کے یادگار
 بنے ہوئے ہر وقت ان کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ پھر اگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ممکن ہے یہ یکم شدہ کلام حافظ
 کے ہاتھ لگا ہو اور اس میں رد و بدل کر کے حافظ نے ”اپنا لیا“ ہو (علی الخصوص اس وقت جب کہ ان کی غزل گوئی
 کا شرہ اس واقعہ کے بعد ہوا ہے) تو یہ ماننا ہی پڑے گا کہ حافظ کا تصوفانہ رنگ یکسر ابن مبین سے ماخوذ
 ہے.....“

دیکھئے ایک چھوٹی سی غلطی سے کتنی اور خطرناک غلطیاں پیدا ہوئیں۔ اور آگس صاحب نے ہوا میں بنیاد قائم کر کے کتنے عالی شان
 عمل تیار کر لئے۔ قیاس پر قیاس کرتے چلے گئے۔ اور آخر کار خواجہ صاحب کی دیانت اور ان کی شاعری پر ایک نہایت بے باکانہ حکمہ کر کے دم لیا
 اور دیے الفاظ میں خواجہ صاحب پر دیوان ابن مبین کی چوری اور ابن مبین کی غزلیات کے سرحد کا الزام لگا دیا آج کل علمی دنیا میں ریسرچ
 کا زور وغور ہے اور یہ زور وغور بسا اوقات دیوانگی کی سرحد تک جا پہنچتا ہے انہی ریسرچ والوں نے یہ بھی کہا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا
 نام ہی نام ہے دنیا میں کبھی ان کا وجود نہیں ہوا۔ ان کی زندگی اور ان کے کارناموں کو کہا تھا کہ مضمض انسانہ ہے۔ انہی بزرگوں نے یورپ کے
 مشہور ترین ڈرامے نوین شیکسپیر کے متعلق کہا تھا کہ اس کی ہمتی بھی ایک من گھڑت کہانی ہے اور یہ تمام ڈرامے اور لوگوں کے کلمے ہوئے
 ہیں۔ ابھی چند دنوں کی بات ہے کہ اسی فرقہ کے ایک حضرت نے فرمایا تھا کہ عمر خیام ایک فرضی نام ہے اور باعیاات عمر خیام مختلف شعرا کی رباعیات
 کے ایک مجموعہ کا نام ہے جن کو کسی میاض نویس نے اکٹھا کر کے مرتب کیا اور ایک فرضی آدمی کے نام پر مشہور کر دیا آج دنیا کے ادب میں یہ حیرت
 انگیز انکشاف ہوتا ہے کہ دیوان حافظ ابن مبین کا یکم شدہ دیوان ہے جسے حافظ نے رد و بدل کر کے اپنا نام مشہور کر دیا۔ کتنا ظلم ہے کتنی بے ہمتی
 ہے اور کتنا بڑا بے باک اور بے بنیاد دعویٰ ہے۔ آگس صاحب اگر انصاف کرتے مبالغہ نہ کرتے میانہ روی اختیار کرتے اور خواجہ حافظ اور ابن مبین
 کے ہم خیال اشعار بالمقابل پیش کر کے ان پر تنقید کرتے تو یہ مقالہ ایک نہایت مفید چیز ہوتی۔ لیکن انھیں ضروری معلوم ہوا کہ ایک حیرت انگیز

انکشاف کے عنوان کے نیچے حیرت انگیز باتیں ہی بیاں کی جائیں۔

آپ نے آگے چل کر خواجہ حافظ اور ابن مین کے دیوانوں سے بالمقابل غزلیں اور شعر پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بعض جگہ تو حافظ نے پوری کی پوری غزلیں ہی چرائی ہیں اور بعض جگہ ابن مین کا صرف خیال لے کر اپنا یا ہے اور اسے بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ چنانچہ پہلے دونوں دیوانوں سے یہ دو غزلیں مثال کے طور پر پیش کی ہیں۔

حافظ

ابن مین

ساتی بریز جرعہ و صلت بجام ما	کز شربت ذوق تلخ بہت کام ما	ساتی بنور بادہ برافروز جام ما	مطرب بگو کہ کار جہاں شد بکلام ما
اے باد اگر کبے نگارم گزرتی	زہار عرصہ دہ بے سگاش سلام ما	اے باد اگر گلشن احباب بگزرتی	زہار عرصہ دہ برجاناں پیام ما
مستقیم جادوان ز لب لعل آن نگار	زاد خبر نباتت ز عیش مدام ما	مادر پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم	اے بے خبر لذت شرب مدام ما
شاید برابر ہی کند در دم حساب	مال حلال زادہ آب حرام ما	ترسم کہ صرفہ نیر در ز بازخواست	نان حلال شیخ ز آب حرام ما

یہ دونوں غزلیں لکھ کر مقالہ بھار صاحب فرماتے ہیں :-

”دونوں کے مطلع تقریباً ایک ہیں۔ دوسرے شعر میں کوئی فرق نہیں۔ ابن مین کا چونکہ خاص رنگ یہ ہے کہ وہ ادب جن و عشق کا بہت لحاظ رکھتے ہیں اس لئے انھوں نے (بے سگاش سلام ما) کا مگر حافظ نے (برجاناں پیام ما) کہد یا حالانکہ یہ کسی طرح اس ٹکڑے سے اچھا نہیں۔ ابن مین نے آداب عشق کو ملحوظ رکھا ہے..... حافظ کی شوخ مزاجی نے شعر کے مفہوم کو گرا دیا دوسرے شعر میں گو حافظ کا شعر حسبت معلوم ہوتا ہے۔ مگر دراصل جس قدر لطیف خیال ابن مین نے ظاہر کیا ہے وہ حافظ کے تصرف سے برابر ہو گیا..... پیالہ میں عکس رخ یا دیکھنا ایک دور کی بات ہے۔ اگرچہ یہ مضمون بھی ابن مین ہی کا ہے چوتھا شعر یا کل ایک ہے ابن مین کے یہاں مال ہے اور حافظ کے یہاں نان۔ ممکن ہے کہ کاتبوں کی تحریف سے نان کا لفظ مال بن گیا ہو“

ابن مین کو دیکھ کر سخن شناس آنکھیں نوراً بچاں لیتی ہیں کہ اصل مال کس کا ہے۔ کاتبوں کی تحریف سے تو آگس صاحب آشنا معلوم ہو رہے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ کاتبوں کی اس سے بڑھ کر تم ظریفیوں سے بھی نا آشنا ہوں گے۔ کوئی پرانی کتاب نہیں جس میں اخاقی جیسے نہ ہوں کسی پرانے شاعر کے دیوان کو دیکھئے دوسرے شاعروں کی غزلیں اور شعر مزور وہاں موجود ہوں گے جن زمانے میں طاعت کا انتظام نہ تھا۔ لوگ مختلف بیاضوں سے مختلف مسودوں سے اور مختلف لوگوں کی ربانی سن کر دیوانی مرتب کیا کرتے تھے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا تھا۔ کہ اکثر ادھر ادھر کی غزلیں اور شعر غلط ملط ہو جاتے تھے۔ موجودہ مثال میں بھی صاف صاف نظر آ رہا ہے کہ وہی خواجہ

حافظ کی غزل ہے جو سرخ ہو کر دیوان ابن مین میں درج ہو گئی۔ ایرلن سے خراسان پونچھتے پونچھتے درمیانی رادیوں کا سلسلہ بڑھتا چلا گیا اور
تجہ یہ ہوا کہ غزل بگڑتی چلی گئی۔ موجودہ صورت میں کسی بیاض نویس کے پاس پونجی اور حافظ کی نہیں بلکہ ابن مین کی بیان ہوئی، اور ان کے
دیوان میں درج ہو گئی۔ دونوں غزلیں غور سے دیکھئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن مین کی غزل کسی شاگرد کی غزل ہے جسے کسی پختہ کار استاد کے قلم نے
فرش سے عرش پر پہنچا دیا ہے۔

برعکس اس کے آرگس صاحب یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ابن مین کی غزل کو حافظ نے اپنا یا ہے اور بگاڑ دیا ہے
آپ فرماتے ہیں کہ مطلع دونوں کا قریب قریب ایک ہے۔ حالانکہ دونوں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ابن مین کا جرمہ وصل اور شربت
فراق ہی پرانی پامال اور بے لطف ترکیبیں ہیں جسے درجہ دوم کے شاعر استعمال کرتے ہیں۔ حافظ کا مطلع اس قدر روشن اس قدر تازہ
اور اس قدر پر جوش ہے کہ انسان چڑھتے ہی جھومنے لگ جاتا ہے۔ ساقی اور مطرب کو ایک ہی وقت پر سرکار لا کر خواجہ صاحب نے محفل کو
اتنا گرم کر دیا ہے کہ ہوش و نگشت الا مان الا مان کہنے لگ جاتے ہیں دوسرے شعر کے متعلق مقالہ نگار صاحب فرماتے ہیں کہ ابن مین نے
آداب حسن و عشق کا لحاظ رکھا ہے اور حافظ نے شوخ و اجی سے شعر کے مفہوم کو گر ا دیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسی پاس ادب نے شعر کو
خاک میں ملا دیا ہے۔ کوئے جانان کے کتوں کی پاؤں خواجہ حافظ سے کوئے ہو سکتی تھی۔ کبھی ہوئی حسن و عشق کا امیرا بیان کرنے والا ایک
غزل گو شاعر۔ پھر پاس ادب ملحوظ۔ ایسی باتیں ہیں جو خیال میں نہیں آسکتیں۔

موسیا آداب دانان دیگر اند سوختہ جان درداناں دیگر اند

مصرع زہار عنہ وہ بیگانش سلام ما۔ کتنا تو در کتنا حافظ کے کا نام دنیا بھی گوارا نہیں کرتے۔ چنانچہ شیخ فیضی فرماتے ہیں۔

منم فیضی کہ در میدان معنی چمن چابک سوار تیز گشت

بجلد شعور من از پوست تامغز بجائے مردم ناپاک رگ نیست

بدان سے ماند این پاکیزہ گفتار کہ در دیوان حافظ نام گشت

موجودہ دیوان حافظ کے نسخوں میں صرف ایک جگہ لفظ سگ آیا ہے اس کے متعلق بھی مولانا آزاد بلکہ اسی کہتے ہیں کہ بعض دیوانوں

میں یہاں بھی یہ لفظ موجود نہیں۔

تیسرے شعر کے متعلق مقالہ نگار صاحب فرماتے ہیں کہ پیالہ میں عکس رخ یار دیکھنا ایک دوسری بات ہے اور پھر یہ مضمون بھی ابن مین
ہی کا ہے۔ بہر حال دونوں شعروں کو ٹپھٹے اور انصاف سے کہنے کہ حافظ کا شعر کتنا بلند کتنا شوخ اور کتنا دلنشین ہے۔

آرگس صاحب فرماتے ہیں کہ یہ خیال بھی ابن مین کا ہے، در اس کی سند میں یہ شعر کہا ہے

زالہ زار ہاں یک پیالہ چوں قدیم نمود طلعت ساقی درون این قدح

صفر علی محمد علی تاجر عطر کہنو سے ہر قسم کا عمدہ عطر خرید کیجئے

اب فرمائے کہ اس شعر کو خواجہ حافظ کے اس شعر سے کیا نسبت ہے۔ خواجہ حافظ کا شعر کس قدر شیریں رداں اور لطیف ہے اور ابن سین کا شعر نقل محض ایک ہی خیال کو مختلف شاعر اپنے اپنے رنگ میں بیان کرتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ طرذ بیان کس کا زیادہ پر لطف ہے اور نہ کسی شاعر کا کوئی شعر ایسے مزہ داس کہ ہم خیال شعر اور کئی شاعروں کے دیوانی میں بھی موجود ہوں گے۔ مثلاً اسی خیال کو ایسے سلمان ساڈجی نے کس خوبی سے ادا کیا ہے۔

د ازل عکس لب لعل تو در جام فنا د عاشق سوختہ دل در طبع خام افتاد

جو تھا شعر بھی حافظ کا کس قدر عالی شان ہے اور بگیرہ کر کیا بن گیا ہے۔ (ترسم کہ صرف نہ ہر دم کہاں اور) شاید ہر ابری نہ کند (کہاں حافظ کا انداز بیان بہت پُر زور ہے اور نہایت لطیف طعن کا پہلو لے ہوئے ہے۔ پھر زبان کو مال بنا کر شعر کی ساری خوبی ضائع کر دی گئی ہے لیکن ظلم ہے کہ اگر کس صاحب حافظ کی مسح شدہ غزل کو دیوان ابن سین میں دیکھ کر اٹھے حافظ کو چور بنا گئے۔ اس الحاق کی مثالیں دیوانوں میں اس کثرت سے ملتی ہیں کہ شاید ان کا بیان کرنا چنداں مفید کار نہ ہو۔ عوام کہے، یہ الحاق خطرناک غلطیوں کا موجب ہو سکتا ہے۔ لیکن سخن شناس حضرات الحاقی غزلوں اور شعروں کو دیکھتے ہی اصلیت معلوم کر لیتے ہیں اور متاع سخن کو اس طرح پہچان لیتے ہیں جس طرح کسی مال پر ٹریڈ مارک لگا ہوا۔

_____ آگے چل کر اگر کس صاحب فرماتے ہیں۔

”حافظ کا یہ شعر بہت ہی مایہ ناز شعر شمار کیا جاتا ہے اور زبان زہر ہو کر ضرب المثل کے درجہ تک پہنچ گیا ہے حالانکہ فی الحقیقت یہ ابن سین کا خیال تھا جس کو حافظ نے اپنا لیا۔ حافظ کا شعر ہے

آسمان بار امانت تو انست کشید قرعہ قال بنام من دیوانہ زدند ابن سین کہتا ہے۔

روز اول کہ بنام ہمہ کس قرعہ زد روز قرعہ عشق بنام من سکیں افتاد حافظ نے اگرچہ چستی بندش سے شعر کو بہت کچھ آراستہ کیا ہے مگر اس میں طلسم بندی الفاظ کے سوا اور کچھ نہیں ہے پہلے مصرع سے واقعہ کے اپر کوئی روشنی نہیں پڑتی کہ یہ کب ہوا۔ اور نہ قرعہ قال سے کوئی خاص مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ تیسرے یہ کہ حافظ نے جس لفظ کو بدل کر دیوانہ رکھا ہے وہ بظاہر بہت جست ہے مگر اس میں یہ نقص ہے کہ دیوانہ کو کسی امر کا مذہ دار نہیں بنایا جاتا اور وہ غیر مکلف ہوتا ہے جس شخص کے ذہن میں آیت (انما نعشنا اللاماتہ) نہ ہو اس کا ذہن اس واقعہ کی طرف منتقل ہونا غیر ممکن ہے۔ برعکس اس کے ابن سین نے پہلے واقعہ کا وقت بتایا حالات کا اظہار کیا کہ اس وقت سب موجود تھے۔ پھر سکیں کے لفظ سے نقد انسانی

موجب آید (ظہوراً جہولاً) پوری پوری تفسیر کر دی۔ حافظہ کے یہاں یہ کچھ بھی نہیں ہے۔

یہ شعر فہمی اس شعر فہمی عالم بلا سے کسی طرح کم نہیں جس کا کلمہ ایک مظلوم شاعر نے کیا تھا حافظہ اور ابن مین کے ان دو شعروں میں سوائے لفظ (قرعہ) کے اور کوئی چیز مشترک نہیں۔ نہ ایک واقعہ کا ذکر ہے۔ نہ ایک خیال کا اظہار ہے نہ انداز بیان میں کسی قسم کی یکسانیت ہے خواجہ حافظہ نے قرآن کریم کی ایک آیت کو سامنے رکھ کر اس کے مطالب بیان کئے ہیں اور اس خوبصورتی سے بیان کئے ہیں کہ اس سے بہتر صورت خیال میں نہیں آسکتی۔ ابن مین نے جو کچھ کہا ہے اس کا مفہوم اردو کے ان دو شعروں سے ظاہر ہوتا ہے۔

قسمت کیا ہر ایک کو قسام ازل نے جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا
بلبل کو دیانا لہ تو پردے کو جلنا غم ہم کو دیا سب سے جو شکل نظر آیا

آرگس صاحب کو حافظہ کے شعر میں سوائے لفظی طلسم کے اور کچھ نظر ہی نہیں آتا عجیب معقول اعتراض ہے کہ پہلے مصرعے سے واقعہ کے اظہار کوئی روشنی نہیں پڑتی کہ یہ کب ہوا۔ حافظہ کوئی تاریخ بتاتے نہیں لکھ رہے تھے کہ واقعات کو سنہ وار بیان کرتے لفظ دیوانہ پر آپ نے یہ اعتراض کیا ہے کہ دیوانہ ممکن نہیں ہوتا۔ یہ قانونی اعتراض بھی قابلِ داد ہے۔ پھر یہ فرماتے ہیں کہ جس شخص کے ذہن میں یہ آیت نہ ہو اس کے لئے اس شعر کا سمجھنا ناممکن ہے یہ تو آپ نے ہی فرمایا۔ لیکن جس شخص کا ذہن اس شعر کو پڑھ کر فوراً اس آیت کی طرف منتقل نہ ہو وہ پھر حافظہ کے دیوان کو کیوں پڑھے اور اس کی نگاہ میں جلے گیوں؟ آسمان۔ بار آسمان اور دیوانہ کے الفاظ سے فوراً آیت یاد نہ آجائے تو اس میں حافظہ کا کیا قصور ہے کیا آپ خواجہ صاحب سے یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ شعر میں سورۃ اور آیہ کا نمبر بھی لکھ دیتے۔ سب سے بڑھ کر قسم ظریفی یہ کہ اپنے لفظ مسکین کو ظہوراً جہولاً کی پوری تفسیر لکھ دیا ہے اور اس کے مقابلہ میں لفظ دیوانہ کو بے محل قرار دیا ہے معلوم نہیں کہ لفظ مسکین کو ظہوراً جہول سے وہ کون سی نزدیک کی نسبت ہے جو لفظ دیوانہ کو نہیں۔

آرگس صاحب نے اس شعر کے علاوہ اسی مضمون پر ابن مین کے اور شعر بھی تلاش کر کے لکھے ہیں۔

دور اول زحمت کہ تضاغم نہ وہ بود قرعہ عاشق بیدل بہم برغم زہ بود
برائے قتل میرزاں کہ قرعہ افکندہ بنام ہجج من بے گناہ بردن شد
بنام کسے حال برندی نہ برآید این قرعہ بنام من باک تو ان زد

اس کے بعد آپ لکھتے ہیں کہ

”اتنے شعروں کے لکھنے کے بعد یہ کہنا ایک فضول اور دور ازکار بات ہے کہ یہ مضمون صرف ابن مین کے

دماغ سے نکل سکتا تھا اور حافظہ نے اس کو لیا بھی تو اس صورت سے ادا نہ کر کے جیسا کہ چاہئے تھا۔“

مجھے معلوم نہیں کہ ابن مین کے ان شعروں کا خواجہ صاحب کے اس شعر سے کیا تعلق ہے۔ اور اگر کچھ حقیق ہے بھی تو خواجہ صاحب کا

شعر ابن یسین کے شعروں سے کیوں پست ہے۔ البتہ۔ البتہ قوانین شریعت اور منطق کے قواعد کے مطابق اگر شعروں پر جرح کی جائے تو پھر شعریں باقی کچھ نہیں رہ جاتا۔

ابن یسین کے اس مضمون پر سلمان سادجی کا شعر بھی ملاحظہ ہو۔

عشق پر کشتن عشاق تفاق دل نے کرد
ادین قرعہ کہ زد بہن بدنام افتاد

اس کے بعد آرگس صاحب نے ابن یسین اور حافظ کے بعض ہم خیال شعروں پر ہر شاعر کے مقابلے میں دوسرے شاعروں کے موجود ہیں۔ لیکن اس تعادل سے خواجہ صاحب کی فوقیت ثابت ہوتی ہے نہ کہ برعکس اور ہم خیال شعر تو ہر شاعر کے مقابلے میں دوسرے شاعروں کے موجود ہیں۔ اس سے تقلید یا نقل یا اغذ ثابت نہیں ہوتا۔ آرگس صاحب نے اکثر صرف ایک دو لفظوں کے مشترک ہونے سے شعر بالمقابل لکھ کر رکھ دیے ہیں۔ مثلاً۔

ابن یسین

حافظ

سوسان حشر حق تو برہم نہ ہو	حسن زیبائے تو آندم کہ قہر کرد	کہ عشق از پردہ عصمت بردا در بخارا	منا از آن جن بعد از سر ک پیوستہ ز نام
بیالہ گیر دلالہ زار سے گورد	نوش بادہ کہ وقت ہمارے گورد	جان نامہ و خنیز ہم نوا ہد ماند	نوش بادہ کہ ایام غم نوا ہد ماند
جیران دوست دیدہ مشوقہ باز ما	عمرے ست تاکہ حسن رخ یاد دیدہ	با من چہ کرد ویدہ مشوقہ یازن	دید ی دلا کہ آخر پیری دہم عمر
چون گشتہ است عین حقیقت مجاز ما	ابن یسین ز عشق جان منج کو توں	تاکہ شود قہرین حقیقت مجاز ما	نقشے بر آب مے زخم از گریہ حالیا

جائے اضافہ ہے کہ ان شعروں میں کون سی ایسی بات مشترک ہے جس کی بناء پر کہا جاسکے کہ حافظ نے ابن یسین کے خیالات لئے اور انھیں اپنا لیا ہے

اس کے بعد آرگس صاحب نے خواجہ صاحب اور ابن یسین کی طرح غزلیں پیش کی ہیں اور کہا ہے کہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ حافظ کے پس پردہ ابن یسین بول رہے ہیں۔ مندرجہ ذیل غزلوں کو دیکھ کر ناظرین اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ دعویٰ کہاں تک درست ہے:-

ابن یسین

حافظ

تا کہ من چہرہ آن ماہ قاضی نیم	تا کہ من چہرہ آن ماہ قاضی نیم	دین عیب بین کہ چہ نور سے کیان نیم	دخرا بات خال نور خدای نیم
ہر کجائے شوم بے تراسی خنوم	ہر کجائے شوم بے تراسی خنوم	خانہ بی دین خانہ خدای نیم	جلوہ بر من مفروش اولک لک لک کتو
مگر یہی خاصیت از باد صبا می نیم	مگر یہی خاصیت از باد صبا می نیم	ہی ہمہ از اثر لغت شامی نیم	سوز دل شکبہ راں بکھر زائش
من کہ آن چشم نیم از عین بلا می نیم	من کہ آن چشم نیم از عین بلا می نیم	خکرو در دست ہما نا کہ خدای نیم	خوام از لغت جہاں نافہ کشتی کتو
طرز شہ کہ در احسان گدا می نیم	طرز شہ کہ در احسان گدا می نیم	اسچن ہر سحر باد صبا می نیم	کس ندید بہت ز مشک خن نو خدیں

حافظ کے تصوف اور ابن یسین کے تصوف کا مقابلہ کرتے ہوئے آرگس صاحب فرماتے ہیں کہ:-

معاظ کا تصوف بالکل ابن مین کا تصوف ہے اگر کوئی فرق ہے تو صرف اتنا کہ ابن مین تصوف کو تصوف کے حدود میں رکھتے ہیں اور حافظ چونکہ وہ قدرت نہیں رکھتے اس لئے ان کے یہاں حقیقت و مجاز اور پاراسائی و رندی دونوں مخلوط ہو گئے ہیں۔ ابن مین جس سلسلہ کو بیان کرتے ہیں وہ عین حقیقت کے مطابق ہوتا ہے اور شاعرانہ خصوصیت بھی ہاتھ سے نہیں جاتی۔ حافظ کیس ان کی نقل میں کامیاب ہوتے ہیں کیس محض لطف شاعری رہ جاتا ہے اور اصل سلسلہ میں کوئی جان باقی نہیں رہ جاتی۔ الغرض حافظ کا تصوف ابن مین کی نقل ہے جو بعض دفع مطابق اصل ہوتی ہے اور بعض جگہ نہیں اور یہی ہونا بھی چاہئے تھا کیونکہ حافظ کا تصوف سے صرف مقالاتی نسبت تھی.....“

اس بحث پر پہلے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بتایا جا چکا ہے کہ جس بات سے ابن مین کی خواجہ صاحب پر فوقیت ظاہر کی گئی ہے وہی بات ابن مین کی غزلیات کی ناکامیابی کا باعث ہے اور یہی حقیقت و مجاز اور رندی و پاراسائی کا ہم مخلوط ہونا جو حافظ کے تصوف کا نقص بیان ہوا ہے۔ حافظ کی شاعری کے لئے یکسما کا اثر رکھتا ہے۔

ذرا اور آگے چل کر مقالہ نگار صاحب فرماتے ہیں کہ حافظ کی شراب وہی معمولی تلخ اور بدبو دار پانی ہے۔ برعکس اس کے ابن مین جب اس رنگ میں کہتا ہے تو اس کی شان ہی دوسری ہوتی ہے مثال کے طور پر چند شعر بھی پیش کئے ہیں ملاحظہ ہوں۔

از دست یار ساغر وحدت کشیدہ ایم	در بزم لامکان زکیں و مکان جدا
بادہ زندان مادر ساغر و بیادہ نیست	مستی این سے پرستان از خم و خمی نہ نیست
چشم مست تو عشاق جو پرست شدند	ہمہ سب کو کش بزم سے است شدند
حویلی کو شراب عشق نوشد	دو عالم را بہ یک جرعه فروشد

وغیرہ وغیرہ۔

لیکن یہ رنگ ابن مین کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے اس وقت کے اور شاعر بھی اکثر اس رنگ کے دلدادہ تھے اسی مضمون پر سلمان ساہی کے چند شعر بھی دیکھئے

عجب آنکس کہ بدرب تو سبت موہت	مگر از بادہ سلاب توبے خراب است
سلمان ترے جام است بہت چہیں مست	تاظن نہ بری کز خم و خمی نہ خراب است
در سرز استلغ است بہت مستی	مارا کہ احتیاج شراب و سماع نیست
دل نہ پادہ روز است رنگے یانست	منوڑ بوئے ازان بادہ در شام نیست

سپاہی کا امتحان کیجئے عمدہ عطر و تیل صغریٰ علی محمد علی تاجیر عطر لکھنؤ سے خرید کیجئے

وغیرہ وغیرہ۔

مگر ارباب ذوق جانتے ہیں کہ چشمہ حافظہ کے معمولی تلخ اور بدبودار پانی میں ہے وہ کسی دوسری شراب میں نہیں ہے۔
مضمون کے اختتام پر آرگس صاحب فرماتے ہیں کہ ابن سینا اور حافظ کی یکجہائی کا زمانہ چھ سات سال سے زیادہ نہیں ٹھہرنا حافظ
ابن سینا کے سامنے یا ان کے انتقال کے بعد شیراز پھر واپس آئے ہونگے۔ چونکہ ابن سینا موجود نہ تھے اذان کو اسی زور و شور کے ساتھ شاعری
کرتی تھی اور اب غالباً کجی کافی شہرت ہو چکی تھی لہذا انھوں نے سعدی اور خواجہ اور سلمان ساوجی کے کلام کو اپنا رہبر بنایا اور اسی تنگ
میں کہنے لگے۔

سہو حال آرگس صاحب یہ مانتے پھر گزشتہ تیار نہیں کہ حافظ نے خود اپنی طبیعت سے بھی کچھ کام لیا آپ حافظ کے سارے دیوان کو اخذ
اتباع اور نقل و سرقت کا ایک مجموعہ ہی کہہ سکتے ہیں زیادہ کچھ نہیں۔ سعدی سلمان ساوجی اور خواجہ حافظ کے متعلق تو بہت لوگ
پہلے بھی لکھ چکے ہیں اور میں بھی سان انجیب میں ان کے متعلق بہت کچھ کہہ چکا ہوں۔ لہذا اسی مضمون پر اور کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے ابن سینا کا
دیوان چونکہ نایاب تھا۔ اور اس دستیابی پر آرگس صاحب نے یہ حیرت انگیز انکشاف کیا ہے اس لئے ان کے اس انکشاف پر کچھ لکھنا ضروری
معلوم ہوا۔

(نوٹ) میں یہ مضمون لکھنے لگا تھا کہ میرے ایک فاضل سخن شناس اور ادبیات فارسی سے گہری دلچسپی رکھنے والے دوست (ام
عبدالمطین خاں صاحب سب نج ایسٹ آباد) نے فرمایا کہ میں نے ایک نسخہ دیوان ابن سینا کا پشاور میں ایک دوست کے پاس دیکھا ہے
چنانچہ انھوں نے میری درخواست پر وہ نسخہ منگوایا۔ جو آج میرے پاس ہے۔ دیوان ابن سینا کے متعلق بغیر اسے دیکھنے کے جو رائے میں نے
ظاہر کی ہے دیوان کے مطالعہ سے اس کی پوری پوری تائید اور تصدیق ہوتی ہے۔ مضمون چونکہ پورا ہو چکا ہے اس لئے ابن سینا کے متعلق
ایک مکمل اور مفصل بیان میں کسی آئندہ فرصت پر چھوڑتا ہوں

ابن سینا کے جس شعر سے آرگس صاحب نے خواجہ صاحب اور ابن سینا کی ملاقات ثابت کی ہے اس کے متعلق میں اپنے شکوک
پہلے ہی ظاہر کر چکا ہوں میرے پاس جو نسخہ دیوان کا بھی بچا ہے اس میں یکلے لفظ حافظ کے لفظ خط لکھا ہے ظاہر ہے کہ یہ لفظ غلط ہے
لیکن اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہاں کوئی اور لفظ تھا۔ جسے کسی نے حافظ بنایا کسی نے خط اور کسی نے کچھ اور۔ کاتبوں کی تحریف ہو
جو خدا جانے بات کو کہاں سے کہاں لے گئی۔ ردیف العنیں میں نے ایک اور شعر اسی قبیل کا دیکھا ہے

بعد ازین ابن سینا از طعنہ دشمنی باک
نخل را و چون بادشاہ محترم داریم ما

آرگس صاحب نے طعنہ اغیار سے جو لادینہ نتیجے نکالے ہیں۔ اس دوسرے شعر کے دیکھنے سے ان کی حقیقت روشن ہو جاتی ہے۔

میر ولی اللہ

مراد (فسانہ)

(۱)

مراۓ سات سال کے اندر نہ صرف اپنی ساری جائیداد تلف کی بلکہ آئندہ کے پاس بھی جو کچھ تھا اسکو بھی صبا و منرا میر کی نذر کر دیا اور انکی رندی و دھوسنا کی بدستور قائم رہی۔ "مے و معشوق" نے اس کو یہاں تک رسوا کیا کہ آخر کار وہ اپنے عمتا زعمہ سے برطرف کر دیا گیا اسے بھی اس کے حوالے بجا نہ ہوئے اور ہوتے کیسے؟ مراد اتفاقات زمانہ کے ہاتھوں کچھ ایسا مٹ چکا تھا کہ اب اس میں غیرت و خودداری کا احساس بھی باقی نہ تھا۔ دنیا و مافیہا کے ساتھ ساتھ وہ روز بروز اپنی ذات کو بھولتا چلا جاتا تھا۔ ہاں اگر کبھی کبھی کوئی خیال اس کے دل میں خلش پیدا کر دیتا تھا تو وہ نہ تھا کہ اپنے ساتھ اپنی بیوی کی زندگی بھی غارت کر رہا ہے۔ بعض اوقات تو خیال اسپر اس طرح قابو پالیتا تھا کہ وہ پہروں رویا کرتا تھا۔ اسوقت شراب و کباب یا رقص و سرور بھی اس کی تلخیوں کے احساس کو دور نہ کر سکتے تھے اور وہ اپنے کرب و غم پر اب سے بے بس ہو کر زندگی کا خاتمہ کر لینا چاہتا تھا۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مراد کی طبیعت میں فطران جو لطیف عناصر موجود تھے وہ کبھی کبھی اسکو ابھار کر سطح عام سے بلند کر دیتے تھے۔

مراۓ فیض آباد کے ایک سربراہ آوردہ خاندان کا لڑکا تھا۔ اس کی تعلیم و تربیت بڑے بڑے اربانوں سے ہوئی تھی۔ جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ اس کو مغربی اور اخلاقی حیثیت سے بھی پختہ مغرب بنا دیا گیا تھا اور اس کی طبیعت قدیم و جدید کے اختلاط کی بہترین مثال تھی۔ باوجود اس کے کہ وہ اپنے ملن باپ کا اکھوتا لڑکا تھا اس میں ان کمزوریوں کا شائبہ بھی نہ تھا جو عموماً بڑھے ہوئے لاڈ پیار کا نتیجہ ہوا کرتی ہیں۔ دور نزدیک مراد محسن سیرت کے لحاظ سے ایک قابل تقلید نمونہ سمجھا جاتا تھا۔ مختصر یہ کہ وہ ایک ہونہار لڑکا تھا اور گھر والوں کی بڑی بڑی امیدیں اُس سے وابستہ تھیں۔ ہر شخص کو یقین تھا کہ اس کے ہاتھوں اس کے خاندانی اقبال کا ستارہ اور بھی چمک اٹھے گا۔

باجرہ مراد کی پھوپھی کی لڑکی تھی۔ وہ اس کا بچپن سے دلدادہ تھا۔ ہاجرہ اور مراۓ نے ایک ہی گھر میں پرورش پائی تھی۔ مذاق کی گیرنگی اور طبیعت کی ہم آہنگی نے دونوں کو ایک دوسرے کا گرویدہ بنا دیا اور گرویدگی آہستہ آہستہ اس حد تک پہنچ گئی جہاں سے ہٹنا محال نہیں تو شواہد ضرور ہوتا ہے اب نہ ہاجرہ مراد کو بھول سکتی تھی نہ مراد ہاجرہ کو۔ دونوں کی وابستگی کا یہ انداز دیکھ کر ہٹا ندانی میں یہ طے پا چکا تھا کہ آگے چل کر وہ ایک دوسرے کے رفیق زندگی بنائے جائیں گے۔ مراد اس طرف سے مطمئن ہو گیا تھا۔ چنانچہ جب انٹرنس کے بعد اسکو

اگر آپ عمدہ عمل کے طالب ہیں تو ایک مرتبہ صفر علی محمد علی تاجر عطر کھنوسو بھائی

لکھنؤ جانا پڑا تو اس کا سرمایہ تسکین صرف یہ خیال تھا کہ ہاجرہ بہت جلد اس کا ایک اپنا گھر بسا یوالی ہے۔ ہاجرہ بھی اسکو اپنا سرتاج مان چکی تھی اور بے صبری کے ساتھ اس دن کا انتظار کر رہی تھی جب اس کے اور مراد کے درمیان کوئی حد قاصل نہ ہوگی بلکہ نوے بی اے کرنے کے بعد مراد آئی۔ سی۔ ایس کرنے کی غرض سے انگلستان بھیج دیا گیا تھا۔ اس دوران میں اس کے والد کا انتقال ہو چکا تھا بیوہ ماں کے جینے کا سہارا اب صرف یہ اُمید تھی کہ اس کا مراد فارغ التحصیل ہو کر بہت جلد لوٹنے والا ہے اور اس کے سرسہرا ہندو ہونے والا ہے۔ مراد لوٹا اور اپنی خدمت پر مامور ہو گیا۔ شادی کو تقریباً دو مہینے رہ گئے تھے سرور سامان مہیا کئے جا رہے تھے۔ ہاجرہ کے لئے مکان میں ایک نئے حصہ کا اضافہ ہو چکا تھا۔ مراد اپنی آئندہ زندگی کے نقشے درست کر رہا تھا۔ وقتاً بوقت ہاجرہ کو ایک روز شام کو شدید تپ جڑ بھی چند گھنٹوں کے بعد معلوم ہوا کہ ذات الریہ ہے۔ مراد اس وقت بارہ بجے میں تھا۔ اسکو اطلاع ملی تو ایک دفعہ تو اسکو حکر لگ گیا مگر اس نے اپنے کو سنبھالا اور دل کو یہ تسلی دیتا ہوا کہ شاید خدا اسکی معصومیت اور سزا گناہی کے صلہ میں اب بھی اسکی ہاجرہ کو بچائے۔ وہ فیض آباد چل کھڑا ہوا یہاں آکر معلوم ہوا کہ اسکی لکشمی اس کی زندگی کو معمور کرنے سے پہلے متاثر ہو چکی تھی۔ ہاجرہ سپرد خاک ہو چکی تھی۔ مراد پر آسمان ٹوٹ پڑا اور کلیجہ ختم کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں کے آگے دنیا اندھیری ہو گئی جو فضا ابھی تک صاف و شفاف تھی یکایک گرد و غبار سے اٹ گئی اور مراد کی زندگی کے اور اق پیس سے سیاہ ہونے لگی

انسان کے بننے بگڑنے کے لئے ایک اشارہ کی ضرورت ہو کر رہی ہے۔ وہ صرف چند لمحے ہوتے ہیں جو جسموں کا فیصلہ کرتے ہیں۔ پس ایک بہانہ چاہئے اور زمین آسمان اور آسمان زمین ہو جاتا ہے۔ اس جا کا وہ واقعہ کے بعد ایک دور تو عجیب انتشار میں گزرا یعنی اسکی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے اور کس طرح اپنا جی بھلائے۔ مگر آخر کار اُس نے ”میں“ سے قنصل شروع کیا اور جن آزمائشوں سے وہ یورپ کی فضا میں بھی متاثر نہ ہوا تھا اب اپنے کو اکدم ان کے حوالہ کر دیا۔ اس سے واقعی وہ اپنے درد کے احساس کو بھولا یا نہیں اس کا جواب خود اس کی آئندہ زندگی دیگی لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس نے اپنے دنیا کی تمام آزمائشوں کے ہنگامہ میں چھوڑ کر دنیا کے فرائض سے سبکدوشی حاصل کر لی شراب کو ”ام الحباثت“ کہا گیا ہے مراد نے اس کو منہ لگا کر گویا ہر برائی اپنے لئے جائز کر لی۔ شب در در وہ تھمیرٹا یا کسی ”نازنین“ کے پہلو میں بسر کرنے لگا لیکن تپاس سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی اس کی آنکھوں سے پردے ہٹ جاتے تھے اور وہ یہ سمجھنے لگتا تھا کہ یہ سب خود فریبی ہے ورنہ صلیت یہ ہے کہ اس کا درد بدستور قائم ہے۔“

ہاجرہ کی موت کے سال بھر بعد لوگوں نے تحریک شروع کی کہ مراد شادی کر لے مراد کو بھی خیال ہوا کہ شاید اس طرح وہ اپنی عمر دی کو بھول جائے اور ایک عورت کے ہاتھوں ممکن ہے اس کی نجات ہو جائے۔ چنانچہ بڑی جی توجہ کے بعد اس نے آئندہ کے ساتھ شادی کر لی جو بریلی کے ایک محدث اور تعلیم یافتہ خاندان کی لڑکی تھی۔

(۲)

میرے ایک دوست کا خیال ہے کہ تاہل کی زندگی بچاس فیصدی صرف اس لئے بد مزہ رہتی ہے کہ فریقین میں سے کسی نہ کسی کو پہلے سے محبت میں ناکامی ہو چکی ہے۔ میرے دوست کا یہ دعویٰ صحیح ہو یا غلط مگر یہ واقعہ کہ یہاں مراد اور آمنہ دونوں محبت کی لذتوں سے آشنا ہو چکے تھے۔ شاید آمنہ کا رشتہ دار تھا اور اس سے دو سال عمر میں چھوٹا تھا۔ بچپن سے آمنہ کی تصویر اس کے دل پر اس طرح اتر گئی تھی کہ اب ملنے نہ مل سکتی تھی جس سال آمنہ کی شادی ہوئی ہے اسی سال شاہد ایم۔ اے کر کے لاہور میں فلسفہ کا پروفیسر ہو گیا تھا۔ آمنہ کی شادی کا علم اسکو ہوا تو اس کی کیا حالت ہوئی اس کا صحیح جواب نہیں دیا جاسکتا۔ اس کے تئیں اس کے جذبات کا کوئی اظہار نہ ہوا تھا۔ وہ فلسفی اور شاعر تھا اور طبعاً خاموش اور سنجیدہ۔ وہ اپنی مایوسیوں کو قابل احترام سمجھتا تھا اور ان کو رسوا کرنا نہ چاہتا تھا۔ وہ آمنہ کی محبت کرتا تھا اور اسی کو اپنی زندگی کی سب سے بڑی نعمت سمجھتا تھا۔ اس کو اسکی بھی فکر نہ تھی کہ آمنہ ممکن ہے اپنی نئی مصروفیتوں میں اسکو بھول جائے۔ وہ خود آمنہ کو پوچھتا تھا۔ اور اس کا اسماں یہ تھا کہ اس طرح وہ اپنے نفس کی تربیت کر رہا ہے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ دنیا کی ساری کتابیں ہضم کر جانے سے اس کو وہ چیز نصیب نہیں ہوگی جو آمنہ کی محبت سے نصیب ہوئی ہے۔ بہر حال شاہد پرنسکست آرزو کا اثنا اثر ہوا اور آمنہ کو اور بھی محویت اور یکسوئی کے ساتھ چاہنے لگا۔ وہ خود مراد کے مقابلہ میں غریب تھا اسکو قوی امید تھی کہ مراد آمنہ کی زندگی کو زیادہ خوشگوار بنا سکیگا اور وہ اس خیال سے بہت خوش تھا۔

ہندوستان کی عورت صرف شوہر پرستی کے لئے بنائی گئی، ”جی بھگتی“ کا تخیل یہاں علی صورت میں پیش کیا گیا ہے دنیا کے کسی دوسرے حصہ میں اسکی نظیر نہیں مل سکتی۔ ہندوستان کی آب و ہوا بھی کچھ اس کے لئے موافق ثابت ہوئی۔ زمانہ نے گردنوں پر کر وٹیں باندھ لیں۔ انقلاب پر انقلاب ہوتے رہے۔ مگر ہندوستان عورتوں کے معاملہ میں جہاں تھا وہیں رہا۔ البتہ موجودہ صدی نے طبقہ انات میں چند ایسی ہستیاں پیدا کر دی ہیں جو ”ردایات قدیم“ کے قیود سے عورتوں کو آزاد کرنا چاہتی ہیں لیکن ان کی صدائے احتجاج ”نقدِ خمار“ میں طوطی کی آواز“ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی

آمنہ یوں تو کہنے کے لئے نئی رخصتی میں ملی تھی لیکن جی بھگتی آخر ہندوستان کی عورت۔ اس نے ایک سال کی تلیل مدت میں نہ صرف شاہد کو اپنے دل سے بھلایا بلکہ مراد کے ساتھ ایسی موانست اور بگڑتی پیدا کر لی جسپر محبت کا لگان ہوتا تھا۔ لیکن دراصل ایسے لگاؤ کو طلب درجہ سے کوئی خلق نہیں ہوتا۔ شادی کے بعد عورت کی انفرادیت عموماً فنا ہو جاتی ہے۔ آمنہ پہلے سمجھتی تھی کہ مراد کو سدا رنگی لیکن اس کی یہ امید ہم سے زیادہ نہیں ثابت ہوئی۔ اس کے ایک لڑکا بھی پیدا ہوا اور مراد کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہ ہوا۔ وہ اپنی گندی زندگی کا خوگر ہو گیا تھا جب انسان سمجھ سمجھ کر اپنے کو دھوکہ دینے لگتا ہے تو کوئی قوت اس کو روہ راست پر نہیں لاسکتی یہی حالت مراد کی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ روز بروز اس کی پرانگی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے پھر بھی اپنی بے اعتدالیوں سے منہ نہ موڑ سکتا تھا

”مردا سنی“ اس کے جیسے کاہانہ تھی ورنہ وہ اب تک خردکشی کر چکا ہوتا۔

مراد کو بہت جلد اپنی غلطی کا علم ہو گیا۔ آئندہ سے شادی کر کے وہ تازہ آفت میں گرفتار ہو گیا۔ اس کو یہ خیال سننے لگا کہ اپنے ساتھ وہ اپنی بیوی کو بھی برباد کر رہا ہے اور اس کو وہ ایسا گناہ سمجھ رہا تھا جس کا کوئی کفارہ نہیں۔ جائداد کا جو حصہ باقی رہ گیا تھا اسے اس نے آئندہ کے نام لکھ دیا تھا۔ مگر آئندہ نے رفتہ رفتہ پھر اسکو مراد کی نذر کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ میکہ سے جو کچھ لائی تھی اسے بھی حوالہ کر دیا اور اب اس کی عمر ست سے ستر ہو رہی تھی۔ شوہر کی خوشنودی کا جہاں یہ معیار ہوا وہاں محبت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ آئندہ صد پرصدے اور کوفت پر کوفت اٹھا رہی تھی مگر زبان سے افسانہ کرتی تھی۔ مراد کو خود اس کا دکھ تھا لیکن کوئی چارہ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ آئندہ کے والدین نے اکثر چاہا کہ دونوں میں جدائی کر دیں مگر آئندہ اس کی روادار نہ تھی۔

جب مراد ایک نہایت کینہ خیزم کی سزائیں اپنی ملازمت سے برخاست کر دیا گیا تو خود اس نے طے کر لیا کہ اب آئندہ کو آزاد کر دے گا اور خواہ وہ اس کی زندگی تلخ نہ کرے گا۔ اس نے رو کر آئندہ سے کہا ”دیکھو آئندہ میں نے بہت چاہا کہ تمہارے لئے اپنے کو بیٹی سے ابھاروں خود تم نے اس معاملہ میں اپنا پورا زور لگایا مگر تم کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ میری اصلاح نامکن ہے اور میرے ساتھ رہ کر تمہاری بربادی لازمی ہے میں اب اس کی تاب نہیں لاسکتا۔ سیاہ قلب ہونے کے باوجود ابھی مجھ میں اچھا برا سوچنے کی قوت باقی ہے میں اس قابل نہیں کہ تمہارے حسن اور تمہاری محبت سے اپنی زندگی کو پر کیفیت بنا سکوں۔ میں اب جانا ہوں اور کہیں اپنی شرتناک ہستی کو اس طرح چھپاتا ہوں کہ کسی کو یہ بھی علم نہ ہو گا کہ زندہ ہوں یا مر گیا۔ تم دلترا اپنے لئے دوسری دیکھ بیاں مہیا کر لو میں امید کرتا ہوں کہ تم کم کم عالم میں کوئی وقت نہ ہوگی۔ شاہد اب بھی موجود ہیں۔ اس کو بھول جاؤ کہ مجھ جیسی ناپاک ہستی سے کبھی تمہارا دامن باندھا گیا۔ پھر تم سکون و طمانیت کے سانس لے سکو گی۔ میں جس گرداب میں بہ رہا ہوں جتنے دور اس زندگی میں میری نجات ہونیوالی نہیں خواہ وہ کوفت نہ اٹھاؤ میں نے اس سے پہلے بھی بار بار یہی چاہا تھا لیکن اس خیال سے کچھ کرنے کا کہ تم کو ملال ہو گا۔“

مراد اس کے بعد بڑی دیر تک روتا رہا۔ آئندہ بھی اس کے جسم سے لگی ہوئی رو رہی تھی۔ آج اس کو اپنا غبار بھانسنے کے لئے کافی موقع مل گیا تھا۔ مراد نے شاہد کا نام لیکر اس کی رگوں میں لٹکا سا ہچاں پیدا کر دیا تھا اور اب اس کے جذبات مخلوط تھے۔

آئندہ نے خوشامدیں کیں۔ ہاتھ جوڑے قمیصیں دلائیں۔ مراد نے ایک نہ سنی اس کا دل تجھڑکا ہو گیا تھا وہ اسی میں آئندہ کی ہوسود سمجھتا تھا کہ اس کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دے۔ اس کے پاس اب بھی کچھ روپے موجود تھے اس میں سے نصف آئندہ کے نام بینک میں جمع کر کے اور نصف اپنے گزراؤات کے لئے لیکر بمبئی چلا گیا اور ایک مختصر سا مکان لیکر رہنے لگا۔ اب وہ ایسا محسوس کر رہا تھا کہ اس کے سر سے ایک بھاری بوجھ اتر گیا ہے اس کے بعد اس نے پھر کبھی آئندہ کی صورت نہیں دیکھی۔ اس نے بمبئی میں ایک بیٹھ کے وہاں ڈیڑھ سو ماہوار کی نوکری بھی کر لی تھی جس سے وہ اپنی رکیک خواہشوں کو پورا کرنے کے لئے کافی سامان ہم پہنچا سکتا تھا۔

(۳)

کچھ دنوں بعد آمنہ کو اس کے میکہ والوں نے بلایا۔ اب ان کو فکر تھی کہ کسی طرح مراد کو عبور کیا جائے آمنہ کو طلاق دلو اور پھر شاہد کے ساتھ شادی کر دیں۔ چنانچہ مراد کا پتہ لگایا گیا اور اسکو اس کی بابت لکھا گیا۔ اس نے مختصر جواب میں لکھ دیا کہ بہت جلد اس کا انتظام کر دینگا۔ اور خاموش ہو رہا۔

اب آمنہ کی دلچسپی کا اگر کوئی ساماں تھا تو اس کا لڑکا تھا جس کی عمر تین سال کی تھی۔ اس کی انتہا سرت اسی بچہ کی دیکھ بھال تھی۔ آمنہ اپنے کو اس قابل بھی نہ پاتی تھی کہ شاہد سے کسی قسم کی امید لگائے۔ اس کا وہ اپنے کو حقدار نہیں سمجھتی تھی۔ وہ اب بھی اسی کو غنیمت سمجھتی تھی کہ مراد اس کے پاس واپس آئے اور اپنی روش کو بدل کر سکون کے ساتھ زندگی کے باقی دن گزار دے اس نے مراد کو خط پر خطر روانہ کئے لیکن مراد نے کسی کا جواب نہ دیا۔ آمنہ ہر طرح سے مایوس ہو گئی۔ جب وہ گھر میں شاہد کا ذکر سنتی تو اس کو بڑا صدمہ پہنچتا اور وہ اٹھکھریچلی جاتی تھی۔ شاہد کے نام سے وہ گھبرانے لگتی تھی۔

قیمت کی قسم ظریفی دیکھئے جس آزمائش سے آمنہ ایک بچہ چاہتی تھی اسی کا عبور آسان کرنا پڑا جس پر آخر میں سارا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا۔ اس کا بچہ بیمار پڑا اور حالت خطرناک ہونے لگی۔ آمنہ کی آخری سرت بھی اس سے چھین رہی تھی اس کو ہر چار طرف مصیبت ہی مصیبت نظر آرہی تھی۔ اور اب اس کو یقین ہو گیا تھا کہ جینا اس کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا ایسے وقت میں شاہد غیر اختیاری طور پر جو کام کر گیا اس نے آمنہ کو اور بھی متفکر کر دیا۔

شاہد گرمیوں کی چھٹیوں میں بریلی آیا ہوا تھا۔ آمنہ کی حسرتناک زندگی کا علم اس کو پہلے سے تھا اور وہ اندر ہی اندر اس فکر میں گھل رہا تھا۔ گرمیاں آکر اس کو جو دھکا لگا اس کا اسے کبھی گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ آمنہ اب وہ آمنہ نہ تھی۔ وہ بھول سا چہرہ اب سوکھ کر بالکل بے رنگ ہو گیا تھا۔ جو آمنہ کبھی بغیر سکر ائے ہوئے بات نہ کرتی تھی اب بہروں گزر جاتے تھے چپ چاپ بیٹھی رہتی۔ اور سکرانا تو گویا اس نے کبھی سیکھا ہی نہ تھا۔ جو آنکھیں صرف حکومت کے لئے بنائی گئی تھیں اب جرم و ملطف کی طالب معلوم ہوتی تھیں یہ سب کچھ تھا لیکن شاہد نے ایک نامعلوم ادا اب بھی اس میں ایسی پائی جو اس سے خراج پرستش وصول کرنے کے لئے کافی تھی وہ آمنہ کو اب بھی ستردا ماننے پر مجبور تھا۔

آمنہ کو شمش کر کے شاہد سے پہلو بچا رہی تھی اور شاہد بھی اس کا اشارہ سمجھ گیا تھا چنانچہ وہ خود آمنہ سے الگ الگ رہتا تھا آمنہ کے ماں باپ البتہ یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح شاہد سے آمنہ ہل جائے اور اپنی کلفتوں کی یاد دل سے مٹا دے۔ لیکن نہ آمنہ کا موقع دیتی تھی نہ شاہد کوئی تحریک کرتا تھا اسی طرح پندرہ بیس دن گزرے ہوں گے کہ دفعتاً آمنہ کا لڑکا بیمار ہوا اور یہ دھوکہ کا حجاب ہٹ گیا۔

شاید آمنہ کی سراسیمگی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ اُس نے بلا آپس کی گزشتہ زندگی کی طرف کوئی اشارہ کئے ہوئے بچہ کی تیار داری کرنی شروع کی۔ اُس نے دل کو دن اور رات کو رات نہ سمجھا اور ایک دھن کے ساتھ بچہ کی خدمت لگا رہا۔ آمنہ کا خدا سیدھا تھا۔ اس کا ظفر بائیسویں روز اچھا ہو گیا اور اب آمنہ کو سوچنے کا موقع ملا۔

شاید کے طرز عمل کا جواب اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ نہ تو وہ اسکو احسان سمجھنا چاہتی تھی نہ محبت۔ شاید نے پھر محکم شروع کر دیا تھا اور آمنہ اب اس سے کچھ گفتگو کر کے اپنی طبیعت کا جو جھہلکا کرنا چاہتی تھی۔ ایک دن دونوں تنہائی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ شاید سگریٹ پیتا جاتا تھا اور اخبار پڑھتا جاتا تھا۔ آمنہ پر اسکی اس ادا نے گہرا نقش کیا۔ اُس نے تھوڑی دیر غور کیا پھر ایک عجیب اندھناک لہجہ میں شاید کو مخاطب کر کے پوچھا

”کیوں نہ شاید کام چھپے کچھ کشیدہ ہو؟“

”شاید کو یہ سوال ناگوار گزارا مگر اُس کی آواز اسوقت ایسی دکھ بھری تھی کہ اُسکا دل تڑپ گیا اور اُس نے پوچھا ”کیوں؟ تم کو یہ خیال کیوں آیا؟“ کچھ نہیں۔ یہ تو تمھاری ہر وقت کی خاموشی سے مجھے لگان ہوا کہ شاید مجھ سے کچھ لکھ رہو؟“ آمنہ نے جواب دیا اور کسی سوچ میں پڑ گئی۔ شاید نے اخبار کو رکھ دیا اور آمنہ کو غور سے دیکھنے لگا۔ وہ منتظر تھا کہ آمنہ ابھی کچھ اور کہیں گے مگر آمنہ کی گویائی اب کام نہیں دیتی تھی۔ وہ آنکھیں جھپکاتے ہوئے اسی طرح سوچتی رہی آخر کار شاید نے کہا ”سنو آمنہ معلوم ہوتا ہے کہ تم کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو میں جو اب تک تم کو کھل کر نہیں ملا اُس کی وجہ یہی تھی کہ تم خود مجھ سے بچتی رہی ہو۔ تمھاری حالت اسوقت ایسی ہے کہ خفیف سے خفیف بہانہ تمھارے دل کو اور بھی مجروح کر سکتا ہے اس لئے میں بھی تم سے گریز کرتا رہا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ آج تک تم سے کبھی غافل رہا ہوں اور نہ ہو سکتا ہوں تمھاری محبت میرے لئے نئی کیفیتوں کا باعث رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ مجھے اس کا بھی ملال نہیں کہ تمھاری شادی دوسرے کے ساتھ ہو گئی ہے۔ ہاں تمھاری المتاک زندگی پر البتہ میرا بال بال روتا ہے“ شاید اتنا لکھ کر چپ ہو رہا۔ اب اس کی رگوں میں ایک شورش نمودار ہو چلی تھی۔

آمنہ سے ضبط نہ ہو سکا اور اپنے جہرے کو ہاتھوں سے چھپا کر دارزار رونے لگی۔ جب خوب جی کھول کر رو چکی تو شاید کے پہلو میں کرسی کیپکچر کئے لگی۔ وہاں شاید میں جانتی تھی کہ تم دھن کے پکے ہو تمھاری طبیعت کا رنگ ہمیشہ سے بختہ تھا۔ تم مجھ میں بھونے یہ میرے لئے مرثیے کی بات ہے۔ لیکن دیکھئے ہو خود زمانہ مجھے مٹا رہا ہے میں بھی تم کو چاہتی تھی اور مجھے شادی بے انتہا گراں گزر رہی تھی جب اپنا بس نہ چلا اور مراد کے ساتھ میرا کاح ہو گیا تو میں نے اپنے مقدر سے موافقت پیدا کرنی اور تم کو بھولنے کی کوشش کرنے لگی اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہوئی یا نہیں؟ اس کا جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ صرف کوشش کر کے تمھاری گتہ گتہ ہو چکی اور اب مجھے اس کا کوئی حق نہیں کہ تم سے محبت کی امید کروں بلکہ اب تو مجھے اس خیال سے تکلیف ہوتی ہے کہ تم اب تک مجھے اسی طرح

(۴)

مراد بمبئی پہنچ کر اور بھی بے لگام ہو گیا تھا شراب اور عورت کے سوا اسکو معلوم بھی نہ تھا کہ دنیا میں کوئی اور چیز بھی ہے۔ وہ سستی اور بے جودی کے عالم میں اپنے دن کاٹ دینا چاہتا تھا۔ اس لئے کہ وہ اپنی اس زندگی سے بیزار تھا اور ناکامی کے رنج فرسا احساس کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ دن رات کی شراب نے اس کی صورت کو مسخ کر دیا تھا۔ اس کو اسکی فکر نہ تھی۔ اس کو ہوش بھی نہ تھا کہ صبح کب ہوتی ہو اور شام کب۔ اسی عالم بے حسی میں اس کو آئینہ کے والدین کی تحریر ملی حسین آئینہ کے لئے اس سے طلاق مانگا کیا تھا وہ سمجھتا تھا کہ وہ سب کچھ ملے کر چکا ہے اور اس کو اک گونہ کیسوی تھی لیکن اب معلوم ہوا کہ جب تک وہ آئینہ کو بھی اپنے ساتھ نہ لے کر ہم پر لا کر ذلیل و رسوا نہ کر دینا دے چین نہ لین گے اس کی بے چینیوں کا دورہ پھر شروع ہوا اور اس کی عقل کام نہ دیتی تھی کہ کیا کرے۔ اس کی تندرستی روز بروز سرعت کے ساتھ خراب ہو رہی تھی اور اپنی وہ موت کا بے صبری کے ساتھ انتظار کر رہا تھا۔ مگر جس بات کا کوئی وقت متعین نہ ہو اس کا انتظار ہی کیا۔ مراد نے بریلی لکھنے کو تو لکھ دیا کہ میں انتظار کر رہا ہوں کہ آئینہ کو توفان آزاد کر دوں۔ لیکن دراصل کوئی فیصلہ نہ کر سکا تھا مراد اسی اُدھیڑ بن میں بڑا تھا کہ شاہد پنچا مراد کی خلش اور بڑھ گئی جبوقت شاہد مکان میں داخل ہوا۔ مراد نشہ میں چور پڑا تھا اور مینا ہارمونیم پر کچھ لگا کر اس کو سنا رہی تھی۔ بمبئی میں مراد نے کئی عورتوں سے مراسم پیدا کئے اور چھوڑ دے تھے۔ اب اسکو مینا کے ساتھ انہماک تھا جو ایک مشہور ٹیکسٹریں ایکٹرس تھی اور گانے کی ماہر تھی اس کی آواز میں ایسا لوج تھا جس نے سارے شہر کو مبہوت کر رکھا تھا۔ نہ جانے کتنے کڑاؤں بتی اس کے "آستان ناز" پر زین بوس ہونے کے آرزو مند تھے لیکن مینا کے استغنا اور انداز بے نیاز نے انکی آرزوؤں کو دل ہی دل میں پامال کر دیا۔ ہاں اگر وہ خود کسی کی تمنائی تھی تو مراد کی۔ مراد تو اول اول یہ سمجھا تھا کہ اس سے بھی چدرہ ربط رہیگا لیکن وہ اب تک اس سے تعلق قطع نہ کر سکا تھا اور بظاہر مینا کے ساتھ اسکی مصروفیت دیر پا اور مستقل معلوم ہوتی تھی۔

شاہد کو یہ دیکھ کر مراد کسی قدر گھبرایا مگر پھر اپنے کو سنبھال کر اٹھا اور آگے بڑھ کر تپاک کے ساتھ بھگلیں ہوا شاہد نے ایک ہی نگاہ میں جان لیا کہ زندگی اس کے لئے ایک عذاب ہو کر رہ گئی ہے جبکہ وہ زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کر سکیگا اس کا محبوب چہرہ اس بات کا گواہ تھا کہ وہ اپنے کو صرف دھوکہ دے رہا ہے درحقیقت وہ دنیا کی کسی چیز سے لطف حاصل کرنے کی صلاحیت بھی کھو چکا، مراد نے کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کیں۔ پھر مینا کی طرف اشارہ کر کے کہا "شاہد میں ان کا تعارف کرانا چاہتا ہوں یہ بمبئی کی ایک مشہور ایکٹرس ہیں ادگ گانے میں شاید سرسوتی یا آرفیوس ان کا مقابلہ کر کے تو کر سکے۔ آج کل میرے جینے کا بھانہ صرف ان کی ذات ہے اس سے زیادہ تم خود تھوڑی دیر میں معلوم کر لو گے" یہ کہہ کر اس نے مینا سے کچھ گانے کی فرمائش کی۔

مینا نے نہایت متانت کے ساتھ اپنی سفید ریشمی ساری کا آئینل برابر کر کے گانا شروع کیا۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عالم بالا کھینچ کر اس دنیا کی طرف جلا آ رہا ہے۔ سارا کرہ ایک ایسی نئی فضا سے معمور ہو گیا تھا جو اس دنیا کی چیز نہ تھی۔ خود شاہد اپنی رگوں میں ایک

لہر محسوس کر رہا تھا۔

جاڑے کی رات تھی۔ ۹ بجے تھے۔ شاہد اپنا پیغام سنانے کے لئے بے صبر ہو رہا تھا لیکن اس رات کو وہ مراد سے کوئی کام کی بات نہ کر سکا۔ مراد نے اس کے دیکھتے دیکھتے ”گاگ نینگ“ کے ساتھ گلاس خانی کر دئے تھے اور اب وہ بات کرنے کی تاب نہیں رکھتا تھا۔ کچھ دیر تک اس نے مذہبی اور اخلاقی حیثیت سے انسان کے اعمال پر اور ان کے مکانات پر ایک لمبی چوڑی تقریر کی۔ درمیاں میں اپنی بدکرداریوں پر کئی بار رو دیا بھی۔ آخر کار جب اتنی تاب بھی نہ رہی تو لڑکھڑاتا ہوا آرام کر سی سے اٹھا اور بلا کچھ کہے جا کر پلنگ پر بے حس و حرکت لیٹ گیا۔ مینا نے مراد پر ایک حسرتانگ نگاہ ڈال کر شاہد سے کہا ”مجھے بڑی فکر رہتی ہے کہ آخر اس کا انجام کیا ہونے والا ہے؟ میں اپنی تمام قوت اس کوشش میں صرف کر چکی ہوں کہ انہی یہ گری ہوئی حالت سنھل جائے۔ مگر یہ خود زندگی سے کچھ ایسا بیزار معلوم ہوتے ہیں کہ کسی کی کوئی تدبیر نہیں چل پاتی۔ مجھے نہ جانے ان کے ساتھ کیوں محبت ہو گئی ہے حالانکہ یہ محبت کی چیز نہ تھے۔ مجھے ان کا بڑا دکھ ہے۔“

مینا کے ایک لفظ سے بے خلوص آ رہی ہے جس کی اس تماش کی عورتوں سے توقع نہیں کی جاسکتی۔ شاہد نے ایک ٹھنڈی سانس لیکر کہا اپنی سچی ناکام کا آپ ہی کو غم نہیں ہے اس سے پیشتر وہ ہستی ان کو سیدھی راہ دکھانے کی کوشش میں ایسی اٹھا چکی ہے جس کو انہی صلاح کا دعویٰ کرنے کا واقعی حق تھا مگر اب خدا ہی ان پر رحم کرے“ اس کے بعد مینا شاہد کو کھانا کھلانے لگی۔

رات بھر شاہد نے خیالات کے تلاطم میں گمراہی۔ اس کو مراد کی حالت پر ترس آ رہا تھا۔ اور آمنہ کی خستہ حالی پر تو اس کا دل ہی خون ہو رہا تھا۔ اور اسپرستزاد اس کے اپنے جذبات جو آمنہ سے تعلق رکھتے تھے غرض کہ شاہد کی رات عجیب خلغفار میں گئی۔ صبح ہوتے ہوئے شاہد کی آنکھ لگ گئی تھی۔ ایک گھنٹہ بھی نہ ہوا تھا کہ کسی کے قدموں کے چاپ سے اسکی نیند اچٹ گئی۔ مراد نے شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ”شاہد مجھے معاف کرنا۔ میری رات کی حالت نے شاید تمھیں بے کیف کر دیا ہو لیکن میری گزشتہ نو سو سال کی زندگی پر غور کرتے ہوئے مجھ کو سیارہ کو معاف کر دو۔ میں نے اس وقت تمھارے آرام میں خلل ڈالا ہے۔ مگر وہ اس لئے کہ تم سے پھر مینائی میں اطمینان سے گھٹو کرنے کا موقع نہیں ملیگا۔ ایک گھنٹہ ڈیرٹھ گھنٹہ میں مینا ناشتہ وغیرہ تیار کر کے ہماری صحبت میں شریکیں جاگتی اور اس کے بعد میں سر کھپانے دفتر چلا جاؤں گا۔ اور شام کو پھر وہی پروگرام رہیگا جو کل تم دیکھ چکے ہو اس لئے ابھی جو کچھ باتیں کرنا ہو کرلو پہلے یہ بتاؤ تمھارا یہاں آنا کس غرض سے ہوا؟“ یہ کہہ کر اس نے شاہد کو ایسی مترحم نگاہ سے دیکھا کہ گویا خوب جانتا تھا کہ اس کے آئینے کی تقریب کیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں خمار شب کے آثار باقی تھے اور وہ صورت سے مجبوظ معلوم ہوتا تھا۔

شاہد نے متین اور سنجیدہ تیوروں سے چند منٹ تک دیکھا اور مراد کے دل کی گہرائیوں کا جائزہ لیکر آمنہ کا پیغام اس کی زبان میں سنا دیا اور پھر اسکی زار و زبوں حالت کا نقشہ کھینچ کر کہا ”اگر تم اس کی بہتری کے لئے کچھ کر سکتے ہو تو کرو“ شاہد مطلب سمجھ کر کسی قدر خشک تھا۔

مراد کو بھولی ہوئی المناکیاں یاد آگئیں۔ اس نے چند منٹ محویت کے عالم میں گزارے۔ پھر شاہد سے کہنے لگا "میں جانتا تھا کہ تم اسی لئے آئے ہو۔ مگر صرف ایک امید موہوم تھی کہ شاید تمھاری کوئی اپنی غرض تم کو لے آئی ہو۔ یعنی میں فیصلہ کن لمحہ سے بچنا چاہتا تھا۔ غیر انسان اپنی زندگی میں دیئے واقعات سے بھاگ کر کہاں جاسکتا ہے مگر خدا کے لئے جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں کو غور سے سنو اور انصاف سے بتاؤ کہ میں کیا کروں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے ایک بہت بڑی غلطی کی یعنی آئمنہ کے ساتھ شادی کر لی مجھے اُمید تھی کہ میں ایک خوبصورت اور خوش سلیقہ بیوی کے ہاتھوں بن سکتا ہوں اس میں بڑا دھوکا ہوا۔ لیکن جب اس غلطی کو درست کیا جاسکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ خواہ مخواہ نباہتا رہوں۔ مجھے کامل یقین ہے کہ آئمنہ کی زندگی خوشگوار بن سکتی ہے۔۔۔۔۔"

"تم پھر دھوکہ میں ہو، شاہد نے جات کاٹ کر کہا "اسکی بگڑی ہوئی حالت کا تم کو کوئی اندازہ نہیں۔ وہ خود اپنی زندگی کو بنانا نہیں چاہتی۔ وہ تمھارے ساتھ گلی گلی سرگرداں پھر مٹنے کے لئے طیار ہے۔ وہ حقیقی معنوں میں تمھاری "شریک زندگی" بننا چاہتی ہے اسپر ترس کھاؤ اور واپس چکر صورت حال کو بدلنے کی ایک دفعہ پھر کوشش کرو"

"ٹھہرو" مراد نے جواب دیا میری پوری بات سن لو پھر اپنی کہنا۔ آئمنہ ایک فرض شناس عورت مزدور ہے لیکن ایسی حالت میں میرے ساتھ اس کے فرائض کیا ہو سکتے ہیں جبکہ میں خود اپنے واقعات سے بہلوتی کر رہا ہوں۔ آئمنہ کی میدنی اور سیزاری کی سبب بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کا کُل ہاتھ بکڑنے والا نہیں ہے۔ اس کو سہارے کی ضرورت ہے اور شاہد کہنے کی اجازت دو میری امیدیں تم سے ہیں۔ تم ایسے بُرے وقت میں اس کے کام آؤ وہ گرنا چاہتی ہے۔ اسے گریسنے نہ دو۔ سنبھالو" مراد جس بات کا کہنا سب سے زیادہ دشوار سمجھ رہا تھا اسے نہایت کامیابی کے ساتھ کہہ گیا۔ شاہد گھبرا گیا اس کے چہرے پر رنگ آنے لگا۔ گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں مراد نے سلسلہ پھر شروع کیا میں نے جو کچھ کہا وہ بغیر سوچے سمجھے نہیں کہا ہے۔ میں اگر انسان ہوں تو تم فرشتہ در نہ تم انسان ہو اور میں ذلیل ترین کیڑا میں ہرگز آئمنہ کی جان نثار یوں کا مستحق نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تم اس کی محبت بھین سے کرتے رہے ہو میں نے خواہ مخواہ تم کو اس سے محروم کر دیا تھا۔ جاؤ اس کا دل ہاتھ میں لو۔ وہ تم سے بہل جائیگی اور اپنی اگلی مصیبتوں کو بھول جائیگی وہ بھی نگو دل و جان سے چاہتی رہی ہے۔ جب وہ بیاہ کر آئی ہے تو مدتوں خواب میں تم کو یاد کرتی رہی ہے۔ وہ تم سے معافی مانگا کرتی تھی۔ شاہد یہ نہ سمجھنا کہ مجھے رشک و رقابت کا احساس ہوتا تھا مجھے نہ اس کا کوئی حق تھا نہ کوئی وجہ بلکہ عکس مجھے اس خیال سے اطمینان ہوا کہ آئمنہ بھی کسی کو چاہتی ہے جس کی سپردگی میں اس کو دیا جاسکتا ہے۔ اب کوئی وجہ نہیں کہ تم آئمنہ کے ذمہ دار بنو۔ مختصر یہ کہ مجھ سے یہ کار سے باز گشت کی اُمید نہ رکھو" مراد کا دم بھولنے لگا تھا اس کی مخمور آنکھوں میں ہجائ تھا اور اب وہ چپ تھا شاہد دنگ تھا۔ اس کو خیال بھی نہ ہو سکتا تھا کہ مراد ایسے جذبات کے اظہار کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کو حیرت ہو رہی تھی کہ مراد ایسی آلودگیوں میں ایسے لطیف خیالات کہاں سے پیدا کر سکا۔ شاہد کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب کیلئے۔

آخر کار اس نے سوال کیا کہ کیوں مراد تم اس طرح پامال و خاک بستر ہو کر اپنے کو کیوں خراب کر رہے ہو؟ کیا اب یہ ناممکن ہے کہ اس دُش سے باز آؤ اور زندگی کا ایک نیا دور شروع کرو؟

مراد کا دل اس سوال سے تڑپ گیا اور اس نے کہا ”بجائے اس کے کہ تم کو کوئی جواب دوں میں اپنی اب تک کی زندگی پر ایک تبصرہ کرنا چاہتا ہوں۔ ہر خند کہ یہ میرے لئے ایک بڑی آزمائش کا کام ہے یہ بے پے حجرات نے بتا دیا ہے کہ دنیا میں میرے لئے کوئی دلچسپی نہیں زندگی میرے لئے ایک قید ہے زنجیر ہے کہنے کو یوں تو نصرت نے مجھے خراب کیا۔ میری افتادگیوں کی بانی ہاجرہ کی موت ہوئی مگر یقیناً انویں سیاہ دل اب اس قابل نہیں رہا کہ محبت جیسی لطیفہ چیز یا ہاجرہ جیسی پاک ہستی کو اپنے سے منسوب کر دوں۔ محبت اور اس کی کیفیتوں کا تصور بھی اب باقی نہیں رہا۔“

اس کا بھی توبہ پتہ نہیں ہے لائے تھے یہاں دل حزین ہم

اب میں یہ کہنے کا حق تو رکھتا ہوں کہ ہاجرہ کی یاد میں اپنے کو فنا کر رہا ہوں تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ میرے میں مجھے کوئی لذت نہیں ملتی۔ میں نے ہر ممکن ذریعہ آزما لیا لیکن میری طبیعت بے تسلی آج کل لوگ سمجھتے ہیں کہ مجھے کچھ ساتھ عشق ہو گیا ہے۔ لیکن اس عشق کا بستر علم بھی کو ہے میں اس کے ساتھ وقت ضائع کر دینا چاہتا ہوں اور بس۔ البتہ مینا کو مجھ سے شدید محبت ہو گئی ہے جس کا مجھے افسوس ہے۔ مگر دیکھئے وہ بھی مجھے گمراہیوں سے نہیں بچا سکتی۔ محبت کی قدر کرنے کی اہلیت مجھ سے چھن گئی ہے بحث کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتا۔ ”عوش نشین“ بھی اگر اتر کر آئے تو سیری اصلاح نہیں ہو سکتی اس حالت میں جو کوئی مجھ سے تعلق کرے گا وہ بھی تباہ ہو جائیگا چنانچہ مینا کا مستقبل مجھے اندوہناک نظر آ رہا ہے۔ لیکن اس کو بچاؤں تو کیسے بچاؤں۔ فی الحال اس سے کنارہ کش نہیں ہو سکتا اس لئے شاہد تم جا کر آمنہ کے دل کو دوسری طرف متوجہ کر دو۔ میں اس کی بیہودہ کوششیں نہیں کر سکتا۔ اب یہ تمہارا کام ہے ہاں بریلی سے کچھ عرصہ ہو ایک تحریر آئی تھی کہ میں آمنہ کو طلاق نامہ لکھ کر کیلیم آزاد کر دو۔ اگرچہ میں اس کو آمنہ کی کھلی ہوئی رسوائی اور توہین سمجھتا ہوں مگر سو اس کے چارہ کار ہی کیا ہے۔ تم جاؤ میں جلد سے جلد اس کا انتظام کرتا ہوں۔ بس اب اس معاملہ میں مزید بحث کی گنجائش نہیں۔ آمنہ اور ظفر کے ساتھ میری بہترین دعائیں ہیں ”مرا نے گفتگو کو ختم کر دیا اتنے میں مینا چاروغیرہ تیار کر کے پہنچ گئی۔“

شاہد کی پھر ہمت نہ ہوئی کہ مراد سے گھر واپس چکر آمنہ کو اپنی پناہ میں لینے کے لئے اصرار کرتا۔ مراد نے اسکی زباں بند کر دی شام کو شاہد بیبی سے ایک عجیب کشکش میں رونا ہوا۔

(۵)

شاہد کے چلے جانے کے بعد مراد کا انتشار بڑھ گیا۔ وہ سوچتا تھا کہ اور کسی قطعی فیصلہ پر نہ پہنچ پاتا تھا۔ کبھی تو آمنہ کو طلاق نامہ لکھ کر بھیجے پر

۳۲ مادہ ہو جاتا ہے اور کبھی خودکشی کر کے اپنی شرمناک زندگی کا خاتمہ کر لینے کی ٹھان لیتا تھا ایک ہفتہ یوں ہی گزر گیا اور اس نے کچھ نہ کیا آخر کار ایک دن اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ زندگی کے پاپ سے اپنے کو آج چھڑا لینگا اور اس نیت سے اس نے ایک نہایت زوداثر اور صلب دہر مہیا بھی کر لیا رات کو حسب معمول مینا تھپیڑ میں کلام کرنے جلی گئی اور چلتے چلتے مراد سے کہہ گئی ”دیکھو خدا کے لئے شراب زیادہ نہ پینا اور دروازہ کھٹار کھٹا میں دوسرے کے قریب آؤ گی“ مراد نے اس کے جواب میں اس کا منہ اس طرح چوما جس نے مینا کو حیرت زدہ کر دیا۔ مینا نے آج اس کے بوسہ میں ایک نئی لذت محسوس کی جس کی وہ توجیہ نہ کر سکی۔ اس کا جانے کو جی نہیں چاہتا تھا مگر ملازمت سے مجبور تھی۔

مراد نے کرہ بند کر لیا اور شراب کی بوتل سامنے رکھ کر اور ایک گلاس پی کر خود بخود کہنے لگا ”خدا کا قارہ مطلق ہونا بھی انسانیت پر کتنا بڑا ظلم ہے! فطرت بھی کیسی ضدی اور خود سر ہے! انسان اس کے ہاتھ میں ایک آکر ہے جس کو وہ جس طرح چاہے رکھے یہ ظلم نہیں ہوا اور کیا ہے.....! مگر نہیں خدا یا فطرت محض ایک بہانہ ہے انسان اپنی ذمہ داریوں سے بھاگنے کے لئے اور اپنی کمزوریوں کو چھپانے کے لئے ایک شکوہ سلسلہ پیدا کر لیا ہے میری بدنصیبیوں کا ذمہ دار خدا کیسے ہو سکتا ہے؟ میں اگر اپنی زندگی کو سدھار نہیں سکتا تو خودی کیوں نہیں کر لیتا۔ یہ سراسر اپنی کمزوری ہے۔ بس اب کل ہی صبح مراد کی گندی سانسوں سے پاک ہو گئی۔ آئندہ تجھے طلاق کی بھی ضرورت نہیں مراد خود آزاد ہو رہا ہے اور تجھے بھی قید سے آزاد کر رہا ہے مجھے قوی امید ہے کہ دنیا اپنی بی شمار مصروفیتوں میں تجھ کو بھلا بیگی۔ ہاجرہ میں تیرے گہکار ہوں تیری محبت کو میں نے نہ جانے کیسی کیسی غلاظتوں میں آلودہ کیا ہے مجھے تجھ سے معافی کی توقع نہیں لیکن نہیں تو معاف کر دیگی۔ تیرا دل غصہ کا گھینہ ہے البتہ مینا کی مجھے فکر ہوئی چاہئے۔ وہ جب مجھے نہ پائیگی تو اس کا کیا حال ہوگا وہ بھاری سیری سیری طبع گرویدہ ہو گئی ہے میرے بغیر اس کا جینا محال ہو جائے گا۔ مگر دنیا میں کسی کی جگہ خالی نہیں رہتی۔ مینا کا بھی کوئی نہ کوئی ٹھکانا نکل ہی آئیگا۔ میں اپنی دنیا تو اپنے ساتھ لے جاتا ہوں۔ آنیوالی دنیا اپنا انعام آپ درست کر لے گی“ یہ کہہ کر اُس نے زہر کی پڑیہ جیب سے نکال لی اور ایک گلاس شراب میں گھول کر منہ تک لیگیا اور پھر ہٹا لیا۔ اس کی قوت ارادی زائل ہو چکی تھی۔ وہ آج بھی زہر نہ کھا سکا اور کچھ دیر غور کرنے کے بعد زہر آلود شراب کو پھینک دیا۔ اسی کے ساتھ اسکی آشفتمندی پھر بڑھنے لگی۔ وہی انتشار پھر شروع ہوا۔ اس نے اس کا علاج یوں کیا کہ شراب کی پوری بوتل خالی کر دی اور جا کر لیٹ رہا۔ مینا جب واپس ہوئی تو اُس نے مراد کو سوتا پایا، اسکو بڑا اطمینان ہوا اس لئے کہ وجود کثرت شراب نوشی کے مراد کو بے خبری کی نیند بہت کم نصیب ہوتی تھی۔ مینا خود بھی کپڑے اتار کر سو رہی۔

صبح اپنی پوری آہ و تاب سے نکل آیا اور مراد سوتا رہا۔ چار کا وقت گزر گیا اور مراد سوتا رہا۔ مینا نے اُس کے آرام میں خلل ڈالنا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن جب نو بجے اور دفتر جانے کا وقت قریب آ گیا تو مینا نے مراد کو جگانا چاہا۔ مراد نے جنبش تک نہ کی مینا نے لحاف کھینچ کر الگ پھینک دیا۔ مراد پر کوئی اثر نہ ہوا۔ مینا نے غور سے دیکھا تو اُس کے چہرے کا عجیب رنگ تھا کسی بار نام لکھ

بکارا۔ مگر مراد نے حرکت بھی نہ کی۔ مینا کو تشویش ہونے لگی اتنے میں اُسکو معلوم ہوا کہ مراد سانس نہیں لے رہا ہے مینا ایک جمع مار کر اسکی چار پائی سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور فرش پر سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

ڈاکٹروں نے اُگر دیکھا تو پہلے اُن کو خیال ہوا کہ مراد نے زہر کھا لیا ہے۔ مگر لاش چھیننے کے بعد کسی قسم کے زہر کا پتہ نہ لگ سکا اور اب یہ رائے قائم کی گئی کہ موت قلب کی حرکت کے رک جانے سے واقع ہوئی۔ سبب جو کچھ بھی ہوا ہو یہ واقعہ ہے کہ مراد زندگی کی قید سے رہا ہو گیا اور مینا بے یار و مددگار ہو گئی۔

(۶)

مراد نے پہلے کہا تھا کہ آمنت کو اگر کوئی سنبھالنے والا مل جائے تو وہ سنبھال جائیگی۔ وہ سٹ اس لئے رہی تھی کہ اُس کو کوئی اُبھارنے والا نہ تھا۔ سنا ہر میسٹی سے ارادہ کر کے چلا تھا کہ جس طرح سے بھی ہو سکے گا آمنت کو بربادی سے بچائیگا۔ اُسکو بریلی آئے ہوئے ایک ہفتہ ہوا تھا۔ ابھی وہ سوچ رہی تھی کہ اُس کو مراد کی حیرتناک موت کی خبر ملی اس کے راستہ میں جو ممکن رکاوٹیں پیدا ہو سکتی تھیں انکا اندیشہ بھی مٹ گیا۔

مراد کی موت کا آمنت پر جو اثر ہوا ہو اس سے بحث نہیں اُسکو کتنا ہی بڑا صدمہ پہنچا ہو مگر اس کے اثرات دیر پا نہ تھے شاید کی محبت ایسی نہ تھی جو آمنت کو اپنا نہ بنالیتی۔ رفتہ رفتہ وہ اپنی مصیبت بھولتی گئی۔ شاید کامیابی کے ساتھ اس کے اندر ایک نئی روح بھونک رہا تھا اور آمنت میں زندگی کی علامتیں نمودار ہو رہی تھیں شاید کاسب سے بڑا انستریہ تھا کہ اُسکو آمنت کے ظفر کے ساتھ شدید محبت تھی نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ دن سچی اور کچھ دن رسمی سوگواری میں بسر کرنے کے بعد آمنت شاید کی یوی ہو گئی اور اب یہ دونوں بہترین معیار کی زندگی بسر کر رہے ہیں

مینا البتہ خراب ہو گئی۔ مراد کے مرنے کے بعد چند ماہ اس نے اسی مکان میں کائے وہ اسٹیج سے کنارہ کش ہو گئی تھی اور مراد کی ایک چیز سے اپنے دل کو تسکین دیتی تھی مگر کچھ دنوں کے بعد اس نے بمبئی چھوڑ دیا اور اب خبر نہیں کہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے خدا جانے زندہ بھی ہے یا نہیں۔

مجتوں گورکھپوری

جناب مولانا زفتحپوری یعنی جرجی زیداس کی مشہور تاریخ التمن الاسلامی کے چوتھے حصے کا ترجمہ جس میں عبد بنی امیر و بنی عباس پر پینفل سیاسی تبصرہ کیا گیا ہے۔ قیمت صرف ۴۰

تیلخ الدولتین

دیوان ولی۔ دہلی دکنی کے نام سے ہر شخص واقف ہے لیکن اس کا کلام تا اب تھا اب اس کا مجموعہ ایک دلچسپ دیباچہ اور عمدہ طباعت و کتابت کے ساتھ پروفیسر کیانی۔ ایم اے نے شائع کیا ہے قیمت صرف ۴۰ (منیجر نگار نظیر آباد کنھو سے طلب فرمائیے)

نہ ہونگا اکبر کی قوانین حکومت عملی طور پر بالکل ایسے ہی ہیں جیسا کہ تیمور کے منضبط قواعد اس نے زمین کی پیمائش کر کے اسے قسم دار قرار دیا۔ اس نے ٹیکسوں میں ترمیم کی، قسط اور گرانے کے زمانے میں جزویا مکمل معاف کر دیا، اُس نے کل حریج حاصل معاف کر دے، اُس نے ناپینے کی واسطے پیانے مقرر کر دے جن کے ذریعہ سے زمین کی مالیت اور حیثیت کا اندازہ کر لیا پھر اسپرمانگزار کی تشخیص کی تاکہ کی بنی ہوئی چیزوں پر اُس نے نصف محصول کم کر دیا جو پانچ فیصدی رہ گیا سرکاری ملازموں کے فیس کا پیچیدہ اور غیر منصفیانہ طریقہ یا تو قطعاً موقوف کر دیا یا ان کی تحدید کی رغبہ کر دی گئی ملازمین عام طور پر خزانہ شاہی سے تنخواہ پانے لگے نقشہ جات مرتب کئے گئے اور اسی لحاظ سے وہ سالہ محاصل کی تشخیص کی گئی غرض ہزاروں طریقہ سے معاملات ملکی قانونی پابندیوں سے منضبط کئے گئے۔ مختلف حاکموں اور سرداروں کے لئے جو ہدایات نافذ کی گئی تھیں ان میں سے بعض یہ ہیں :-

(نائب سلطنت) اس کو ہمیشہ رعایا کی آسودگی مد نظر رہنی چاہئے کسی کی جاں نہ لے گا جب تک کامل غور و خوض نہ کرے اور خواہ مخواہ انتہا کی تکلیف نہ دے گا۔ جو لوگ تصور سے نادم ہو کر خواستگار رہیں ہوں ان کو معاف کرنا چاہئے۔ سرکوں کو خطرات سے محفوظ رکھنا چاہئے۔ اس کو یہ اپنا فرض منصبی سمجھنا چاہئے کہ زراعت پیشہ صناعتوں کا ہمدرد ہو۔

(قاضی) بلا خیال جانب داری طبع اُسے بیدار اگر اور تہمیدہ میں تمیز کرنی چاہئے اور پھر اسی کی موافق عمل درآمد کرنا چاہئے۔ (کو توال) اس کو سچا، راست باز اور ایماندار ہونا چاہئے۔ اسے لازم ہے کہ بیکاروں کو کچھ تجارتی کام سیکھنے پر مجبور کرے، کم وزن سکوں کی عوض بیک کی کے محال سے بٹہ لینا چاہئے۔ تیز شراب کے پینے سے لوگوں کو منع کرنا چاہئے۔ اس کو اس کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ لوگ چھپکے کیا کرتے ہیں وہ کسی جوہ کو بلا اس کی دلی رغبت کے سستی نہ ہونے دے گا۔

(کلکٹر) اس کو زراعت پیشہ لوگوں کی خبر رکھنی چاہئے، اس کو کسی درمیانی شخص کی ضرورت نہ ہونی چاہئے جن کا اشتکادوں کو روپیہ پیشہ کی حاجت ہو قرض دے اور پھر مناسب میعاد کے اندر وصول کرے اسے عمدہ انتظامات پر انعام تہمیدہ کرنا چاہئے۔ اس کو یہ دیکھنا چاہئے کہ اس کا مطالبہ قرار داد سے بڑھنے نہ پائے مانگزار کی نرمی کے ساتھ وصول کرنی چاہئے۔ تکلیف دہ محاصل کا مطالبہ نہ ہونا چاہئے۔ یہ اقتباسات صرف نمونہ کے طور پر پیش کئے گئے ہیں۔ ان میں کی بعض اصل دستاویزات اب بھی موجود ہیں رہا یہ امر کہ ان پر عمل بھی ہوتا تھا یا نہیں سو اس کا یقین کرنے کے لئے کافی اسباب موجود ہیں۔ اکبر بنو تیرہ برس کا تھا کہ سریر آراہی تخت سلطنت ہوا اُس وقت سے اٹھارہ برس کی عمر تک وہ اپنے اتالیق اور وزیر عظیم ہرم خان ایک بڑے معزز شریف کے زیر تربیت رہا اسی سے اکبر نے فن جنگ کی تعلیم پائی اور روزمرہ سلطنت کے معمولی کاموں کے عیب و نہر کو دیکھتا رہا۔ اس وقت کا طرز حکومت وہی تھا جو تیمور نے وضع کیا تھا۔ یہ واقعی تیمور ہی کے اصول تھے۔ جن کی ہایوں اور بارہ ایسے دانشمند اور فیاض بادشاہوں کی بڑھاپی ہوئی شجاعت اور تربیت نے اصلاح کر دی تھی اس میں شبہ نہیں ہے کہ اکبر کے دل پر ان اصولوں پر غور و فکر کرنے سے بڑا اگر اثر پیدا ہو گیا تھا۔ اُس نے سوچا کہ اگر اس کو ہندوستان میں حکومت کرنی ہے تو لازم ہے

کہ وہ بڑے بڑے ہندو راجاؤں سے صلح رکھے اور یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ قدیم اصول حکومت زیادہ آزادانہ سے نہ برتے جاتے اسی خیال سے اکبر نے ملکی اور مذہبی آزادی چلا رکھی اور پڑانے اصول میں بہت کچھ ترمیم و تنسیخ کی۔ ممکن ہے کہ بیرخان نے اس تجویز کی تائید نہ کی ہو لیکن ہر حال یہ یقینی ہے کہ حرم نے اس کے خلاف سازش کی۔ اٹھارویں برس اکبر نے بیرخان کو اس کی باغیانہ تحریر ایک معاف کر کے اور اس کے ساتھ نہایت قیاضانہ سلوک کر کے حج کی غرض سے مکہ معظمہ بھیج دیا اور عنان سلطنت بطور خود مختار بادشاہ کے اپنے ہاتھ میں لی جس کا آغاز ۱۵۷۵ء سے ہوتا ہے۔ سنہ جلوس کے اٹھارویں سال ۱۵۷۵ء تک وہ بجا توں کے فرد کرنے یا جدید مصوبہ جات کے فتح کرنے میں مصروف رہا اور یہ سلسلہ کم و بیش اُس وقت تک جاری رہا جب تک کہ اسکے وسیع مقبوضات پر اسکی باقاعدہ حکومت نہ قائم ہو گئی یہ ابتدائی زمانہ واقعی جنگ و جدال اور فوجی کارناموں سے پہلے ہے۔

ابوالفضل ۱۵۷۵ء میں یعنی اکبر کی حکومت کے پہلے دور کے اختتام پر دربار شاہی میں بار بار ہوا۔ اس وقت تک اکبر اچھا خاصہ مسلمان تھا۔ زیارت کو جاتا اور بزرگان دین کی مزاروں پر طواف کرتا تھا۔ اس کی حکومت کا یہ دوسرا دور (۱۵۷۵ء سے ۱۵۷۷ء تک) اگرچہ لڑائیوں اور بجا توں سے خالی نہ تھا لیکن یہ زمانہ خاص کر اس لئے قابل یادگار ہے کہ اس نے صلح کے ساتھ بہت سی فتوحات حاصل کیں۔ ایرانی لاندہمبول اور ہندوؤں کے ساتھ اس کا بے تعصبانہ برتاؤ خصوصاً سلطنت کے آخری زمانہ میں اس کی طرح حکومت کا ایک بڑا اگر تھا جیسا کہ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ مذہبی ایذا رسانی اپنے مقاصد میں ناکامیاب رکھتی ہے یہ انسان کو اپنی ذاتی رائے چھپانے پر مجبور کرتی ہے اور ان میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتی۔ مذہبی معاملات سے اس کی ابتدائی بے تعصبی نے بعد میں ایک عقلی مذہب کی بنیاد قائم کی جس میں اکبر نے باطل و سیاہی جیسا کہ وہ سن بادشاہ کیا کرتے تھے خود اپنے کو بطور اوتار کے پیش کیا۔ آفتاب کو آسانی طاقت کا مظہر مان کر بادشاہ روزانہ اسکی پرستش کرتا اور لوگ بادشاہ کو زمین پر اس قوت کا قائم مقام سمجھ کر اس کی عبادت کرتے۔ ابوالفضل نے اگرچہ اس ”دین الہی“ یا ”وحدانیت“ کا جیسا کہ یہ نیا عقیدہ کہلا یا جاتا تھا حوالہ دیا ہے۔ ایک جگہ لکھتا ہے کہ:-

”انسانی تاریخ میں کوئی چیز انہماک مذہب سے زیادہ عجیب تر نہیں ہے یہ مناسب نہیں ہے کہ ایک جدید مذہب تمام قدیم ادیان کا سختی کے ساتھ بطلان کرے بلکہ موجودہ ضرورت کے مطابق ان میں رد و بدل کرنا چاہئے۔“ دین الہی نے اکبر کے زمانہ میں بہت مقبولیت حاصل اور اس کے جانشین کے عہد میں بھی کچھ دنوں جاری رہا لیکن زمانہ بادشاہ کی رفتار کیا تھ خود بخود اس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ روزانہ چار بجے یعنی علی الصبح، دوپہر، مغرب اور نصف شب کے وقت بادشاہ خدا کی عبادت کرتا تھا۔ اعتدال ربیع کے قریب سال میں ایک بار بدوی شیشہ کے ذریعہ سے آگ آسمان سے حاصل کی جاتی تھی اور اس آسانی آگ کو مناسب اشخاص کے سپردگی میں دیدیا جاتا تھا (ابوالفضل خود ان لوگوں کا سروار تھا) اور جب سال آخر ہو جاتا تھا تو پھر تازہ آگ حاصل کرتے تھے۔ بڑے بڑے زرین و سیسے لنگوں میں کافوری شمعیں رات کے وقت بادشاہ کے خیمہ میں روشن ہوتی تھیں اس کے ہر کلام میں اس قدر سختی کے ساتھ قاعدہ کی

پابندی ہوتی تھی کہ محل میں شعلوں کی تعداد میں جانبداری کیسے ساتھ اضافہ ہوتا تھا چاند رات کو آٹھ ٹھیکے روشن ہوتے تھے اور چوتھی سے دسویں تاریخ تک ہر رات میں ایک کم کر کے روشن ہوتے تھے تاکہ دسویں کو صرف ایک کافی رہے اور اسی طرح ہمیشہ چاندنی راتوں میں ہوا کرتا تھا۔ تیل اور پرانے کپڑے کی ٹھیک مقدار جو ہر فقید کے لئے دی جاتی تھی بیان کی گئی ہے۔ پھر ابو الفضل روحانی ہدایت کے متعلق لکھتا ہے کہ ”خدا نے انسان کی فطرت یہ رکھی ہے کہ وہ اپنے کام کی تعریف کرتا ہے اور دوسرے کے کاموں میں عیب نکالتا ہے، اس طرح مختلف لوگ مختلف عقیدے رکھتے ہیں اور اپنے اپنے خیالات و تاویلات میں مست رہتے ہیں“ لیکن ایک وقت آتا ہے کہ انسان پر حق کا ظہور ہو جاتا ہے جب کوئی معمولی عام آدمی علم کے اس درجہ تک پہنچ جاتا ہے تو وہ آدمیوں کے خوف سے سکوت اختیار کئے رہتا ہے اور جب یہ نور کسی بادشاہ کو عطا ہوتا ہے جیسا کہ اکبر کو عطا ہوا، اتنا وہ موقع زبان کھولنے کا ہے۔ پھر بھی شہر یار نے کچھ عرصہ تک اپنے اس اسرار پر پردہ ڈالا تاکہ بیگانوں کو اس علم نہ ہونے پاوے آخر کار اُس نے اپنی ملکوتی صفات کا اعلان کیا اور اس کی روحانی کرامات کا مختلف طور پر اظہار کیا۔ جو لوگ اسکی صحبت میں رہے ان کے علم میں ترقی ہوئی، غریب اور محتاج اس سے محبت کرنے لگے اس نے پیشینگوئیاں کیں اور امراض کا دغیبہ بھی کیا، بادشاہ موقع اور محل پر دوسرے لوگوں کو بھی ہدایت کرتا ہے اور اکثر آدمی اپنی قابلیت کے لحاظ سے اسکی عمدہ تقریروں سے محفوظ ہوتے ہیں، آگے چل کر ابو الفضل لکھتا ہے ”یہ مناسب موقع نہیں ہے کہ اُن طریقوں کی پوری تفصیل بیان کی جائے جس سے بادشاہ لوگوں کو ہدایت کرتا ہے در نہ بہت سے خوارق عادات بیاں کئے جاسکتے ہیں جو اس سے جدا رہوئے اگر میری زندگی نے کافی مہلت دی اور زمانہ نے فرصت دی تو میرا ارادہ ہے کہ میں ایک دفتر اس دیکھپ عنوان پر تصنیف کروں گا۔“

ظاہر ہے کہ میکملراج ابو الفضل اپنے اس موعودہ تصنیف کو ملتوی کرنے پر مجبور تھا اور یہ بھی عیاں ہے کہ ”دین الہی“ میں درحقیقت اصلی روحانیت نام کو نہ تھی۔ اس مذہب کی بنیاد زیادہ تر دلائل پر مبنی تھی، کوئی زبردست خرق عادت اور ظاہری علامت ایسی نہ تھی جس پر بھروسہ کیا جاتا جو خرق عادات“ اکبر کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ بہت معمولی ہے اس نے لکھا ہے عقیدہ اس چیز کا نام ہے جو سچ نہ ہو۔“ اکبر نے اپنے ہم مشرب لوگوں سے پورے طور پر ان کے عقاید کا احتساب نہیں کیا۔ وہ اس کی مرضی کے دلدادہ تھے اور اس کے کمر عادات سے علانیہ فائدہ اٹھاتے تھے اور اس کے منصفانہ اور عادلانہ حکومت میں خوشحال تھے۔ شاہی مذہب اکبر کی سرپرستی سے اس کے بعد اس کے جانشین کے عہد میں قائم رہا لیکن خود بادشاہوں نے اس پر کم توجہ کی اور جیسویٹ فرقہ کے عیسائیوں اور مسلمان ملاؤں کو اجازت دی کہ وہ ان کے روبرو مباحثہ کریں اور غریبی اعتقاد کا فیصلہ جہانی قوت پر منحصر کیا۔

ابو الفضل نے کشمیر کے ایک مندر کے لئے جو کتبہ تحریر کیا اس میں اکبر کی بے تعصبی کو نہایت خوبی کے ساتھ مختصر الفاظ میں بیان کیا ہے لکھتا ہے۔ (اس صفحہ کا نوٹ صفحہ ۷۲ میں درج ہے)

اے میرے خدائیں ہر معبد میں ان لوگوں کو دیکھتا ہوں جو تھکھوک دیکھتے ہیں اور ہر ایک زبان میں جو میں سنتا ہوں لوگ تیری حمد کرتے ہیں۔ شرک اور اسلام دونوں تیرے ہی جستجو میں ہیں ہر مذہب ہی کتاب ہے کہ تو واحد ہے اور بے ہمتا ہے۔ مسجد میں تیری ہی نماز پڑھی جاتی ہے اور عیسائی کلیسہ میں تیری ہی محبت میں گھنٹے بجاتے ہیں۔

کبھی میں کلیسا میں جا نکلتا ہوں کبھی مسجد میں جا کھڑا ہوتا ہوں مگر جہاں جاتا ہوں تیرے ہی تلاش میں ایک معبد سے دوسرے معبد میں جاتا ہوں۔ تیرے مقبول بندوں کو نہ مذہب سے مطلب نہ بیدینی سے غرض کیونکہ تیرے جمال عکس سے دونوں میں کو کوئی بھی محروم نہیں ہے لمحہ کو اتحاد مبارک، مومن کو ایمان مبارک، مگر آخر کار گلاب کی پتی عطا کے دل سے متعلق ہے۔

شہنشاہ جہانگیر اپنی ترک میں اپنے باپ اکبر کے حالات یوں بیان کرتا ہے :-

”والد بزرگوار ہر عقیدہ کے علماء سے گفتگو کیا کرتے تھے اور اگرچہ وہ خود کچھ پڑھے نہ تھے تاہم ہمیشہ علماء اور طباع لوگوں سے بات چیت کرتے کرتے ان کی زبان ایسی شستہ ہو گئی تھی کہ کوئی شخص انکی گفتگو سے یہ تمیز نہیں کر سکتا تھا کہ وہ تعلیم یافتہ نہ تھے وہ فہم اور شہر دونوں کی لطافت کو ایسا اچھا سمجھتے تھے کہ ان پر کبھی کسی اور کو ترجیح دینا ناممکن ہے۔“ میں نے اس بیان کو کئی بار پڑھا ہے اور میں اس قطعی جہالت کا اسکی اعلیٰ درجہ کی تعقیدانہ قابلیت سے مطابقت کرنے میں ہمیشہ کامیاب رہا۔ اکبر اپنے بچپن کا زمانہ جو خطرات، حوادث، اور انقلابات سے پر تھا گزار کر تیرہ برس کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ یہ بچپنی معصوم کی تاریخ کے ایک فقرہ سے (جس کا اردو کاسن جلوس کے دوسرے سال بطور معلم کے منتخب ہوا تھا) یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسوقت تک شاہزادہ کچھ لکھا پڑھنا جانتا تھا۔ ”اسوقت تک“ کا فقرہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ وہ بعد میں پڑھ لکھ گیا تھا۔ اور جہانگیر کے بیان کا مطلب بھی شاید اس سے زیادہ نہ ہو گا کہ اس کے باپ کی تعلیم بچپن کے زمانہ میں کچھ نہ ہوئی تھی جو ہایوں کے آخری زمانہ کے تکلیفات کے لحاظ سے تعجب خیز نہیں ہے میر عبد اللطیف اکبر کا پہلا معلم تھا۔ سولہویں برس کی عمر میں اکبر کے لئے ایک دوسرا معلم مقرر ہوا جس سے اس نے وہ و لطیفیں پڑھیں جنہیں تصوف کے اصطلاحات تھے۔

(یہ نوٹ صفحہ ۱۷۷ کا ہے) ”میر عبد العزیز نے درالمنثور میں اس کی نقل کی ہے جو ہذا“ ”اسی برخانہ کہی نگورم جو یای تو اندو بزرگان کہی خنوم گویای تو۔“ کفر و اسلام در بہت پویان و وحدہ لاشریک لہ گویان + اگر مسجد است یا تو فقرہ قدس میر نندہ اگر کلیسا است مشرق تو تاؤس می جینا ست کہ مختلف دیرم و گہ ساکن مسجد + یعنی کہ ترمی طلم خانہ بخانہ + اگر خاصان ترک و کفر و اسلام کارے نیست این ہر دورا در پردہ اسلام تو بارے نہ + کفر کفر دوا دیں ویند اورا + وہ ردی دل و طار را + این خانہ نہ نیست اتلاف قلوب موحداں ہندوستان و خصوصاً جمہور پرستان عہدہ کنیر تعمیر یافتہ + بفران خدیو تخت و فہر + چراغ آفرینش شاہ اکبر + نظام اعدال ہفت معدن + کمال اتسراج چار عنصر + ہر کنظر مدق نینداختہ این خانہ را خراب بازو باید کہ تخت معبد خود را بنید از دچہ اگر نظر بد دل است با سہم ساختی است و اگر چشم برآب و گلی است ہمہ بر انداختنی بیت خداوند اچو داد کار دادی نو داد کار پر نیست سنادی نو توہر بار گاہ نیست آگاہہ پیش شاہ داری نیت شاہ

تاریخ کا ایک گمشدہ ورق

(زبیدہ)

جب شہید بنی ہنگ زاب نے حکومت بنی امیہ کا شیرازہ بالکل منتشر کر دیا اور بنو عباس کی طرف سے ابو مسلم خرمیہ اسانی کی تلوار خاندان بنی امیہ کے سروں پر چکینے لگی، تاکہ ان کے ہر ہر فرد کے وجود سے دنیا کو پاک کر دیا جائے، تو ان متمرد گان دولت حکومت میں سے ایک شخص اُس سے بچ کر نکلنے والا بھی تھا جس نے بنو عباس کے تمام آرزوؤں کو خاک میں ملا دیا اور اندلس پہنچ کر ایک ایسی زبردست حکومت اسلامی قائم کی جس پر خاندان عباس نے ہمیشہ رشک کیا اس شخص کا نام عبدالرحمن الداخل تھا۔

اس وقت کا موضوع سخن یہ نہیں کہ عبدالرحمن کے اُن واقعات حیات سے بحث کی جائے جو تاریخ میں موجود ہیں اور نہ یہ بتانا مقصود ہے کہ اس نے کیونکر اندلس میں دولت اسلامی قائم کی اور بلا و غروب میں اس کی ذات سے علم و ادب کو کس قدر فائدہ پہونچا کیونکہ اس کی تفصیل تمام تاریخی کتابوں میں ملتی ہے، بلکہ مقصود اس واقعہ کو بیان کرنا ہے جسے مؤرخین نے ترک کر دیا یعنی یہ کہ کس طرح اس نے موت سے نجات پائی اور کیونکر بنی عباس کے نتیجہ سے آزاد ہونے میں کامیاب ہوا

جس وقت بنو عباس، خاندان بنی امیہ کی گرفتاری میں مصروف تھے، اُس وقت عبدالرحمن نہ فرات کو عبور کر کے اپنے چھوٹے بھائی کے ایک چھوٹے گائوں میں پہونچا اور یہاں ایک ایسے شخص کے مکان میں پناہ گزین ہو گیا جو اس خاندان کا ممنون احسان تھا اس کے ایک لڑکی تھی زبیدہ نہایت جمیل و خوش اندام جس کی عمر ابھی صرف ۱۲ سال کی تھی جو اپنے باپ کے غیر حاضری میں رجب وہ فرات میں مچھلی کے شکار کے لئے جاتا، گھر کا سارا انتظام کرتی عبدالرحمن کی عمر بھی اس وقت ۲ سال کی تھی اور یہ بھی نہایت خوبصورت اور دلکش نقشہ کا انسان تھا۔

اول دن جب زبیدہ کی نگاہ اس پر پڑی تھی، اس کے دل میں عبدالرحمن کی محبت پیدا ہو گئی تھی لیکن اب کچھ زمانہ کے قیام نے اس جذبہ میں اور زیادہ استحکام پیدا کر دیا تھا۔ وہ نقاب کے نیچے سے، پردہ کی اوٹ سے، دریچوں کی جھلملی سے اسے دیکھا کرتی تھی اور خاموشی کے ساتھ مارج محبت طے کرتی جاتی تھی۔

ایک دن زبیدہ پانی لینے کیلئے وریاے فرات کے کنارے گئی تو بائیں ساحل کی طرف دور کی فضا میں بہت سے سیاہ پرچم اُس کو متحرک نظر آئے وہ جانتی تھی کہ سیاہ پرچم بنو عباس کا فوجی نشان ہے، وہ اس سے بھی واقف تھی کہ عباس کی اولاد بنو امیہ کی جانی دشمن ہے اور اس کا ہمان (عبدالرحمن) خاندان امیہ کا ایک فرد ہے۔ یہ دیکھ کر اس کا جی دہل گیا اور وہ سمجھ گئی کہ اے عبدالرحمن

ہر قسم کا عطر صفر علی محمد علی تاجر عطر کھنو کا عطر ہمیشہ خریدنا چاہئے

کی خبر نہیں ہے، اس لئے وہ فوراً گھر گئی تاکہ اپنے باپ سے سارا ماجرا بیان کرے، لیکن اس وقت وہ بھی نہ ملا اب سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ براہ راست عبدالرحمن کو اس خطرہ سے آگاہ کرے۔ اس حد تک تو اس کے خیالات کی رفتار عام فطرت انسانی کے ماتحت عمل میں آئی، لیکن اس کے اہل ہمتی اس کے جذبات محبت والفت جنبش میں آئے اور اس نے خیال کیا کہ عبدالرحمن کو خطرہ سے آگاہ کرنا گویا اپنے سے جدا کر دینا ہے اور اس کو وہ گوارا نہ کر سکتی تھی اس لئے اس کی محبت حیلہ کارنے — اور کو نمحبت ہے جو حیلہ کار نہیں ہوتی — یہ تدبیر نکالی کہ مردانہ لباس پہن کر اس کے پاس جائے اس خطرہ سے آگاہ کرے اور خود بھی اس کیساتھ رہبر کے حیثیت سے ساتھ ہو، چونکہ عبدالرحمن نے اس وقت تک زبیدہ کی صورت نہ دیکھی تھی اس لئے یہ تدبیر اس کی بالکل ممکن العمل تھی۔

زبیدہ نے اپنے باپ کا لباس پہنا اور دروازہ کھٹکھٹا کر عبدالرحمن سے سارا حال بیان کیا۔ اول اول اس نے پس و پیش کیا کہ چوٹے بھائی کی مصیبت میں کیونکر وہ بھاگ سکتا ہے، لیکن جب زبیدہ نے مجبور کیا اور غدرات رہبری میں پیش کیں تو عبدالرحمن راضی ہو گیا اور آخر کار یہ تینوں خوب آب آفتاب سے قبل فرات میں کودے تاکہ اس کو مجبور کر کے نکل جائیں اس کو تھا میں عبدالرحمن کا چھوٹا بھائی دریا کے اندر ڈوب گیا، کہا جاتا ہے کہ عباسیوں کے ایک تیرنے اسکو زخمی کر دیا تھا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکا اور دریا میں غرق ہو گیا۔ بہر حال وہ عباسی لشکر کے تیر سے زخمی ہو کر مراد ہو یا کسی اور وجہ سے یہ واقعہ ہے کہ فرات کے دوسرے ساحل پر جنوبی عبدالرحمن پہونچا تو صرف رہبر اس کے ساتھ تھا اور اس کا چھوٹا بھائی اس سے ہمیشہ کیلئے جدا ہو چکا تھا۔

یہ دونوں چروں کی طرح چھیٹے چھیٹے شام، جبل، سان، فلسطین، صحرائے سینا سے گزرتے ہوئے مصر کی حدود میں داخل ہوئے اندر قیروان تک پہونچکے عباسیوں کی طرف سے مصر میں جو حاکم مقرر تھا اس کو بھی عبدالرحمن کی فراری کی خبر دی گئی تھی اور وہ بھی جستجو میں تھا، لیکن عبدالرحمن مع زبیدہ اور ایک خادم کہ جس کا نام بدر تھا اور جو مصر سے ساتھ ہو گیا تھا، اندلس پہونچا اسوقت یہاں کی حالت یہ تھی کہ نہ صرف بدر اور عباسیوں میں سیادت کی نزاع قائم تھی بلکہ خود عربوں کے اندر بھی مفردی اور یمنی کی تفریق نے سارے ملک کے اندر اضطراب پیدا کر رکھا تھا۔ اس انشقاق و بد امنی سے فائدہ اٹھا کر عبدالرحمن حکومت بنی امیہ کے لئے لوگوں کو دعوت دینی شرعی کی اور آخر کار ستمبر ۷۵۷ء میں وہ بنو امیہ کا قائم مقام ہو کر یہاں کا حکمران ہو گیا اسے قرطبہ میں نیا قلعہ طیار کر دیا۔ مسجد بنوائی اور خطبہ سے منصور خلیفہ عباسی کا نام نکال کر اپنا نام داخل کیا۔ اسی عہد سے عبدالرحمن داخل (اول) کے لقب سے مشہور ہوا اور تاریخ میں اپنی بیشمار یادگار چھوڑ گیا۔

حکومت و دولت کے زمانے میں بھی عبدالرحمن نے اپنے شریک مصائب (زبیدہ) کو فراموش نہیں کیا اور اس کو کوئی حلیل القدر

خدمت تفویض کرنی چاہی کیونکہ وہ ایک اسے مرد ہی سمجھا تھا۔ لیکن جب ایک دن وہ اپنا مردانہ لباس اتار کر عبدالرحمن کے ساتھ آئی تو اسے سخت حیرت ہوئی، لیکن اب بھی وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ اس نے اس قدر تکلیفیں کیوں برداشت کی تھیں اور اس کے دل میں کس قسم کی آگ مشتعل تھی۔ عبدالرحمن، وہ عبدالرحمن، اہل جو سلطنت و سیادت تمام ذریعہ تربیہ رازوں سے آگاہ تھا جو حکومت و قیادت کے نازک ترین نکات کے سمجھنے میں اس قدر ذہین و ذکی تھا، وہ ایک لمحہ کے لئے بھی نہ بیدار کی حالت کا اندازہ کرنے میں کامیاب نہ ہوا اور اس کے چہرہ میں جو کھلا ہوا صحیفہ محبت و عشق تھا، اس کے ایک جذبہ کا بھی مطالعہ نہ کر سکا۔ عبدالرحمن کی ساری زندگی میں غالباً یہی ایک واقعہ ایسا ہے جس سے اس کی بے بسی اور بلا دلت نہن کا پتہ چلتا ہے۔ عبدالرحمن نے زبیدہ کی انتہائی عورت کی تمام امرا کے سامنے بے "فارس جمیل" کا لقب نہایت کیا۔ لیکن زبیدہ کا اپنے وطن و عہدہ کو ترک کرنا، تمام مصائب برداشت کرنا اس غرض سے نہ تھا کہ وہ جاہ و شہرت کی طالب تھی بلکہ اس نے یہ تمام آلام اس بنا پر جھیلے تھے کہ وہ ایک دن اپنے محبوب سے مل جائے گی، اس لئے جب اس نے عبدالرحمن کے قلب کو اس درجہ بارش سے جس پایا تو اس کا مایوس ہو کر حزیں و ملول ہو جانا بالکل فطری امر تھا لیکن عبدالرحمن جو اسلام ملک کے اہم مشاغل پر ہدف رہتا تھا اس کو کیا اس امر کا موقع مل سکتا تھا کہ زبیدہ کے نازک حسیات کو سمجھتا۔

ایک زمانہ اسی طرح گزر گیا یا نہ کہ کہ چند دنوں کے لئے اطمینان سے بیٹھنے کی فرصت اسے نصیب ہوئی۔ وہ ایک دن محل کے معاملات پر غور کر رہا تھا کہ دفعتاً اسے زبیدہ کا خیال پیدا ہوا اور اس نے ارادہ کیا کہ کسی سردار سے اس کا عقد کر دینا چاہئے چنانچہ اس نے سر عسکر عبدالملک کو طلب کیا اور اس کی رضامندی حاصل کر کے زبیدہ سے دریافت کیا کہ اسے تو کوئی عذر نہیں ہے۔ زبیدہ اس کے قدموں پر گر پڑی اور باجیم پر غم ہوئی کہ "آپ الگ و مختار ہیں میں کیا اور میری رائے کیا۔"

جس زفاف کا اہتمام کیا جائے، چنانچہ اس حکم کی تعمیل ہوئی اور سارا قریبہ اس خوشی میں چیراغان کیا گیا لیکن جس وقت زبیدہ کے چہرہ میں پہونچے تو وہ وہاں موجود نہ تھی بلکہ عبدالرحمن کے چہرہ میں پڑی ہوئی، رد ہی تھی عبدالرحمن کو اطلاع ہوئی تو وہ خود وہاں گیا۔ لیکن یہ وہ وقت تھا جب زبیدہ سکرات موت میں مبتلا تھی۔

جب زبیدہ نے نگاہ واپس سے عبدالرحمن کو دیکھا تو اس کی آنکھوں سے بھی حجاب اٹھا اور اب سمجھ میں آیا کہ زبیدہ کا تمام آلام و مصائب اختیار کرنا کس لئے تھا۔ لیکن یہ سمجھنا اب بعد از وقت تھا کیونکہ موت کی زردی اس کی پیشانی پر دوڑ چکی تھی۔

زبیدہ نے اپنی آخری نگاہ اٹھائی اور کچھ گفتگو بھی کی جس سے عبدالرحمن صرف اس قدر سمجھ سکا کہ اس نے نہر کھا لیا۔

اس نے زبیرہ کو اپنے ہاتھوں پر سنبھالا اور سینہ سے لگا کر آخر کار اس کو اس عکبہ دم توڑنے کی اجازت دینی ہی پڑی جہاں تک ہو بچنے کی تمنایں وہ ساری عمر گملا کی۔ عبدالمطلب نے اُسی عبد الرحمن نے جو شہیدین ملکیت کا انتظام تو کر سکتا تھا لیکن ایک قلب مجروح کا گھروا اس کے اختیار میں نہ تھا۔ زبیرہ کی سر و پیشانی کو بوسہ دیا، اور رو تا ہوا حجرہ سے باہر نکل آیا۔

یادہ ناب محبوبہ رباعیات فارسی میر ولی اللہ صاحب بی لے عمر
مطالبہ فطرت - (مجلد) اتحاد فلسفہ اسلام پر ایک نمائندہ تصنیف - مصنفہ محمد فاروق ایم - ایں - سی عمر
شکند ان فصاحت - عربی فارسی اردو کے بہترین علمی ادبی تاریخی لطائف کا مجموعہ عمر
تذکرہ حضرت بلجے شاہ - پنجاب کے نہایت مشہور بزرگ کے تاریخی حالات مستند ذرائع سے ۸
جہاں آرا بیگم - شاہزادی جہاں آرا بنت شاہجہاں کی نہایت مستند و کچھپ تاریخ ۸
سند گئی - امام ابن تیمیہ کی مشہور کتاب "العبودیت" کا پیش ترجمہ حقائق عربیہ و تصوف کی بے نظیر کتاب عمر
لسان الغیب - حافظ شیرازی کی مکمل سوانح عمری اور ان کے دیوان کی بہترین شرح جلد اول سے جلد دوم عمار
قتلہ خلق قرآن - امام عبدالعزیز بن عینی کی کتاب "الحجیدہ" کا ترجمہ مسئلہ قرآن کے متعلق ایک بے نظیر محاکمہ ۱۰
کاس الکرام - عمیر خاں کے مفصل حالات زندگی، اور رباعیات کی مکمل شرح، اس موضوع پر پہلی کتاب ہے عمر
یادگار غالب - مرتبہ شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی عمر
کلیات نظم حالی - مرتبہ شمس العلماء حالی کے تمام منظوم کلام کا مکمل مجموعہ عمر
نقش ارژنگ - جمال الدین صاحب اکبر کی نقیوں اور غزلوں کا مجموعہ عمر
ابو سلم خراسانی - جرجی زیدان مصری کے مشہور ناول کا اردو ترجمہ عمار
الفاروق - مکمل ہر دو حصہ مع نقشہ دنیائے اسلام، علامہ شبلی کی سیرت حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر مشہور کتاب ہے عمر
اصلاح سخن تربیت موضوع کے لحاظ سے اردو میں پہلی کتاب جس میں جناب شوق سیدی نے اپنی چند غزلوں کو مع ان تمام اصلاحوں کے یکجا کر دیا ہے قیمت صرف عمر
فغان آرزو - جناب سید انور حسین آرزو دکن کے مشہور شاعر کا مجموعہ کلام مع حصول ڈاک عمار

منیجر ننگار نظیر آباد لکھنؤ

عطر خریدنے سے پہلے صفحہ علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کو یاد فرمائیے

گنگا

ہکا دیا ہے ساحل بھولوں کی طرح تو نے
چمکا دیا ہے صحرا تیرے ہی رنگ بونے
تو رکاب گلستاں ہے
اے گلخوار گنگا

موج رواں میں تیرے ذرات برق خشاں
ہم پائیے فلک ہے تیرا حجاب رقصاں

قطرے گہر ہیں تیرے

اے آبدار گنگا

ہیں زندہ تیرے دم سے ارمان گویوں کے
ہوتے ہیں تیرے اندر اشناں گویوں کے

ہے تیرا حسن ان میں

اے جلوہ بار گنگا

ساد ہونے تیرے در پر دھونی رمانی آکر
اور دان کی کسی نے گنگا بستی آکر

ہیں تیرے فیض جاری

اے زر نگار گنگا

چرنوں میں تیرے آکر چھپتے ہیں ماہ پارے
کرتی ہیں تیری موجیں ابرو سے کچھ اشارے

تو جان دلکشی ہے

اے شاندار گنگا

سات آسمان کے اوپر رھتا مرا خدا ہے

کرتا ہوں ندیوں میں

تجھ کو شمار گنگا

اسلاف کے قدم کو چوما ہے چونکہ تو نے

گردیدہ کر لیا ہے مجھ کو بھی تیری خونے

مجھ پر عنایتوں کا

ہے تیری بار گنگا

محمود اسرار علی

من پر تو جانا نام

آئینہ حیرانم؟ یا صحن گلستانم

من سوختہ سامانم؟ یا مہر و خشانم

دائم بختا۔ دائم نے انیم دے آئم

من پر تو جانا نام

مجبور بہ تقدیرم؟ یا صاحب تدبیرم؟

من بیکر تصویرم؟ یا خوگر تقدیرم؟

دائم بختا۔ دائم نے انیم دے آئم

من پر تو جانا نام

آواز دل خویشم؟ یا ساز دل خویشم؟

من ناز دل خویشم؟ یا راز دل خویشم؟

دائم بختا۔ دائم نے انیم دے آئم

من پر تو جانا نام

امین حسنین

دھرت پرست ہوں میں مسلک مرا جدا ہے

غزلیات

میرزا کا باسط۔ باسط بھو پالی کو

نہو فضاں کار گر نہیں ہے مگر عین اثر ہے
خدا نے وہ رات محکوم دی ہے جسے تلاش بحر نہیں ہے
یہ جلوہ تابی جہان الفت کی دیدنی ہے
دور درہ تر پربا ہے تجلیوں کو خیر نہیں ہے
نظر کو ذوق تلاش کیسے قدم کو تشویش
دل لیے بلوؤں کو ڈھونڈتا ہے جو محال نظر نہیں ہے
نہ آرزو میں جوش نہاں نہ دلوں میں خروش رسوا
یہ حیرت جلوہ کیا ہے یارب کہ ہکو اپنی خبر نہیں ہے
میں جھکو تجھے میں پیش کر دوں وہ جھکوزیب نظر بنائیں
الہی داناں آرزو میں کوئی بھی ایسا گھر نہیں ہے
ادھر جمال کر شمع پرودا ادھر ستمائے حشر منظر
سنبھلے دل کو کوئی تو کیونکر کیسے باب مقرر نہیں ہے
مری محبت کی داستانیں فلک پہ ہستے ہیں سننے والے
مگر وہ انجان اور ایسے کہ ان کو کچھ بھی خبر نہیں ہے

کسی کی کافر نگاہیاں بھی تو ارق ہیں دلوں کو یا باسط

مگر نہیں ہے تو ایک میری تباہیوں پر نظر نہیں ہے

شمع
کس کس غم میں سو افسانہ موتی جو
تج تباہ شمع کس کس چرخ دلی جو تو
کیا تجھے بھی ہے کسی کی نگاہی کا کلا
کیا تیری ہستی بھی ہے یارن الم میں تبا
صنبد کوئی ہے جسے تو کوں وہ راز ہے
تاقب کا پوچھو
کس غم راز کی اسے شمع تو دسا ہے

صنبد پر قدرت ہے جھکویہ کو قحط مویش
گر صبر ہو سنے میں یا ن الم کا جوش
تیرے شکوک ہے نہا ہر چ بتابی کمال
بزم میں جلنا میری تیری زندگی کا مال
تیری دھیمی روشنی میں نہاں الفت کا راز
تیری ہر سانس میں ہے فسانہ سوز و گداز
تیرا جلا درخش اہل بصیرت کے لئے
شمع تو شمع ہدایت ہے محبت کے لئے
صبر کی محفل میں اک تو ہی ہے نہ تاشا
صنبد راز عشق میں جاتی ہے خود ہی فنا
تو نہ ہوتی تو نہ ہوتی بزم عشرت میں ضیا
تو نہ ہوتی تو نہ ہوتا شگفتہ راز فنا
تیری ہی منوں میں شاد و گدائی محفلیں
تجھے کیسے پھر تو دیاں الم کی منزل میں
تو نہ ہوتی تو نہ ہوتی خانہ عشرت میں غم
تیرے ہی دم سے تو گشتا غم میں غم
بیکسوں کی تکرار تو ہے راتوں کو تو ہی
آنے والا کی قبروں پر نہیں ہے کوئی بھی

ہے کوئی بات آج ہو گے
جی بہت چاہتا ہے رونے کو
آگنا نہ تم کہیں سے ادھر
کوئی بیٹھا ہے جاں کھونے کو
کون ہو گا شمع شادی غم
کوئی سننے کو ہے نہ رونے کو
کتنی گئی ساری رات آنکھوں میں
ہم سے کیا پوچھتے ہو سونے کو
ہو چکی باز رہیں بھی آخر
ہو یا جو رہا تھا ہونے کو
وہ بشر بھی غیب بشر ہے جگر
فرض تجھے جو جان کھونے کو
جگر پر بلوی

ہر قسم کا عطر صہر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے بہترین عطر نگاہیے

دل شاہماں پوری

نظیر لودھیانوی

جویاے حقیقت بولم سوجھا
دل ہے طرک کہ رخ جانب بختا
تاثر بیان بھڑکے گوش چمانہ
ساتی کو سنانا ہے نہانہ در نہانہ
ہر ذرہ میں پردہ اک شعلہ بھڑکتا ہے
اس اہل نظر دیکھو خاکستر پر دانہ
اک کیف نے دونوں پرستانہ اثر ڈالا
میکش ہے خود رفتہ چکر میں ہے بیانہ
جب صاعقہ لہرائے حد جاننا نہ لگی
چل دایہ زمین ملک میں طور کا نہانہ
ہے مشرب زہل میں انداز طبع ہی
ہر گردن ساغر بلیک لغزہ مستانہ
گی کہ یہ پیچھے تشریف غم بہانہ
ہر شک مسلسل سے نہانہ در نہانہ
بزدل سے عیاں ہو کر پردہ میں نہ ہوا
چھا جائیگی خود حیرت اسے جلوہ جانہ
یونہی جل کے سر محض تصویر وفا کھینچی
بھرتی ہے نگاہوں میں جانمازی پر دانہ
اشدرے کیف ہے ادھی عالم میں
معراج حق بنی کی اک غفرش تانہ
حالات اہل مکہ بیمار نے دم توڑا
آخر کا یہی کمرہ اٹھا حاصل نہانہ
وہ حیرت نظارہ وہ منظر عجوبت
وہ برق کے پردہ میں انداز جانہ
کیا جائے کہاں مچیں کھینچے جاتی ہیں
پہنچا ہیں ساحل تک و ہمت مردانہ
دنیاے حقیقت میں آزاد تین ہیں
ہے کبھی مگر دیا کہہ سے نہ بختانہ
اک مست بھی آؤں کہتا ہو گزرا ہے
صد بدیدیک جبر عتقیری دیمانہ

فرخ بنارنگی

مجنوں گورکھپوری

نہایت رنگ بوسے گل مبارک لٹکتا ہے
یہ دودوں کا تاشا ہے جو آغاز خشتا ہے
کبھی جلتی ہے آندھی، مگر کبھی بجلی جلتی ہے
یہ ہنگامہ جن میں صرف تیرا نیا تھا ہے
مفر سے ات دن لیکن تیس معلوم تک
کہاں آ رہے ہیں: پریشان کا تاشا ہے
خود یک رنگ نعل سرفی خون منسا ہے
تقداری بزم کی: دلق ہار جی تاشا ہے
کیس ایسے فریبہ جو ہم طہر نے دی
خبر کیا ہے کہ حد وہمہ کہاں کہاں تھا ہے
ازل سے خاتمہ پر آج تک کی تاشا فرخ
نہیں معلوم طول: داستان غم کہاں تھا ہے

پشیاں ہو گئے ناحق نئے فحہ کو دلیری
نہ پوچھو صل دل سیرانہ کھلو: زبان میری
لہری سوا سلاں میری دی پنا میں میری
سناؤں کیا نہیں سنو کہ قابل ستان میری
مرے صیا و سرگرداں ستانوں کی کہتا
جہاں رکٹ لے کھلی کرودہ چاٹ آئین میری
بھوک ٹھہر چکے تگ بھولوں کا کھڑے
سکھا کھنکھیں کو کوئی طرز نقان میری
جنون کی خورشید کے لیکے ایام اسیری تک
مری زنجیر کے نالوں میں سن لودستان میری

استفسارات

غالب کا مذہب

(جناب سید اوسط علی صاحب - برہان پور)

اس وقت مختلف رسائل میں غالب کے مذہب کے متعلق بھی بحث چھڑی ہوئی ہے کوئی کتاب ہے کہ وہ شیعہ تھے، کوئی انھیں سنی ثابت کرتا ہے، آپ کی رائے اس مسئلہ میں کیسا ہے مولانا حالی نے یادگار غالب میں جو باغی غالب کی درج کی ہے اور جس کا آخری مصرعہ ہے :-

شیعی کیونکر جو مادر ابراہنری

اس سے قصاف ثابت ہوتا ہے کہ وہ شیعہ ہی نہ تھا۔

(نگار) مجھے یاد پڑتا ہے کہ شاید آپ دو سال قبل لکھنؤ کے کسی صاحب طبقہ اسد اللہی کے متعلق استفسار کیا تھا اور اسی سلسلہ میں غالب کی نسبت بھی ایک مختصر گفتگو کی گئی تھی کہ اس کا اپنے آپ کو اسد اللہی کہنا کیا سنی رکھتا ہے اور جہاں تک مجھے خیال ہے میں نے اس میں یہ لکھا تھا کہ غالب یقیناً افضلی شیعہ تھا۔ چنانچہ اُس استفسار کا تعلق براہ راست غالب کے مذہب سے نہ تھا اس لئے اس سے زیادہ لکھنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ لیکن اب جبکہ آپ نے اسکو اصل سوال ہی قرار دیا ہے تو مجھے صاف صاف کہہ دینا چاہیے کہ غالب کو کسی کہنا باطل ایسا ہی ہے جیسے کوئی ذوق کو شیعہ کہے اس سے زیادہ خفیف حرکت اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ سنی جماعت محض اس لئے کہ غالب ایک اچھا شاعر تھا اُسے اپنے گروہ میں شامل کرنے کے لئے بید از قیاس تا دیلوں کا نام لے رہا حالیکہ وہ شخص جس کے مذہب کے متعلق فیصلہ ہو رہا ہے وہ چیخ و پکار کر رہا ہے کہ میں شیعہ ہوں اور شیعہ بھی ایسا جو باوجود (عقائد کے لحاظ سے) علی اللہی نہ ہونے کے اپنے آپ کو علی اللہی کہہ رہا ہے۔ اس کے قطعات نوحہ و فحاشہ وغیرہ دیکھئے اور خود غور کیجئے کہ جو معبود خلائق و ترازب کے جو کار خدا بہ عرصہ محشر کند علی کا قائل ہو، جو یہ دعویٰ کرے کہ :-

اُس کو آپ شیعہ نہ کہیں گے تو کیا کہیں گے۔ ایک ترکیب سب میں اُس نے اپنے غلو کو دھجک ان العطاء میں ظاہر کیا ہے :-

عاشق لیکن ندائی کر خرم بیکلام ہوشیارم بخدا و باعلی دیوانہ ام از فانی اشخ شہودم فنانی اللہ باد موشتم در علی دیگر سخن کوتاہ باد ثنوی اگر گمراہیں حضرت علی کو وہ عین ذات نبوی سمجھ کر کہتا ہے :-

دنگجہ دوتی در بنی د امام کو علیہ الصلوٰۃ و علیہ السلام شاہ نجف د صی نبی مرقضی علی آں از ائمہ اول و ثانی زنجبتن حالی نے جہاں غالب کی وہ باغی درج کی ہے جس کا حوالہ آپ نے دیا ہے وہیں یہ صراحت بھی کر دی ہے کہ یہ صرف نص طبع تھا، وہ نہ حقیقت یہی ہے کہ ایک تنفس بھی ایسا نہ تھا جو مرزا کو شیعہ حاکم سے تفصیلی نہ جانتا ہو۔

برہنہ کا عطر مغز علی محمد علی تاج عطر لکھنؤ سے منگانا چاہئے

اس سے بھی زیادہ صراحت اس کے تشیع کے آگرا چھا ہے، ہیں تو ذیل کے شعروں کو ملاحظہ کیجئے :-
ایک قصیدہ میں وہ حضرت علی کو اس شان سے پیش کرتا ہے :-

نفس نبی، خداے نصیری، الم خلق آمنت غظیم کہ حق بر جہاں نہاد

اب رہے مرزا کے بعض خطوط جن سے ان کے سنی ہونے پر استدلال کیا جاتا ہے وہ قابلِ ملاحظہ نہیں ہیں کیونکہ جن باتوں سے یہ استنباط کیا جاتا ہے وہ نہایت معمولی ہیں اور انہیں ان اشعار کے مقابلہ میں جن کو ایک خاص نجدہ کیفیت کے باعث اُس نے لکھا ہے پیش نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ استدلالِ بلاویار یا تراویح پڑھنا سنی ہونے کی قوی دلیل نہیں ہے جیسا کہ وصایت علی کا عقیدہ تشیع کا دلیل ہو سکتا ہے کما جاتا ہے کہ غالب ہمہ دوست کے قابل تھے، صوفی مشرب رکھتے تھے اور صلح کل اُن کا مسلک تھا جیسا کہ اُن کے کلام اور خطوط سے بھی ظاہر ہوتا ہے اور اس عقیدہ کا آدمی شیعہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر اس کے تسلیم کرنے کے لئے مجبور کیا جاتا ہے تو پھر مجھے کتنا پڑے گا کہ غالب نہ صرف شیعہ تھے، بلکہ اس سے بھی کچھ زائد علی اللہی تھے نصیری تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ ذات علی میں خدا حلول کر گیا ہے جس طرح ہمہ دوست کی بحث نکال کر ان کو تشیع سے خارج کیا جاسکتا ہے اسی طرح اس استدلال پر علی اللہی بھی مانا جاسکتا ہے اور ایسا کہنے کے لئے ایک اور قوی وجہ یہ بھی موجود ہے کہ انھوں نے خود اپنے آپ کو اسد اللہی ظاہر کیا ہے۔

دیوان نوشاد

مجموعہ غزلیات ہے اور وہ کے مشہور قلعہ دار جناب راجہ نوشاد علی خاں صاحب کاجس کو عالیجناب راجہ محمد اعجاز رسول خاں صاحب قلعہ دار جبالگیر آباد نے اپنے نہایت دلچسپ مفید و پر لطف مقدمہ کیساتھ شائع کیا ہے۔ کتاب کا حجم، اس کی طباعت و ترتیب نہایت دلکش ہے اور مقدمہ اپنی معنوی خوبیوں کے لحاظ سے بالخصوص قابلِ ملاحظہ ہے۔
نوشاد گمنوی طرز کے خوشگوار شعرا میں ہیں ان کے کلام میں زبان کی صفائی، حسنِ ادا، محاورات اور محاکات کے دلچسپ نمونے موجود ہیں۔ اگرچہ بہت مختصر تنقید میں تفصیلی رپورٹ کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا لیکن بعض اشعار قابلِ ذکر ہیں :-

اکسی کون یاد آیا ہے مجھ کو طبعیت آج قابلا میں نہیں ہے

خدا جانے وہ کیسا سمجھے ہیں دل میں دم آخر جو ہم سے بے خبر ہیں

میں جو مضطرب ہوا بلا سے ہوا تم تو خوش ہو گئے ستلے مجھے

سانے سب کے تو ہم ضبط و تہ کی کام دل جو دکھتا ہے تو ریت پر تہائی میں

معلومات

جدید امریکہ

چکاگو (امریکہ) میں بچوں کے جہانی حالت کی تحقیق و نگرانی کا کام ایک مستقل محکمہ کے سپرد ہے امریکہ قوم کی آئندہ نسل اس طرح جدید اصولوں پر مرتب ہو رہی ہے چنانچہ اس محکمہ کا دعویٰ ہے کہ موجودہ امریکی لڑکے جن میں سولہ سے نیکر اٹھارہ سال کی عمر والے شامل ہیں اب اپنے آباؤ اجداد سے زیادہ قدر آور ہوتے ہیں اور کم لڑکے کم درجہ اُن کا قدر بڑھ گیا ہے۔

حسین ترین ملکہ

ملکہ رومانیہ یورپ کی حسین ترین شہزادی ہیں یعنی موجودہ بادشاہوں میں کوئی بھی ایسی خوبصورت ملکہ کا نام نہیں

نیا گرہ آبشار

مشہور و معروف نیا گرہ آبشار کی غیر معمولی شہرت و عظمت بھی ایک دن ختم ہوتی نظر آتی اس لئے سڑ فرنیٹ ٹائیکر باہر طبقات الارض اٹھایا کا خیال ہے کہ چھیل اسیری کی سطح روز بروز بلند ہوتی جاتی ہے اور اگر

انسانی مداخلت و تمدنی ضروریات قرب و جوار کے رقبہ میں کوئی تبدیلی نہ بھی کریں تو ایک ہزار چھ سو سال کی مدت میں یہ چھیل بھی جیل ہر دہائی سطح پر آجائگی اور اس طرح دونوں چھیلوں کا پانی چکاگو پہنچا کرے گا اور آبشار نیا گرہ ہمیشہ کے لئے خشک ہو جائیگا۔

ایک چشمہ کا ۱۰ x ۱۵ فٹ رقبہ اور اس کے قرب و جوار کے بعض چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ۱۰ x ۱۵ فٹ چھیلوں کی تعداد کے بھی تھے۔ اس موقع پر چھیلوں کے شمار کا تجربہ کیا گیا لیکن پوری کامیابی نہ ہو سکی تقریباً ۷ فیصدی سے زائد چھیلیاں شمار نہ ہو سکیں جس کی وجہ یہ تھی کہ اکثر چھیلیاں دیر تک چھپی ہوئی بیٹھی رہتی تھیں۔ بہر حال اس تجربہ کا نتیجہ یہ

کہ ایک میل کے رقبہ میں ۶۵ چھیلیاں پائی گئیں۔ لیکن اگر اس میں بقیہ ۲۵ فیصدی کا بھی اضافہ کیا جائے تو یہ تعداد ۸۷ تک پہنچتی ہے۔

نیویارک لنڈن ٹیلیفون

آل انڈیا سانی کی تیاری میں نئی دنیا اور یورپ کے درمیان سلسلہ ٹیلیفون کی تکمیل ایک عظیم الشان کارنامہ ہے۔ اس ٹیلیفون پر ۱۵۰۰۰۰۰۰ ڈیڑھ کروڑ روپیہ خرچ ہوا ہے۔ اور پہلے ہی

جب سلسلہ گفتگو اور کاروبار شروع کیا گیا تو تھینا ایک کروڑ اسی لاکھ ۸۰۰۰۰۰ کا جو پار ہوا

لیکن اس ٹیلیفون کا درمیانی فاصلہ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہے انگلستان میں اس کا پہلا بڑا اسٹیشن لگھی ہے جہاں سے انگلستان بھر کے معاملات تقسیم ہوتے ہیں اور امریکہ میں ہولٹن میں ہے جہاں سے نیویارک اور دوسرے مقامات پر

پیغامات بھیجے جاتے ہیں اس وجہ سے تاروں یا شعلے برقی کا ایک حلقہ بن گیا ہے جس کا فاصلہ اگر ایک بولنے والے ٹیلیفون سے دوسرے پیغام رساں توں تک لگایا جائے تو ۲۹,۰۰۰ میل + ۶۰۰ میل = ۲۹,۶۰۰ میل قرار پائے گا۔

اس ٹیلیفون کی دوسری عجیب خصوصیت یہ ہے کہ جب اس ٹیلیفون پر کام شروع ہوتا ہے تو لندن کے بازاروں کا نصف دن ختم ہو چکتا ہے اور جب ٹیلیفون بند کیا جاتا ہے تو امریکہ کا کاروبار کا نصف دن ختم ہو چکتا ہے۔ اس کے بعد ٹیلیفون اس لئے کام نہیں کر سکتا کہ پیغامات ایسے حالت میں بھیج نہیں سکتے جب کہ ایک جانب تو دن ہوا اور دوسرے حصہ میں جہاں کے پیغام بھیجا جاتا ہے رات ہو گئی ہو۔

بائیں ہاتھ سے کام کرنا عام طور سے لوگ سمجھتے ہیں بائیں ہاتھ سے کام کرنے والے بوقوف اور کمزور ہوتے ہیں اور انسانی عیوب میں اس کا بھی شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن حال میں ڈاکٹر ریز نے خصوصیت سے ایسے لوگوں کے دماغی تحقیق کی ہے جو اپنے بائیں ہاتھ سے کام کرنے کے عادی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ دماغ کا نصف دایہا حصہ جب زیادہ قوی ہوتا ہے تو لوگ بائیں ہاتھ سے کام کرنے لگتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ دماغی کمزوری نہیں ہے اور مثال میں بائیں ہاتھ سے کام کرنے والی مصورینزل کا نام پیش کیا جاتا ہے جس کے دماغ کی دایہی جانب بہت زیادہ حساس اور قوی تھی۔

سینما کی کامیابی رڈولف ولینڈو ایک اطالوی لڑکا تھا جس کی عمر مشکل سے اٹھارہ سال کی ہوگی وہ اپنے وطن سے نکل کر امریکہ پہنچا اور بالی وڈ کے عجائب کہہ میں داخل ہو گیا جہاں محرک تصاویر کے (فلم) اٹھارہ گیارہ ہوتے ہیں چند سال کے بعد دنیا نے سنا کہ ولینڈو نہ صرف بہترین ایکٹروں میں شمار ہونے لگا ہے بلکہ اٹھارہ معاشرہ کے لئے اس سے بہتر صاحب فن کوئی نہیں ہے۔ جن دجال کی دنیا اس پر نشانہ تھی اور جو اہر کے انبار اس پر قرباں تھے۔ جوانی اور شباب کی سرمستیاں گویا اسی کے لئے وضع ہوئی تھیں اور شہرت و قبول عام کی کوئی بلندی ایسی نہ تھی جو اس کے قدموں کے نیچے پا مال نہ نظر آتی ہو۔ امریکہ سے گزر کر یورپ و ایشیا کی کوئی سرزمین ایسی نہ تھی جہاں اس کے ہزاروں لاکھوں شہیدانی موجود نہ ہوں۔ مقبولیت دہر دہر یزی کی ہی کیفیت تھی کہ دفعۃً رڈولف ولینڈو کو ایک شدید بیماری پیش آئی اور اس کے لئے عمل جراحی تجویز ہوا یہ حادثہ امریکہ اور یورپ کے لئے غالباً دنیا کے اہم تاریخی واقعات سے بھی زیادہ سخت و ہولناک تھا کہ بیمار پرسی کرنے والے اور ہمدردی کے پیغامات بھیجنے والوں کی تعداد کمزوروں سے متجاوز ہو گئی اور شفا خانہ کے محاذیں کثیر تعداد میں ٹیلیفونوں کا اضافہ کیا گیا تاکہ جو باتیں تاخیر نہ ہو متعدد ہوائی جہازیں امریکہ کے درمیان دو اکین لانے اور ماہرین فن جراحی کی امداد حاصل کرنے کے لئے دورہ کر رہے تھے۔ عیادت کرنے والی اور سگووار نازنینوں کی تعداد کا کیا شمار ہو سکتا ہے کہ اس کی موت کے بعد ہزار ہا رومال تو ان آنسوؤں سے تر پائے جاتے ہیں جن کی قیمت کا اندازہ کرنے

کے لئے دنیا کی بے تعداد دولت اور انسانی جذبات کے غیر معمولی فراوانی دونوں عاجز ہیں۔ ولینٹو کے جنازہ کے ہمراہ لاکھوں انسانوں بھرے پایاں حرکت میں تھا اور خواتین کا یہیم غش کھا کھا کر گرنے لگی جلوس میں وہ اہمیت پیدا کر رہا تھا جو دنیا کی بڑی سے بڑی ہستیوں میں بھی صرف بعض ہی کو نصیب ہوئی ہو۔

یہ تمام رد واد جو اک مختصر مدت میں پیش آئی محض نتیجہ ہے اس مجنونانہ شیفنگلی کا جو موجودہ زمانہ میں مغربی تہذیب و تمدن کے زیر سایہ فن ڈراما علیکہ اس کی مخصوص شاخ سینما سے پیدا ہو گئی ہے!

امریکہ میں ریڈیو کی ترقی ۱۹۲۲ء میں صرف ۶ ہزار آلات ریڈیو پاؤں پائے جاتے تھے، لیکن ۱۹۲۶ء کے اخیر تک ان کی تعداد ساڑھے چھ ملین ہو گئی ہے اور دروازہ لاسکی اسٹیشنوں سے ۲۶ ملین پیغام روانہ ہوتے ہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ آلات ریڈیو کی قیمت جو صرف ۱۹۲۶ء میں خرید کئے گئے ۱۰۰ ملین گنتی تک پہنچتی ہے اور ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۶ء تک ۳۰۰ ملین گنتی ال پر ملک کا صرف ہو چکا ہے۔

امریکہ میں ۲۷ ملین خاندان ایسے ہیں جہاں گیارہ ملین فونو گراف، ۱۸ ملین موٹر، ۱۷ ملین ٹیلی فون اور ۷ ملین ریڈیو استعمال ہوتے ہیں۔

بندروں کی تعلیم اس وقت تک بندرون کو گفتگو کرنے کی تعلیم دینے میں کامیابی نہیں ہوئی، لیکن امریکہ کا ایک پروفیسر بیان کرتا ہے کہ چینی بڑی بندر کو ابھرے ہوئے حروف پر انگلیاں استعمال کرنا اس طرح سکھایا جاتا ہے، جس طرح اندھوں کو، کیونکہ بندر میں نقل وقلید کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اگر پروفیسر مذکور اس میں کامیاب ہو گیا تو بندر کا کتابین پڑھ لینا بہ نسبت گفتگو کرنے کے زیادہ آسان ہو جائیگا۔

آنکھ اور سننا مشہور ہے کہ سنا کی متحرک تصویر بندر کے طرف دیکھنا نگاہ کے لئے مضرت رسان ہے۔ لیکن حال ہی میں دلائی کرنا، سینما میں ڈیڑھ گھنٹہ تصاویر کا مطالعہ کرنے سے زیادہ مضرت رسال ہے۔

سب سے بڑا مینار ہوائی جہازوں کی ہدایت کے لئے بڑے بڑے مینار تیار کرائے گئے ہیں جن میں رات کو نہایت تیز روشنی ہوتی ہے اور بہت دور سے ہوائی جہاز چلانے والے کو سمت وغیرہ کا پتہ چل جاتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں سب سے بڑا مینار حکومت فرانس نے قائم کیا ہے جس میں ایک ہزار ملین تہی کی روشنی ہوتی ہے اور ۳۰۰ میل کے فاصلہ سے روشنی نمودار ہوجاتی ہے

۔ مطبوعہ نگار شین پریس نظیر آباد لکھنؤ باہتمام وصال بکراچی۔

عطر خریدتے وقت صغریٰ محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کو فراموش نہ کیجئے

نگار

ادبیر: نیاز فتحپوری فہرست مضامین اگست ۱۹۲۷ء

۸۴	شمیم خیر آبادی	۲	ملاحظات
۸۵	نکمت - بی اے	۵	طنزیات اور روزبان
	نظیر لودھیانوی	۲۴	حسن شاہ (فسانہ)
۸۶	مجنوں گورکھپوری	۳۵	اکبر، آئین اکبری میں
	جگر بریلوی	۴۲	علم فراست الید
۸۷	یوسف بھجرائی	۴۷	جواہرات کی چوری (فسانہ)
۸۸	استفسارات	۶۱	حالی اور شاعری
۹۲	معلومات	۶۷	تحفہ محبت (فسانہ)
۹۶ و ۹۵	استہارات	۷۱	لکھنؤ کی پھیتیاں
		۷۹	لاڈل پرن کا عہد حکومت

فہرست سے مقابلہ کرنے کے بعد رسالہ پوسٹ کیا جاتا ہے اور کوئی دیر نہیں ہو سکتی کہ قصداً یا ایسی احتیاط کی صورت میں سو اگسی کے نام کا رسالہ روانہ نہ ہو، اس لئے اب رسالہ گم ہونے کے جو اسباب ہو سکتے ہیں ان میں سے ایک ڈاک کی بد نظمی ہے جس کا علاج صرف یہ ہے کہ ہر مہینے جب رسالہ نہ پہنچے تو اپنے مقامی ڈاک خانہ کو اطلاع دیجئے اور یہیں بھی مطلع کیجئے تاکہ ہم بھی حکمہ ڈاک کو لکھیں۔ دوسرا سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض حضرات اپنا پتہ غلط یا ناقص لکھتے ہیں۔ ڈاک خانہ و مقام کا نام لازماً انگریزی میں لکھنا چاہئے۔ تیسرا سبب یہ بھی ہوا کرتا ہے کہ بعض حضرات کی ڈاک کا انتظام درست نہیں ہوتا اور رسالہ دوسرے ہاتھوں میں پہنچ کر ضائع ہو جاتا ہے، ہوشلوں، لائبریریوں، اسکولوں اور کالجوں سے جو شکایت رسالہ نہ پہنچنے کی آتی ہے اسکا سبب اکثر دہشتہوی ہوتا ہے۔ جس میں اس مرتبہ خصوصیت کے ساتھ اس کا ذکر اس لئے کیا کہ کبھی کبھی یہ تکلیف دہ اور وقت ضائع کرنے والے واقعات میرے کانوں تک بھی پہنچ جاتے ہیں۔

یونپ کی ہندوستانی اکاڈمی نے سال رواں کے لئے پانچ ہزار دہیرہ جدید تصانیف کے لئے منظور کیا ہے اور دو ہزار بہترین کتاب کے لئے یہ بھی طے ہوا ہے کہ ہندو اور مسلم عہد کی ادبی، تمدنی، اخلاقی و سیاسی تاریخ پر دو کتابیں مرتب کرائی جائیں جس کے لئے کسی اہل ادب کا انتخاب زیر غور ہے۔

اردو نشر اور دو نظم کے دو بہترین کتابوں پر بھی علیحدہ علیحدہ دو انعام تجویز کئے گئے ہیں اور سربج بہادر سپرو نے ایک ہزار دہیرہ اپنی طرف سے اس ادیب کی خدمت میں پیش کرنے کا وعدہ کیا ہے جو ہندوستان کے اسلامی عہد کی معاشرتی اور تمدنی حالت پر تین خطبے پڑھے۔

”اکاڈمی“ بھی ایک ہزار دہیرہ اس شخص کو دیگی جو تین خطبے اس کے مقرر کردہ موضوع پر دیگا۔

اس مہینے طنز و بات کا مضمون ختم ہو جاتا ہے۔ جناب اسی نے ایک ایسے موضوع پر قلم اٹھایا جس پر اس سے قبل کسی نے طبع آزمائی نہیں کی تھی۔ ہر چند بعض جگہ تعریفات و تقسیمات سے مجھے اختلاف ہے۔ لیکن نفس مضمون کی ندرت سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور امید کی جاتی ہے کہ اب اس بنیاد پر زیادہ محققانہ مضمون لکھنا آسان تر ہو جائیگا۔ خواجہ عشرت لکھنوی کا مضمون لکھنؤ کی چیمبریں پر نہ صرف جمع واقعات بلکہ صحت واقعات کے لحاظ سے بھی قابلِ داد ہے۔

مجنون کا افسانہ حسن شاہ انسان کی قوت خیال کی قدرت کو ظاہر کرتا ہے کہ اگر وہ چاہے تو زمانہ میں بھی ٹھہرا پیدا کر سکتا ہو وہ لوگ جو جناب مجنوں کی طرح خیال پرست ہیں اس افسانہ سے بہت لطف اٹھائیں گے، خواہ وہ کتنا ہی ”گریزا“ کیوں نہ ہو۔ میں یہ ماننے کے لئے تیار ہوں کہ خیال پرستی کی ارتعائی صورت ”عبادت“ ہو سکتی ہے۔ لیکن ایک خیال پرست کبھی ”معبود“ نہیں بن سکتا۔

کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر منگانا چاہئے۔

دوسرا افسانہ ”جواہرات کی چوری“ ہے جس کا ایک حصہ اس جینے کے رسالہ میں شائع کیا جاتا ہے، دوسرا حصہ جیسے انکشاف جرم کو ظاہر کیا گیا ہے آئندہ جینے میں شائع ہوگا۔ اس کتاب جرائم اور سراغ رسانی کے متعلق جدید ترین انداز افسانہ نگاری ہی ہے جو اس میں پیش کیا گیا ہے جزئیات جرم کے لحاظ سے انکشاف جرم کے واقعات کو ان پر منطقی کرنا۔ یہ گویا افسانہ نگاری کا ”لف و نشر“ ہے۔ تیسرا افسانہ ”تحفہ محبت“ جتنا مختصر ہے اسی قدر پر لطف ہے۔ مولوی حامد حسن صاحب قادری نے ترجمہ میں اصل زبان کی کیفیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور ترجمہ کی خوبی یہ ہے۔

حالی اور شاعری پر سید اعجاز حسین صاحب کا مضمون ختم ہوتا ہے لیکن افسوس ہے کہ میں اس کو حد درجہ تشنہ کہو بھگا۔ حالی کی شاعری پر اس سے زیادہ غایر نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے۔ سلسلہ کے مضامین میں فراست الید اور اکبر جاری ہیں۔ غالب کا ذوق فارسی اس مرتبہ درج نہ ہو سکا۔ ”اور لارڈ پرین کا عہد حکومت“ سنی کے بعد اب پھر شروع ہوتا ہے ابھی اس کے کئی نمبر باقی ہیں لیکن اب بلا انقطاع ان کو ختم کر دیا جائے گا۔

میں انتشار و ماغ کی وجہ سے کتب موصولہ پر عرصہ سے ریویو نہیں کر سکا، حالانکہ بعض کتابیں ایسی تھیں جن پر مجھے جلد توجہ کرنی چاہی تھی مثلاً ڈاکٹر عابد حسین صاحب پر وینسر جامعہ ملیہ کی ”تاریخ فلسفہ اسلام“ حضرت ہوش بلگرامی کا مجموعہ مضامین ”عروس ادب“ یاسید محمد صاحب قادری ام۔ اے کی ”دنیا کے افسانہ“ ان میں سے ہر ایک کتاب تفصیلی تبصرہ چاہتی ہے اور حالت یہ ہے کہ میں نقدی فرصت کی وجہ سے ان پر ایک سرسری نگاہ بھی نہیں ڈال سکا۔ میں مصنفین کرام کی خدمت میں یہ معذرت پیش کرتے ہوئے وعدہ کرتا ہوں کہ بہت جلد اس فرض سے سبکدوش ہونے کی کوشش کروں گا۔

”نعت اسلامی“ جس کا ذکر اس سے پہلے کسی اشاعت میں کر چکا ہوں، نگار مشین پریس میں چھپ رہی ہے، جو حضرات اس مفید کتاب کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں وہ ابھی سے اپنا نام دفتر نگار میں بھیج دیں۔ یا براہ راست سید حامد حسین صاحب رضوی اکسائز سب انسپکٹر پریس محل (برار) کو اطلاع دیدیں کیونکہ اس صورت میں وہ خاص رعایت کے مستحق سمجھے جائیں گے۔

جذبات بھاشا ساردو ملیش موضوع کے لحاظ سے پہلی کتاب ہے ہندی شاعری کی بمثل نمونے اسی کتاب میں مل سکتے ہیں، خریداران نگار کو مع حصول ۸ میں اور گولوں کے لئے مع حصول ۷ میں۔
(منیجر نگار نظیر آباد لکھنؤ)

عق کیوڈہ صفر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہمیشہ عطر لکھنؤ

طنزیات اور اردو زبان

(گزشتہ سے پیوستہ)

فقہہ چست کرنا | یہ بھی طنز کی ایک قسم ہے اور اس کی تعریف قریب قریب آواز سے ملتی ہے اس میں کسی استعارہ یا تشبیہ کا ہونا ضروری نہیں ہے مختصر تعریف یہ ہے کہ بر محل کوئی ایسی بات کہی جائے جو یا تو کسی کے اعتراض کا جواب ہو، یا کسی کی ہجو ہو، یا براہ راست دوسرے کے عادات و اخلاق پر کوئی تعریف کر کے اس کی نکتہ چینی یا تحقیر کی جائے اس میں کبھی کبھی متانت بھی شریک ہوتی ہے ورنہ اکثر رمز و کنایہ اور شستہ ظرافت پر اس کی بناء ہوتی ہے۔ فقہہ چست کرنا بیکار و ہمیشہ دل آزاری ہی پر مبنی ہوتا بلکہ کبھی اس سے صرف ظرافت کبھی دوسرے کی ہجو اور تعریف کبھی اپنی مدح کبھی طعن و طنز اور کہیں دوسرے کو بوقوف بنانا کہیں قریب دیکر اپنا مطلب نکالنا مقصود ہوتا ہے مولوی اسماعیل نے جب جہاد میں شکست کھائی تو توشاہ نصیر نے ایک قصیدہ کہا جس کا ایک شعر ہے:-

ہر کی طرح میدان و غام میں چوکری ہوئے اگر چہ مخم دم شملہ سے وہ شیر نیشانی

چونکہ اس شعر میں ایک تشبیہ ہے اس واسطے آبادی النظر اسپر بھیتی کا دہو کہ یا گمان ہوتا ہے۔ مگر دراصل مولوی اسماعیل مرحوم پر ایک فقرہ چست کیا گیا ہے جس میں انکی حماقت کا اظہار ہے

مومن قریب دینے اور اپنا مطلب نکالنے کے لئے کہتے ہیں۔

شوخی کتاب ہے بے حیا جانا دیکھو دشمن نے تم کو کیا جانا
صرف تحقیر کی مثال یہ ہے۔ چاہتے ہیں خود بدیوں کو آس آپ کی صورت تو دیکھا جاتا ہے
بقائے میر تقی میر پر یہ فقرہ کہا:-

میر صاحب پر اس سے کیا بہتر۔ اس سے ہووے جو نغم شاعر کا۔ لیکے دیوان بکارتے پھرے۔ ہر گلی کوچہ کام شاعر کا
دوسری جگہ بقائے یوں مخاطب کیا:-

پگڑی اپنی منجھلے گا میر اور بستی نہیں یہ دلی ہے
ریاض الحکایات مصنفہ کاشانی میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ شیطان نے فرعون کے دروازہ پر کنڈی کھٹکھٹائی فرعون نے پوچھا
کون ہے۔ شیطان نے فقرہ چست کیا کہ واہ خدا کی کا دعویٰ اور یہ معلوم نہیں کون ہے۔
مندرجہ بالا فقرہ سے ظرافت اور ہجو دونوں مقصود ہیں۔ حجاب اور بد تعریفی ملاحظہ ہو۔

لقمان کی بد صورتی پر کسی نے تمسخر کیا۔ انھوں نے یہ فقرہ کہا تو نقش پر ہنستا ہے یا نقاش پر۔ اتھنر کے مفہور مقین ہوکن کا لڑکا مر گیا وہ اس کے غم میں بہت رو دیا۔ کسی نے کہا کہ رونے سے کیا حاصل ہے وہ واپس نہیں آ سکتا۔ کہا اسی لئے روتا ہوں۔

لیونا "ڈو" اسپاٹا کا بادشاہ تھا اس نے جب ایران کے بادشاہ اردشیر بہمن کا مقابلہ درہ ترموپائی پر کیا تو ایک سپاہی نے اندیشہ ظاہر کیا کہ دشمن کی فوج اس قدر ہے کہ تیروں کی بوجھار آفتاب کو ڈانک لیگی لیونا انڈز نے کہا "تو اچھلے ہم سایہ میں لڑیگا" ایک اسکول کا ماسٹر فخر سے کہہ رہا تھا کہ میں نے ہومر کی غلطیان درست کی ہیں اسی میڈیسن نے کہا۔ تو آپ بچوں کو کیوں تعلیم دیجی ہیں مردوں کو تعلیم دیا کرو۔

ایک بہت لمبا شخص کسی انار دالے کی دوکان پر پہونچا اناروں کو دیکھ کر کہا کہ بہت چھوٹے ہیں۔ انار دالے نے کہا "حضرت بیٹھ کر دیکھئے"

عصۃ کی گفتگو | یعنی ایسی گفتگو صہبن اپنے رنج کا بھی اظہار ہوا درد دوسرے پر بھی رنج کا اثر مترتب کرے اسین طعنے طنز شکوہ۔ شکایت۔ مخاطب کی عیاری بیوقوفی وغیرہ کا اظہار کر کے اس کو بھی مشتعل کیا جاتا ہے۔ مگر یہ گفتگو ہجو کے طرز سے باکل علیحدہ ہوتی ہے کہیں اس میں اپنی کمزوری کا کہیں اپنی دلاوری اور فخر کا کہیں دیکھوں اور دباؤ کا اظہار ہوتا ہے کبھی فلک کو بڑا دل جلونے کا مہین جلا کے خاک نہ کر دوں تو داغ ناغیں اس میں داغ کو رنج پہونچو اور اس کے بعد بہادری کا اظہار بھی ہوتا ہے فلک کی ہجو کا یہ پہلو نکلتا ہے کہ اتناک ایسے وایسوں سے کام پڑا ہے کسی دل جلے کو نہیں دیکھا۔

اب کی کچھ منہ سے کالائو تھیں ناوگے داغ بھر جھکونہ کہنا جو براہ کچھوں اسین بھی پہلے مصرع سے کسی گفتگو سے رنج پہنچے کا اظہار ہے اس کے ساتھ ہی اپنی بیباکی کا اعلان یہ حسن ثنوی سحر البیان میں اس جگہ جہاں ماہرؔ کو یہ معلوم ہوا کہ میرا معشوق شانزادہ بے نظیر کسی اور پر عاشق ہو گیا ماہرؔ کی زبانی یہ عصۃ کی گفتگو کرتے ہیں۔

وہ آگے تو آئے مرے نا بکار گریباں کو اس کے کردن تاناہار
یہی قول و قرار تھا میرے ساتھ بھلا اس کا دامن ہے اور میرا
ہمارے بزرگوں نے ہر سچ کہا کہ ہیں آدمی زرا دل کل بیوفا
اتنے میں بینظیر آگیا اس کو دیکھ کر یہ گفتگو کی:-
بلاسی وہ دیکھ اس کے پیچھے پڑی کہا سن تو اوموڈی مدعی نو

تجھے سیر کو میں نے گھوڑا دیا کہ اس مالزادی کو جوڑا دیا
الگ ہے یوں رہنا اور چھوٹا یہ اد پر ہی اد پر مڑے لوٹنا
چلکا دیا تھا نہ تو نے یہی بہلا اس کا بدلہ لے لوں تو نہی

مندرجہ بالا سات شعرون میں پہلے شعر میں صرف جذبات غضب کا دوسرے میں غضب کے جذبات انفسوس کے ساتھ تیسرے
شعر میں انفسوس اور نصیحت کا بولنے ہوئے جذبات غصہ کا اظہار کیا ہے آخری چار شعرون کے پہلے میں صرف غضب و غصہ دوسرے
میں اعتراض اور طعنہ تیسرے میں آوازہ چیتے میں واقعات کا اظہار اور اظہار غضب و غیرت کیا گیا ہے۔ ثنوی ظلم الفت میں جب وزیر
حسن اباد شیدائی تقریر کرنا شروع کیا تو بادشاہ کے پاس واپس گیا اور وہاں جا کر اس نے شیدائی کی تقریر کا اعادہ کیا ہے تو بادشاہ حسن آباد اس کے
جواب میں کہتا ہے۔

ہاں کو جیل فوج ہو تیار مابدولت کے لاؤ تو ہتھیار دیکھیں تو کتنا حوصلہ دے ہے عوام مقابلہ سواست
وہاں دکھلانے کو یہ آیا ہے ہم کو کیسا موم کا بنایا ہے بادشاہ اس کا کیا ہو یہ کیا ہو کثرت فوج پر یہ بھولا ہے
ان سب شعرون میں صرف غصہ کا اظہار ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اپنی جرات مبادری اور دلاوری کے بھلو دکھائے
گئے ہیں۔ ثنوی گلزار نسیم میں حالہ دیونی (جسکی وجہ سے تاج الملوک کو گل بجاؤ لی ملا تھا) اور بکادی کی گفتگو کا یوں نقشہ کھینچا گیا ہے
بکادی نے کہا ہے بولی کہ اری مجھے خبر ہے گلچین مر اكونا بشر ہے
حالہ :- بولی وہ کہ صدقہ ہوں بلا لون بن دیکھے کسی کا نام کیا لون
بکادی پھر کہتی ہے تیرا ہی تو ہے فساد مردار داماد کو گل دیا مجھے خار
اسی طرح جب بکادی نے تاج الملوک کو اول اول بلایا تو یہ گفتگو کی

کیوں جی تمہیں گئے تھے وہ گل کیا کہتی ہوں میں ادھر تو دیکھو میری طرف اک نظر تو دیکھو

ہے یا نہیں یہ خطا تمھاری فرما لے کیا سزا تمھاری
ثنوی لیلیٰ عنون ہاتھی میں جب لیلیٰ کی ماں کو یہ خبر ہوئی ہے کہ یہ بھی قیس سے کچھ گاؤ رکھتی ہے تو وہ نہایت خفا ہوئی اور
لڑکی سے یہ گفتگو کی

اے اور من رداست اینہا در چو توئی سزست اینہا ناموس مرا بباد دادی در سر ز نشعب فتادی
دارانے جب سکندر سے خراج مانگا ہے اور اس نے انکار کیا ہے تو دارانے لکھا :-

تو اے طفل ناچختہ و خام رائے مزن پنجہ باغیر تنگ آڑا ہے ہم بجلی بامنست یار کو سپاہت کجا و سپہدار کو
جو کز دم بوی مار خوبی کنی کہ با اثر دبا جنگ جوئی کنی ہماں بہ کہ ای سرور رویان بہ بندی جو مند و بخت میاں

کین غصہ میں ایسے الفاظ بھی کہے جاتے ہیں جنہیں دوسروں پر طنز کیا جائے اور اپنے رنج و افسوس کا اظہار کرتے ہوئے
حریف کے جذباتِ حزن کو برا لگھنہ کیا جائے جیسے فتویٰ زہر عشق میں ایک جگہ مان کی نعلی اپنے بیٹے پر یوں ظاہر کی گئی ہے
اگر آئیں سے ہم تو یوں پالین آپ سہت میں جی کو یوں ڈالین

کبھی غصہ کی گفتگو میں مخاطب سے نفرت کا اظہار اور اس کو احمق بنانا مقصود ہوتا ہے جیسے فیضی اپنی فتویٰ نظم میں اس وقت
جب طیب صبح کی وقت نل کی نبض دیکھنے گیا ہے نل کی زبانی غصہ کے ضمن میں طیب کی حقارت اور انہی نفرت کا اظہار کرتا ہے
نل گفت کہ اسے طیب نادان رنجم مفراسے بامدادان فتر چہ زنی رگ جنوں را آگاہ نہ تب دروہی را
چستے بہ دل مشوش انداز قارورہ بہ بردر آتش انداز

زجر و توبیخ کی گفتگو بھی تقریباً غصہ ہی کی موافق ہوتی ہے مگر اس میں اتنا فرق ہوتا ہے کہ صرف مخاطب ہی کی کمزوریوں وغیرہ
کا اظہار ہوتا ہے اور اسی پر طنز و تشبیہ کی جاتی ہے قابل اپنی بہادری اور فخر و مہمات کے پہلو کو کہیں بھی نظر انداز نہیں کرتا
اپنے مخاطب سے ایسے الفاظ کہتا جسے اس کو افعال یا اقوال پر شرم آئے اور اس کے جذباتِ غیرت و غصہ و
رج مشتعل ہوں۔ اس میں بھی طنز طعنہ و جو وغیرہ شامل ہوتی ہیں۔ اس گفتگو میں واقعات کا اظہار اکثر ہوتا ہے
مگر تشبیہ و استعارہ سے بہت کم کام لیا جاتا ہے۔ مگر کہیں تمسخر کا ملامت میں جو وغالب رہتا ہے جیسے میر ایک جگہ کہتے ہیں۔
یوں بکاریں ہیں مجھے کوچہ جاناں داے ادھر آئے اچھا گریباں داے

کہیں اپنے عجز اور بری الذمہ ہونے کے ساتھ دوسرے کو ملامت کی جاتی ہے جیسے میر کہتے ہیں۔

مجھی سے ہیں اسے میر بہ خواریاں نہ بھائی ہماری تو طاقت نہیں

کہیں طنز یہ کسی واقعہ کا اظہار کے ملامت کی جاتی ہے۔ غالب ایک جگہ کہتے ہیں۔

دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی ہو گئے عشق سچے تھے مانع میر صاحب مجھے آئینہ دیکھ اپنا سامنے لیکے رہ گئے صاحب کو دل نہ دینو پہ کتنا غور تھا
میر پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں اس عاشقی میں عورت سادات بھی گئی

لامت کے ساتھ مخاطب کے حق کا اظہار

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہو جسکے سبب اسی عطار کے لڑکے سو دوا لیتے ہیں

کسی کی کمزوریوں کا اظہار کرتے ہوئے ملامت کرنا۔

آج پھر داں نے حشیت میر تھا کل لڑائی سی لڑائی ہو چکی

سو دوا پھر اور تمسخر کے پہلو کو غالب رکھ کر ایک لڑکے کو ملامت کرتے ہیں۔

صغریٰ علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر خرید کرنا چاہتے

لڑکی وہ جو لڑکیوں میں کیلے
نہ کہ لڑکوں میں ڈنڈ پیلے
کبھی افسوس کا پہلو غالب رکھتے ہوئے ملامت کیجاتی ہے۔

حسرت موہانی
سودا

عشق تیاں کو جی کا جبال کر لیا ہے
سودا قمار عشق میں شیریں سے کوئیں
حسرت یہ تو نے اپنا کیا حال کر لیا ہے
بازی اگر چہ پانہ سکا سر تو کھوسکا
کس منہ سے بھر تو آپ کو کتنا ہے تشقباڑ
خانہ خراب بچہ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

کبھی کسی کے حالات بیان کر کے بغیر تنہا طب کسی غیر متعلق شخص سے ملازمت کیجاتی ہے۔

- میرے مہر کے بن دھبہ کو تم کیا پوچھو ہو ان نے تو قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا لک کا ترکہ سلام کیا

غرض کہ ملامت کے اسی طرح سے مختلف طریقہ ہیں مگر ہر صورت میں یہ ضروری ہے کہ طنز اور جھوٹ وغیرہ کا پہلو شریک رہے جیسا کہ مندرجہ بالا مثالوں سے ظاہر ہے۔

ہجرجا وہ گفتگو جس میں طنز - طعنہ - ملامت غصہ - رمد و کٹنا یہ - بھینتی تسخر وغیرہ وغیرہ سب چیزیں شریک ہوں اس کو ہجو کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے مگر یہ ضروری نہیں ہے۔ کبھی کبھی صرف ایک ہی چیز پر ہجو کی بنا ہوتی ہے۔ کبھی یہ سب چیزیں اس میں ہوتی ہیں جو کہ مثالیں گزشتہ سب مثالوں سے اخذ کیا جاسکتی ہیں۔ ان کا علاوہ لکھنا تھخیل حاصل ہے۔ مگر ہجو بھی ہم چند جدید مثالیں جا بجا سے اخذ کر کے درج کرتے ہیں۔ میر تقی میر ایک بڑی خوبی کی ہجو کہتے ہیں۔

ایک پر نور آستانہ ہے پیر
صد منی دیگ ہے حکم اس کا
آنت فیضان کی ہے اسکی آنت
خستہ جوع وہ آدے نہار
خسکست پوچھ کھانے کا ہے بی
گال کچے سے بھرتوے سیاد
توند کالی جو کھول جاوے لیٹ
کھانا نکلے برآوے ہے کیسے

سینہ سوراخ جس سے ہے کفگیر
نفس اژدہا ہے دم اُس کا
دانت اسکا ہے ہاتھی کا سازات
منہ ہے گویا کدخم دامن دار
منہ چھپپوں سے جیسے روٹی جلی
کاسہ سر ہے جیسے اوندہ ہاکڑا
آہنی ہے تنور اس کا پیٹ
جیل ٹوٹے ہے گوشت پر جیسے

سودا اپنے زمانہ کے کو تو ال شیدی خاں کی ہجو کرتے ہیں۔

شہر میں کیا ہے تھا امن امان کیسی کرتی تھی خلق خوش گزراں

اب جہاں دیکھو د اں جھنگا ہے چور ہے ٹھگ ہے اور اچکا ہے
کس طرح شہس کا نو یہ حال شنیدی فولاداب جو ہے کتوال
چورک اس کا زور مانے ہے کالا بال اپنا اسکو جانے ہے
سودا اپنے معاشرہ صناحک کی جھوکہ کے یوں ہنسی اڑاتے ہیں۔

کنکری چنے پر ہے اب گزراں مدہ اس کا ہے مرغ کا نگہ ان
اور ایک جگہ صناحک کی جھوکہ میں اور تسخر کے ساتھ کچھ واقعات بھی لکھتے ہیں

صناحک کی اہلیہ نے ڈھول بجز گڑیا بیوجہ رات ساری ہساروں کو جگایا
بیٹھک میں بیٹھ بڑھے چونڈ کو جگایا تب شیخ سدواس پر غصہ کو کہا کے آیا

بولاکہ کیوں ہے صناحک بکر کوئی منگایا
صناحک نے تب کہا بون تنزبانگانی بے آج کو کہا ہے کل دگے جھکو کالی
بکرے کی شکل عیاں نے گوری ہرنکالی بی بی کو اور تم کو گھر کر دیا ہے خالی

بکرادہ دگنی تم کو جن نے کہ سر چڑھایا
میرا یہ سن کے بولے پھر کیوں کہا جی میں اس سوانہیں کچھ اور حرف جانا جی
بکر اگر ملے آیا چھوڑ دنگا کر چچا جی کالی تو اک طرف ہے یہ سن رکھو بچا جی

ہائے ہے ڈھول دہپا میں تم کو کہہ سنایا

اور کسی جگہ کسی غریب بڑھے کی خبر لے ڈانی ہے ان کی نئی نئی شاہی ہوئی تھی سودا کو یہ بتا جو بڑ دیکھ کر مذاق ہانڈ آیا لکھتے ہیں :-

جب گنڈو وہ ہنکے چلے ہے ٹلکتی چال آتا ہے شیخ جی سے تیں اس صدا پر حال
عامر سے پھینکے ہو جاتے ہیں ٹلہال تب مہربانگی سے یہ کہتی ہے وہ چھنال

اب ہم کو اپنی جاہ جتاتے ہیں شیخ جی

اک روز شیخ جو کو جو رسوا جاڑے کہنے لگی کہ تم ہو بڑوں کے میرے بڑے
بہناب ڈھپہ رکھو کہیں جو کا نہ گر پڑے ڈرتا نہیں ہے مجھ سے تو اکر بڑو نہ سڑے

کہہ دن ابھی دواسے ستلے ہیں شیخ جی

ہجو ملیج بھی جھوکہ کی ایک قسم ہے اور بہ نسبت صریح ہجو کے طنز سے اس کا تعدیل زیادہ ہے ہجو ملیج سے مراد یہ ہے کہ قائل

کچھ ایسی باتیں کہ جو بہ ظاہر تعریف معلوم ہوتی ہوں مگر اصل میں وہ جھوٹوں
میرا مرانے ہم عصر کی اس طرح تعریف کرتے ہیں۔

ایک بیک گھر کسی کی موت آئی اسکے مرد کو کی پھر ہے رسوائی
کیونکہ بیوی بچی ہے جن کو امرا کی سب سے اولاد کا قلم طائی
کون دیکر کفن اٹھاوے لاش

اولاد کا قلم طائی سے تمام بُرائی اور بخل وغیرہ کا دفتر کھول دیا گیا جعفر علی خان فصیح کا یہ شعر بھی اس قسم میں داخل ہو سکتا ہے
مجھ میں ایک عیب بڑا ہے کہ وفا دار نہیں تم میں دو صفتیں بد خو ہو جھٹکا بھی ہو
سودا ایک شخص کی جو بلیغ اس طرح کرتا ہے۔

دار احمد نگر ایک ہیں مرد عسکر نر فہم ہیں سر تا قدم اور سر با تمیز
شعر پہ ہر ایک کہہ کرتے ہیں وہ اعتراض جامی کے دیوانے خوب جائیں ہیں پی بیاض
منیر کا یہ شعر بھی جو بلیغ کی ایک عمدہ اور بہتر مثال ہے۔

عدالت ان دنوں ایسی بڑا بی زمانے نے کہ شمشیر و گلو پیتے ہیں ایک ہی گھاٹ پر بانی

بولی ٹھولی طنز کی ایک قسم ہے زیادہ تر یہ قسم عورتوں کی زبان میں داخل ہے مگر مردوں کی زبان میں بھی اس کا دوسرا مستقل نام
رکھنا مناسب نہیں۔ بولی ٹھولی کے معنی یہ ہیں کہ کچھ ایسے الفاظ مخاطب کے جائیں جن کے بظاہر کچھ اور معنی ہوں
یعنی یا تو الفاظ قدر تعریف سے سیر ہوئے ہوں کہ اُس آدمی کے مرتبہ اور عزت سے بالاتر ہوں یا وہ کچھ ایسے لہجے میں
ادائے جائیں اور ایسے انداز سے کہے جائیں جو اپنے معانی کو اٹھا ظاہر کریں اور اپنے اصلی معانی و مقوم سے جدا ہو کر قابل کی حسب
کام کرنے لگیں۔ یا ان میں رمز و کنایہ شامل ہو۔ مگر ہر صورت میں ان الفاظ سے مخاطب یا کسی شخص کی ہلکی سی جو ہونا ضروری ہے۔
کبھی بولی ٹھولی کے ذریعہ سے مخاطب کی ایک ظریفانہ رنگ میں ایسی تحقیر کجائی ہے جس سے اسکو رنج نہ ہو بلکہ ایک قسم کی شرمندگی
ہو طبیعت میں اور اس میں ہی فرق ہے مثلاً انشا کہتا ہے۔

بلاتے اگر آئی ہوئی کہا رو نہ مجھ سے کرو بولی ٹھولی کہا رو

ظاہر ہے کہ ہونی میں ہنسی مذاق ہوتا ہے نہ کہ ہونی کی تقریب کیوجہ سے دو دوستوں میں تشفی۔ طعنہ اور طنز و مخالفت کا بانار
گرم ہوتا ہے۔ لہذا انشا کے مندرجہ بالا شعر سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ جا بجا کی مذاق اور فطرت باتوں باتیں چھیڑ چھاڑ کرنا بھی
بولی ٹھولی میں داخل ہے۔ فاضل آزاد میں حسن افزا - روح افزا ہمارا لفظ ایک جگہ مروجہ ہیں ہمارا لفظ کو ذرا اپنے سنورنے کا

نمودہ شوق ہے جو کچھ دور پر آئینہ دیکھ رہی ہے۔ روح افزا اور حسن افزا میں باہم اس عیب کے متعلق رائے زنی ہو رہی ہے جب بہار انسا بن سنور کر آئینہ دیکھ کر آتی ہے تو ان دونوں میں یہ باتیں ہوتی ہیں۔

حسن افزا (روح افزا کے کان میں) ”ہمارا انسا بہن اسوقت خوب نکمر کے بن ٹھن کے آئی ہیں“
روح افزا کہتی ہے ”تم نے کیا دیکھا ان کو“ پہلے دو چار بار دوپٹہ سنبھالا پھر چوٹی کو درست کیا اور پھر آئینہ کے قریب سامنے جا بیٹھیں ان کو تو عرض ہے یہ امی جان تیر لو کتنی رہتی ہیں“

اب بہار قریب آ جاتی ہے اور کہتی ہے کیا باتیں ہوتی ہیں چپکے چپکے ہم بھی کچھ سنیں میرا ہی ذکر ہو گا۔
حسن آرا ہنستے ہوئے ”بہن آج آئینہ کے پاس آپ کم بیٹھیں“ یہ فقرہ بولی ٹھولی کے تحت میں آ بیگا۔
نواب سراج الدین خان ساہل دہلوی کے شعر ہیں :-

دریغ نہ چوٹ تھا تجھ کو ہونی چوری کچھ ٹوٹے ہوئے نیشہ ہیں کچھ چوڑیا ہیں
گمان کسپر کرین میکش ادھر صوفی ادھر اعظا خدا رکھے محلہ میں سبھی اللہ والے ہیں

کے الزام دے کوئی کمر خاموش ہو گئے اور جن لوگوں کو الزام دیا گیا ہے وہ اسی سے دیا گیا ہے۔ یعنی ہمارے محلہ میں تو کوئی بھی چور نہیں مطلب یہ کہ یہ سب چور ہیں۔

شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب کو ہمیشہ یہ تمنا رہی کہ علاقہ کابل بلخ و بدخشان وغیرہ فتح کر کے شامل مملکت ہندوستان کر لیا جائے اس کے لئے کوششیں بھی کی گئیں مگر ناکامی ہوئی۔ اسی خیال سے بولی ٹھولی کی صورت میں محمد معظم بڑے شاہزادہ کو لکھتے ہیں :-
رفقہ۔ ہمیں پور خلافت بوجہ رسید کہ آنفرزند گاہداشت سپاہی نائید و نوکراں بیش موجب نگاہ میدارند (ظاہراً قصد قندھار داشتہ باشند خدا تو رفیق رفیق سازد) یہ فقرہ طعن کے طریقہ پر لکھا گیا اور ان کی کم ہمتی پر ان کو شرمایا گیا ہے۔

اسی طرح میرا ایک شعر ہے :-

بزمِ عدم میں آپ تھے کوئی ادب تھا بچ ہے ہری نگاہ نے دھوکا دیا مجھے
داغِ کتنا ہے تم تو اچھے ہو جلو ہم سے وفا تم نے تو کی
اس کو صرف بولی ہی کہا جاتا ہے جیسا کہ انشا ایک جگہ کہتے ہیں۔

میں تو کچھ کھیلی نہیں ہوں ایسی کچی گویا جو نہ سمجھو گی زناخی خان تمھاری بولی

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کسی بات کو کسی دوسرے شخص پر ڈھال کر کشا بھی بولی ہے۔ کبھی ایسی تعریف کی جاتی ہے جو جو بلیج کی صورت سے ہوتی ہے مگر اصل میں اس کو بھی بولی کہا جاسکتا ہے۔ جیسے سو دالے ایک جگہ مولوی عدت کفیر کی رزائی کے

متعلق لکھا ہے۔

بدقت میتواں نہیں سید معنی ہاؤنا زاد کہ شرح حکمت العین است مرثکان درازاد

بعض لوگ غلطی سے بولی کے ساتھ ٹھٹھولی کہتے ہیں مگر یہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ ٹھٹھولی ایک بیعنی لفظ ہے جو تابع حمل کی طرح بولی کے ساتھ بولا جاتا ہے اور ٹھٹھولی علیحدہ لفظ ہے۔ جو مذاق اور ہنسی کے معنی میں مستعمل ہے۔ جیسے سید انشا انشا انشا ایک جگہ لکھتے ہیں کہ میں نے ہنسکر ہلایا کہ نہیں تو ہنسکر کی ان نے ٹھٹھولی کہا رو

و شخصوں میں خواہ وہ دوست ہوں یا دشمن ایسی گفتگو ہونا جنہیں کچھ رمز و کنایہ۔ کچھ طنز و طعن۔ کچھ آوازے کچھ شکوہ و شکایات ملی ہوئی ہوں نوک جھوک کہلاتا ہے۔

نوک جھوک

مرزا جب علی بیگ سردار نے اپنی مایہ ناز تصنیف فیاض عجائب میں اس جگہ پر لکھا ہے جہاں شاہزادہ جان عالم جادوگری کی قید سے چھوٹ کر ملکہ، مہر نگار کے باغ میں پہنچا ہے۔ شام کا وقت تھا ملکہ مہر نگار کی سواری آرہی تھی خواصوں نے دیکھا کہ آج غیر مرد بلخ میں بیٹھا ہوا ہے سواری روک دی گئی اور ایک اپنی بچہ کی موافق جان عالم پر رائے زنی کرنے لگی۔ سواری کے رکنے پر ملکہ کو کھل حال معلوم ہوا تو حکم دیا کہ دریافت کر لیں کون ہے کہتے ہیں:-

ایک خواص باشارہ ملکہ آگے بڑھی۔ پوچھا کیوں جی میاں مسافر تمہارا کدھر سے آنا ہوا۔ اور کیا مصیبت پڑی ہے جو اکیلے سوائے اللہ کی ذات کے جیہاں نہ کوئی سنگ نہ سات اس جنگل میں وارد ہو، شہزادہ نے مسکرا کے کہا کہ مصیبت خیلانچہ پر پڑی ہوگی، معلوم ہوتا ہے یہاں آفت زدے ہی آتے ہیں کو تم سب کی کیا کم بختی، آیا میں کی گردش نصیبوں کی سختی ہے، جو چڑیلوں کی طرح ناکام سرشام پھرتی ہو۔

ملکہ یہ سنکر بچھڑاک گئی اور بولی، واہ صاحب تم بہت گر باگرم تنہا مزاج حاضر جواب ہو، حال پوچھنے سے اشنا برہم ہو کر کڑا فقرہ سنایا کہ اس مردار کے ساتھ، مقوقہ، منہ چھٹ سکے پچھلیاٹیاں بنایا، جان عالم نے کہا اپنا دستور نہیں کہ ہر کس و نا کس سے ہمکلام ہوں۔ دوسری مردار سے بات حرام ہے مگر خیر دہو کے میں جیسا اس نے سوال کیا، ویسا ہم نے جواب دیا اب تمہارے منہ سے مردار نکلا ہم سمجھے چپ ہو رہے، ملکہ نے ہنسکر کہا خوب ایک فشد و شد۔ صاحب جو بچ سنھا لو۔ ایسا کلمہ زبان سے نہ نکالو کیا میرے دشمن و رگومردار خور ہیں۔ ہلا وہ تو کہہ کے سن چکی میں آپ سے پوچھتی ہوں حضور کس سمت سے رونق افروز ہوئے دولت سرا چھوڑے کے روز ہوئے اور قدم مینمت لڑو ہم اس دشت پر غار کو کیوں رشک لالہ زار کیا؟

جان عالم ”چہ خوش آپ در پردہ بنائی ہیں۔ بگڑا کر طنز سے یہ سنا تی ہیں۔ ہم حضور کا ہے کو مزہ دہیں، تم جو جیتے جی چار کے کا ندھے پر سوار ہو البتہ حضور ہو۔“

عرفی گلاب صہفر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگانا چاہئے

ملکہ ”اے صاحب کچھ منہ سے بولو سر سے کھیلو نذر ہمیں جو چاہو لے لو“

جان عالم ”اے اہل بیت کو کام نذر ماؤ نیچے آؤ معلوم ہوا تم بڑے آدمی ہو۔ سواری مانگے گی میں ہے خواص بھی تمھاری ہیں خاک نشینوں کی ہبستری کرو، مکلف نہ کرو۔ طبیعت حاضر ہوگی تو تمھارے بیٹھنے سے کچھ کہہ اٹھیں گے تم ہو اور کیا ہوا کے گھوڑے پر سوار ہم فقیر بستر خاک پر سایہ دار“

”یہ بین تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا“

ملکہ بولی اس مدۃ العمر میں ایسا مسافر جریدہ، دہن دریدہ تمھارے سوا نجد اہیں دیکھا

زبان سنبھالو یہ منہ زوریاں غریبوں سے خدا کی سون کوئی تمسا بھی بد لگام نہیں

اسی طرح اُجھکے پر جہان جان عالم نے انجن آرا کو جادوگر کی قید سے چھڑایا ہے اور پھر انجن آرا کو دیکھ کر بیہوش ہو گیا ہے۔ انجن کی راہ اس کا سراپہ زانوں پر رکھ لیا ہے۔ جان عالم کو کچھ ہوش آیا۔ انجن آرا نے جبکہ کر گھٹنا سر کا یا۔ جان عالم نے جیٹیم داسے شہر دے کا منہ دیکھا۔ اور کھانا ہماری بیوشی ہوشیاری سے اچھی تھی“

انجن آرا نے کہا۔ کیا خوب اتنا اختلاط میری جڑھیں تمھاری محنت مشقت پر نظر کر کے یہ انسانیت کی حرکت کی تھی تم چلنے خدا جانے دل میں کیا سمجھے۔ اپنی راہ لیجئے جلتا دھندھا کیجئے واہ وائیکے برباد گناہ لازم جان عالم سے خاک ہی اپنی اٹھے تو اس گناہ سے اٹھ سکے ہم جاں چوں نقش پا بیٹھ نہ والے اٹھ سکے

الاجہر کی ڈاڑھی میں تنکا۔ تمہیں اپنا عاشق کہیں نہ سمجھوں گا معشوتوں کے دفتر میں آپ کا چہرہ لکھوں گا“

انجن آرا ”چہ خوش، ہلا دل تو سہلا بوا“ کچھ ہوا یا نہ ہو زبان کا مزہ نکالو یہ تو میری شل ہوئی مان نہ مان میں تیرا حمان ہے

چہ خوش گفت بہت سعدی دزد لہذا الایا اسالفاقی اور کاسا وانا لہما

عشق و عاشقی کی باتیں میری بلا جانے، رمز و کنایہ کسی اور سے جاکے کرو۔ اپنا چو چلاتہ کر رکھو اپنی صورت تو غور سے دیکھو یہ ہنسنے سناہیں شاید۔ حلوا خوردن رادھئے باید“

جان عالم ”میں بچا پر خستہ تن غریب زدہ آدرہ منت بن کماں سے لاؤں کیوں مکر ویسی صورت بناؤں ایک ہنستا ہے ایک روتا ہے کفر۔ اسلام میں بڑا فرق ہوتا ہے تمہیں ابھی تک موہن ہوگ کا ڈانٹہ نہیں بھولا ہے۔ دم تقریر زبان پر حلوا ہے“

انجن آرا بتے کی سکر کھسیانی ہوگئی کہا جلو صاحب وہ مو اقربان کیا تھا۔ اپنی چوچ بند کر۔ جلی کٹی کی ہنسی اپنے گھر جا کر کرو مگر خیر اور جو چاہے کہ لیجئے۔ در پردہ کیا صاف صاف گالیاں دیجئے“ انجن آرا ”خاطر جمع رکھ اپنے گھر چلے تھے مال زرد سے لا دو گی کہ تو چل نہ سکے گا بوجھ سے ہل نہ سکے گا“

جان عالم "آخر سلطنت کا گھنٹہ آیا۔ ہم بھی کبھی حاجت روا اسے عالم مشہور تھے"۔

اسی طرح شادی لذت عشق میں جہاں بادشاہنژادہ اور وزیر زادہ اپنے ساتھ والوں سے بچھڑ کر کسی باغ میں دم لینے کو ٹھہرے ہیں اور راستے کی بھکان سے ایک چوہ ترہ پر پڑ کے سو رہے ہیں وہاں اس شہر کی شاہنژادی جو باغ کی مالک ہے اور اس کے ساتھ اس کی وزیر زادی دونوں سیر باغ کو آئی ہیں اور ان دونوں سوستے ہوؤں کے سر پر جاکر کھڑی ہوئی ہیں اور خوب قہقہے لگائے ہیں۔ اس ہنسی کے ساتھ ان دونوں کی آنکھ کھل گئی اور انھوں نے یہ دیکھ کر کہ شام ہو گئی ہے چلنے کا ارادہ کیا۔ مگر وزیر زادی اور شاہنژادی نے روکا۔ اس جگہ وزیر زادہ گفتگو کرتا ہے۔

کھڑی ہے جو یہ پاس تخت وزیر
حقیقت میں ہے یہ نہایت شہریر
انیلا بن اس کا مجھے بھسا گیا
کروں کیا دل اسپر مرا آگیا
مجھے اسکو دیدیجئے اگر حضور
تو ساری حرمز دگی ہو جائے دور

یہ سن کر وزیر زادی کہتی ہے۔

سکھنا نہ دل میں ذرا جھکونیک
سناؤں گی سو کر کے کا تو ایک
نہ ملکہ کی باتوں پر مغسور رہو
ہوا کھسا ذرا جیل پہنچے دور رہو
ذرا ہوشش کی لے تو اپنے شہر
میں جوتی نہ ماروں ترے نام پر

شادی میر حسن میں اس جگہ جہاں نجم النساء جوگن بکریے نظر کو دھونڈنے لگی ہے اور رات کے وقت ایکلی ایک جنگل میں بیٹھی ہوئی بین بھاری ہے۔ اس طرف سے بادشاہ جنات کا لڑکا گورہ رمل اس کو وہ آواز پیاری معلوم ہوئی پاس آ بیٹھا اور سمجھ گیا کہ یہ جوگن صرف نانی ہوئی جوگن ہے اس واسطے کہنے لگا۔

یہ بھجا بنا دے کا کچھ بھیں ہے
لگا کہنے جوگی جی آ دیں ہے
پڑا تپہ ایسا کسویا بجوگ
یہ واسطے کس کے تم نے یہ جوگ
کہ ہر سے تم آئے کہ ہر جاؤ گے
دیا اپنی ہمیں بھی فرماؤ گے
دو بھجی کہ دل اس کا آیا ادھر
کہ دل بھی نور کہتا ہے دل کی خبر
کہا ہنس کے جوگن نے ہر بول ہر
جہاں سے تو آیا جلا جلا ادھر
کہا تب پر نیرا دلے داہ جی
بہت گرم ہیں آپ، اللہ جی

اسی طرح فیروز شاہ شاہ جنات کے لڑکے نے جب بینظیر کو چھڑا دیا ہے اور نجم النساء کے سامنے لایا تو نجم النساء نے نظر کے

تخت کے گرد بھرنے لگی تو فرور شاہ نے کہا۔

کہا اس نے ہنس کر بھلا دیکھ تو تو اس بات پر میرے صدقے نہو
کہا اس نے تب اپنی جوتی دکھا ارے دیو تو کیوں دووانہ ہوا
یہ وہ گفتگو ہے جس میں کچھ طنز و طعنے بھی شریک ہو۔ مگر اس سے قابل کا یہ مقصد نہیں ہوتا کہ مخاطب کو
رنگ پہنچے بلکہ وہ چھپا چھپا کر ایسی باریک بات کہتا ہے جس سے مطلب کچھ اور ہوتا ہے مگر اس کی
زبان سے کچھ اور الفاظ نکلتے ہیں رمز و کنایہ کی گفتگو سے صرف چھپ چھپا کر نام مقصود ہوتی ہے جیسے
خباثت شیخ جو دہشے حلال ہو جاتی تمام رند اسی چیز سے دھوکہ کرتے

اس میں درپردہ شراب کی خوبیاں بیان کر کے داعظہ شہر سے چھپ چھپا کر نام مقصود ہے۔ کبھی رمز و کنایہ محض طنز و طعن اور اپنی
انفصیت ثابت کرنے کے لئے ہوتا ہے جیسے حکیم مومن اپنی ایک شہنوی میں کہتے ہیں۔

ہو جاتا میں ہنستے ہنستے بیدم آتیں مجھے ہچکیاں جو بہیم
ہاں کس نے کیا ہے یاد بولو ہے کون تم اس کا نام تو لو
کبھی رمز و کنایہ اظہار ناز کے لئے ہوتا ہے مثلاً مومن اسی شہنوی میں کہتے ہیں اور اپنے معشوق کی رمز و کنایہ کی گفتگو میں
اس کے ناز معشوقانہ کا اظہار کرتے ہیں۔

لاتا گل و عطر میں کبھی گر فرما تین یہ مجھ سے مسکر کر
یہ گل تو عمل کیا ہوا ہے یہ عطر فسوں پڑھا ہوا ہے
یہ سونگھوں نہ میں نہ یہ لگاؤں ممکن نہیں تیرے دم میں آؤں
مومن اور ایک جگہ اسی شہنوی میں طنز کی صورت میں رمز و کنایہ کی گفتگو کو نقل کرتے ہیں
آئینہ کو رکھتی آگے لا کر اور کہتی یہ منہ سے منہ ملا کر
لو دیکھو ذرا کرو خود انصاف ہم دونوں میں کس کا رنگ بڑھا
ہے دونوں میں کون خوبصورت ہے دونوں میں کون ماہ طلعت

رمز و کنایہ غصہ کے انداز میں

حالی دیکھی ہیں ایسی بہت مہربانیاں اب ہم سے منہ میں موت کے جایا نہ جائیگا
انشاء گلوری بان کی جو کھا رہی ہو اس کے آتشا ہوں نرکے بات کچھ جی میں بری ہو سو اگل ڈالے

موتیں چاک پردہ سے یہ غزہ ہیں تو اوپر نشیں ایک میں کیا کہ سبھی چاک گریباں ہونگے
 انشاء کا ایک شعر ہے گرا نازنیں کے سے برامنتے ہیں آپ میری طرف کو دیکھئے میں نازنیں سبھی
 رمزدکنایہ میں تسخر کے ساتھ کبھی کسی کی بُرائی گنجائی ہے مگر اس صورت سے کہ وہ محض دوستانہ معلوم ہو جیسے ریاض صاحب کہتے ہیں
 بڑے پاک طینت بڑے عاف باطن ریاض آپ کو کچھ نہیں جانتے ہیں
 حالی کہتے ہیں ۵ کیوں بڑھاتے ہو اختلاط اتنا مجھ میں طاقت نہیں جدائی کی
 یہ ایک شکایت ہے کہ آپ کے اختلاط آپ کی محبت کا انجام ہمیشہ یہی ہوا ہے اور یہی اب بھی ہوگا لہذا معاف فرمائے تجوہی
 ایک جگہ عجیب طریقہ سے رمزدکنایہ کا اظہار کرتے ہیں ۵
 تصور کیوں دکھائیں تھیں کن تائیں نام لائے ہیں ہم کہیں کسی یوفا کی ہے
 رمزدکنایہ میں طرزِ حکم خصوصیت سے ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ اور تقریباً اسی پر اس گفتگو کا مدار ہوتا ہے۔ نوک جھوک کی گفتگو کھلی
 کھلی چوٹیں ہیں مگر اس میں ایسا نہیں ہوتا۔ جو بات کسی جاتی ہے بہت پوشیدہ اپنے کسی دوسرے کی آڑ میں یا اس میں ایک ابہام
 رہتلے مثلاً شیفہ کہتے ہیں ۵

دہ شیفہ کہ دہوم تھی حضرت کے زہد کی میں کیا بتاؤں رات مجھ کو کس گھر ملے
 مانگ دہوئی کہتے ہیں ۵ آپ کو دیکھتا ہوں اے مائل اور امانت کو دیکھتا ہوں میں
 داغ مرحوم کہتے ہیں ۵ میخانہ کے قریب تھی مسجد بلو کو داغ سب لوگ پوچھتے ہیں کہ حضرت ادھر کہا
 آؤر دہوئی ایک جگہ رمزدکنایہ کے ساتھ کہتے ہیں ۵

نہیں سمجھانہ تم آے کہیں سے پسینہ پونچھے اپنی جبین سے
 اکبر کہتے ہیں ۵ آج بنگلے میں مرے آئی تھی آواز اڈاں جی ہے ہیں ابھی کچھ اگلے زمانہ دے
 ذوق رمزدکنایہ کے انداز کا ایک جگہ یوں اظہار کرتے ہیں ۵
 بادام دو جو بھیجے ہیں بٹوے میں ڈال کے ایما یہ ہے کہ بھیج دو کچھ نکال کے
 سید انشاء بھی اسی رنگ میں کہتے ہیں ۵

بھجی دی اس کو گونھی مجھے فیروزہ کی اس کے یہ معنی کہ ہیں لڑہ میں خواجہ فرور
 مولانا ناطق گلا دہوئی رمزدکنایہ کے ساتھ سمیری کے طعن کو یوں بیان کرتے ہیں ۵
 تم کو تے ہو جب سے طبیعت کجال ہے اچھے ہیں آج کل تو تمھاری دعا گام

کہیں شکوہ شکایت رمز و کنایہ میں کجائی ہے جیسے

تو سنے سو داکے تلین قتل کیا کہتے ہیں یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں

رمز و کنایہ کے سلسلہ میں مجھے یہ لکھنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میں نے رمز و کنایہ کے متعلق جس قدر مثالیں دی ہیں یا جو کچھ رمز و کنایہ کی گفتگو کی تعریف کی ہے اہل ذوق اسکو علم معنی و بیان کی طرف نہ لیجائیں۔

ان دونوں میں انشازق ہے کہ جلی کٹی عورتوں کی اس گفتگو کی طرف منسوب ہے جو عفت و کجی میں وہ اپنے مخاطب سے کرتی ہیں۔ اس میں استنزا یا تسخر یا طنز اکثر نہیں ہوتا بلکہ زیادہ تر رشک و حسد کے جذبات ہوتے ہیں۔ اور صاف صاف اپنے رنج ہو بچنے کا اظہار کر کے دوسرے کو اس کے پاداش میں ویسے ہی جوابات سناتا کہ اپنے دل کی بھڑاس نکالی جاتی ہے۔ اگر کہیں رمز و کنایہ بھی ہوتا ہے تو اس طرح کہ صاف معلوم ہو۔

جان صاحب
الہی جو موسے بدنام میرا نام کریں
اویسین کی تھی بڑی کور و غلام کر دین
کرم ہے کل سے بڑا آج میرے چونڈ کچھ
بائیں وہ جو میری بار بار لیتے ہیں
میری جوتی سے میسر اگر تاش بھین
اپنی بچی کو بٹھا رکھتے نہ تم کو دیتے
اپنے گھروں میں وہ جا کے خبر تو لیوں
انکی بننا سے زیادہ نہیں مکار ہوں تین
اپنے بلبے سے نہ باندھو مجھ کو اب جھوڑو تم
لاکھ مکار دیکھی مکار ہوں کار ہوں تین

انشا کہتے ہیں۔

اوروں کے سر جاپڑ پوچھتے نہ بولو ددا
رکھو نہ اجڑی ہوئی بختوں جلی سے عوض
اڑ گئی فاختہ کیوں سرو پہ دم دیتی ہے
اجی اس کا نہ کچھ اچھا مجھے کھڑا لگا
تم نے پریشانی کمانی تو میری انا
آپ بیتی تو کوئی بات نہ چھیڑی انا
بھرا آئی میری آنکھ تو انشانے یوں کما
لگتا ہے مجھ کو ٹوٹے گھلانا بیت بُرا
اپنا جو جتنا ہو ہمیں زور نگوڑا
صدقہ اسے کر ڈالے درگور نگوڑا

» سوخت میں، عاشق کی طرف سے اپنے معشوق کو جلی کٹی سنائی جاتی ہیں مگر یہ طرز گفتگو صرف نظم ہی میں مروج ہے نثر میں اس کو صرف اسی نام سے موسوم کریں گے جو ہم لکھ چکے، مومن خاں کہتے ہیں:-

کہ اور غزل بطرز و سوخت مومن یہ اسے سنائیں گے ہم

اب اور سے لو لگائیں گے ہم
بر باد نہ جائے گی کدورت
سردوش عدد پہ رکھ کے بیٹھے
بگڑے تو کریں گے اور سے صنم
لب کا ترے دعوے سیجی
گر خواب میں بھی ادھر کو دیکھا
گر تیری طرف کو سیرت راری
گر دیکھ کے ہنس دیا ہیں تو
کیا ذکر ہے ہونٹ چاٹنے کا
پھرتیرے ہوا کا دم بھرا تو
گر خواب میں آن کر تنگایاں
آتا ہے گلی سے دھیان تیرے
بتخانہ چین ہو کر ترا گھر

جون شمع تجھے جلائیے گے ہم
کیا کیا تری خاک اٹائیے گے ہم
جانا نہ کہ سراٹھائیے گے ہم
بجھڑی ہی بنائیے گے ہم
مراد رہے آزمائیے گے ہم
آنکھیں مرزہ کو دکھائیے گے ہم
کھینچے گی تو لوٹ جائیے گے ہم
منہ پھیر کے مسکرائیے گے ہم
کچھ اور مرزہ جھکائیے گے ہم
جی ہی کو ہوا بتائیے گے ہم
سوئے مردے جگائیے گے ہم
خاطر میں ستم نہ لائیے گے ہم
مومن ہیں تو اب نہ آئیے گے ہم

ایک جگہ مرزا غالب بھی اسی انداز میں ایک شعر فرما گئے ہیں جو بہت مشہور و معروف ہے۔

ہم سے کھل جاؤ بوقت سے پرستی ایک دن
ورنہ ہم پھیر میں گے رکھ کر غدر میں ایک دن

امانت مرحوم کا رنگ ملاحظہ فرمائے۔ اول سے لکھتے آتے ہیں کہ میں نے اپنے معشوق کو بہت کچھ سہایا مگر وہ کسی طرح سے نہ سمجھا۔ پھر تو میں بھی آدمی تھا آخر جواب دینے پر مجبور ہو گیا ایک نیا معشوق تلاش کر لیا اور ایک دن پہلے معشوق کے پاس پہنچا۔ یہ معشوق جواب ملا نہایت ہی با وفا تھا لکھتے ہیں۔

میں نے اس گل کو جو کج رنگی میں گل بایا
خار دینے کو تباہی غنچہ دہن کے آیا

دیکھ کر مجھ کو یہ کلمہ وہ زبان پر لایا
اب بھی ناحق مرے چونڈی بہ کر فرمایا

کسکی ہے یا دکہ تو دل سے مجھے بھولا ہے
نہ خدا بھوٹ کرے اب کوئی گل بھولا ہے

کسل کھلا کر مرے منہ سے ہی نکلا اکبار
گل وہ بھولا ہے کہ اب تجھ کو دکھائے گا بہار

اپنے جو بن بہے تار ان عبث اے گھر خشتا بارغ علم میں پڑے ہیں گل تر تھہری ہزار
سرد قد سیکڑوں ہن غنچہ دہن لاکھوں ہین
گلشن دہرین بلبل کوچن لاکھوں ہین

اسی قسم کی اور بھی بہت سی باتیں اس سے کہیں تب وہ بولا۔

ایسی باتیں کہیں آگے نہ سین یقین حاشا طعنہ دیدیکے کلیجہ کو دیا میرے پکا
ہاں بہت دن ہو دل بمری صحبت رکھرا ایسی ہر جاتیوں سے بات نہ کرو اے خدا
اچھی صورت جو کسی اور طرف پائی ہے
غیر سے ملنے کی تہمت مے سرائی ہے

آنکھوں میں ڈال کے آنکھ اتے جو طرح کہا بولیں بس مجھے دیدیکے صفائی نہ دکھا
مہربان غیر یہ تو ہے تو مجھے اس کو کیا میں نے بھی ڈھونڈھا ہر پتھر لے اک ماہ لقا
دیکھے انسان جہلکاسکی تو چکا چونڈھیں لے

جلکے مہتاب سے چہرے پہ ہوائی جھٹ جھٹے
پھر وہ شعلہ کی طرح کانپ کے بولا اک بار میں نہ کہتا تھا کہ ہاتھ آیا ہے اسکے کوئی یار
اڑی چوٹی پہ اسے صدر خے کرو لیلیناؤ میں کچا را کہ زبان بند کراے بد کردار
تجھ کو کیا کیا نہ جلا دے گا جلا پاؤں کا
کان اب کھول کے سن مجھ سے سر پایا سکا

اس کے بعد اس کا سراپا بیان کیا ہے اور جلی کڑی کی باتیں کرتے رہے ہیں پھر کہتے ہیں کہ اگر کوئی ایسی مغل ہو جس میں تو بھی ہو وہ بھی ہو تو میں سے
تیرے وہ دیکھ کر پیٹھوں اور توجھے اور کہے کہ اچھا اب ہم گھر جائیں گے۔

گھر کے توجانیکا اس دم جو کب قصد صنم یعنی منگو اور سواری مرا گھشتا ہر دم
از رہ وطن وہ تجھ سے کہے اے کشتہ غم آج رجواؤ امانت کی تعین سر کی قسم
گھر کہاں جاؤ گے اب رات کو سودائی ہو
سود ہو تخت پر گر نیند بہت آئی ہو
سکے اس طنز کو تو مجھ سے کہے ہوئے خفا خوب یاں آپ نے لاکر مرادل شاد کیا

ان سے کمد و کہ زبان بند رکھیں ہر خدا
مجھ کو یہ رمز و کنائے نہیں بھائے اصلا

لطف یہ ہے کہ ملاقات کا پردہ رہ جائے

کچھ مرے منہ سے نکل جائے تو پھر کیا رہ جائے

تمہارے تب یوں کہے وہ گل اندام اپنے عاشق سے کہو اور کسی سے کیا کام

مجھے سے کر سکتا ہے یہ وہ بہلا کوئی کام بس چلو چپ رہو ہوتی ہو مری منین حرام

نام اس گھر کا محلہ میں نہ بدنام کرو

لڑا چکے جاؤ خدا کے لئے آرام کرو

حکیم مومن خان مومن بھی اپنے معشوق سے بہت جل گئے ہیں کہتے ہیں

ہائے اکبار وہ لطف پیہم چھوڑ دیا انس و اخلاص دلاسا و کرم چھوڑ دیا

چارہ بخش دربان الم چھوڑ دیا میں نے بھی آپ کو اس سر کی قسم چھوڑ دیا

اب گرد بھی تو داد دل ناکام نہ لوں

گو کہ بدنام ہوا ہوں یہ کبھی نام نہ لوں

جب نہو چاہے تو کس واسطے جاؤں میں بھی بیوفا نکلے تو کاہے کہ بنا ہوں میں بھی

تم ہو گر فتنہ دریاں تو بلا ہوں میں بھی نو بیہ سی جان رکھو یہ کہ ہوا ہوں میں بھی

بھرا دہر منہ نکر وں شکل دکھانا تو کہاں

اس طرف سے نہ چلوں کو چہ میں آنا تو کہاں

دیکھ لوں گا میں بس اب مہر لقا اور کوئی برقی و شعلہ روش گرم ادا اور کوئی

آتش خرمین آزار و جفا اور کوئی شمع کاشانہ خروشاں و دفا اور کوئی

دم ہے آنکھوں میں یہ صدمہ مری دل پر گر را

گر رے دنیا سے بلا تم بھی میں در گز را

الغرض واسوخت کو سوا اس کے کہ مردوں یا عاشقوں کی جلی کٹی سے تعبیر کریں اور معنی نہیں اس میں طعنہ طنز و تشنگ حسد غصہ

وغیرہ بھی باتیں شامل ہوتی ہیں

شکاوہ و شکایت اگر بنظر سرسری دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ طنز سے یہ بحث بالکل علیحدہ ہے مگر غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے

کہ شکوہ بھی طنز کی ایک نوع ہے۔ کبھی کبھی اس عنوان بیان میں بھی طنز یہ چلے یا اس کے مناسبات شامل ہو جاتے ہیں کبھی اظہار افسوس کے ساتھ شکوہ کیا جاتا ہے کبھی اس میں غصہ وغیرہ کے جذبات شامل ہوتے ہیں۔

شکوہ سے مراد وہ گفتگو ہے جس میں کوئی شخص اپنے مخاطب سے اپنے غم اپنی تکلیف کا خواہ وہ کسی ذریعہ سے ہوئی ہو ایسے انداز سے اظہار کرے جس میں مندرجہ بالا جذبات میں سے کوئی خاص جذبہ یا سبب شامل رہے شکوہ کا نتیجہ ایسی ہجو پر ختم ہوتا ہے جو سننے والا برداشت کر سکے مرزا غالب کہتے ہیں ”شکوہ سے“ میں بُرا نہیں مانتا مگر شکوہ کا فن سوائے میرے کوئی نہیں جانتا۔ شکوہ کی خوبی یہ ہے کہ راہِ راست سے منہ نہ موڑے اور مہذا دوسرے کے واسطے گنجائش بھی نہ چھوڑے

اودھن مروت کچھ حق بھی ہے ہمارا
برسوں ترسے لے ہم احباب لڑے ہیں
اس شعر میں محض شکوہ ہے اور اپنے حقوق کا اظہار کیا گیا ہے۔ شکوہ دوستانہ کی مثال ملاحظہ ہو:-
سائل
غیر پر سجد عسایت ہوا دھر کچھ بھی نہ
ایک پر اتنا تطف ایک پر کچھ بھی نہ
کبھی شکوہ میں غصہ بھی عجز اور طنز کے ساتھ شامل ہوتا ہے۔ جیسے غالب کہتا ہے
دیر نہیں حرم نہیں در نہی کی تان نہیں
بیٹے ہیں رہز پر یہ ہم غیر میں ٹھاڑیوں

کبھی شکوہ عاجزانہ افسوس کے ساتھ ہوتا ہے جیسے غالب کہتا ہے
زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یا کریں گے کہ خدا رکھتے تھے
فیضی ثنوی لندن میں اُس حالت کو جب نل دمن کو سوتا ہوا اچھوڑ کر چلا گیا ہے اور دمن بیدار ہوئی ہے اور اس نے نل کی تصویر خیالی سے شکایتیں کی ہیں یوں کہتے ہیں۔

آشفٹہ دمن ز خواب برخاست
چون طرہ خود تباب برخاست
ہنچو ابہ نیا فت جزو خیا لے
ہمدش نیا فت جزو ملا لے
اس حالت میں عاجزانہ دوستانہ شکوہ کرتی ہے۔

رفتی دمر انجسر بکھردی نو
بریکسیم نظر بکھردی نو
رفتی دمر انجسر ندا دی
صد تیشہ عم لب رہنا دی
پیش از تو جنون عشق بودہ است
این راہ مگر کس نہ سود است
گویند سخنوران کامل نو
دیوانہ بکار خویش عاقل

اور چند مثالیں ملاحظہ فرمائے:-

حیرت بھی نہ کر سکا۔ مجمع برخواست ہو گیا تھا۔ میزبان کہیں میرے لئے چار پانی لینے چلا گیا تھا۔ میں تنہائی میں حسن شاہ کے سامنے لرزہ بر اندام تھا اور وہ مجھے پکڑے ہوئے تھا۔ گویا اس کو اندیشہ تھا کہ کہیں میں بھاگ نہ جاؤں۔ اتنے میں میزبان کی بیوی نکلی اُس نے میری گھبراہٹ دیکھ کر کہا ”گھبرائے نہیں۔ یہ نہایت معصوم اور اندرونی ہے۔ کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتے۔ البتہ پردیسوں کے ساتھ اُن کو نہ جانے کیوں بہت زیادہ لگاؤ رہا ہے۔ یہ قریب کے ایک گاؤں کے مشہور زمیندار ہیں۔ ان کی عمر ساٹھ سال کی ہے۔ انکی شادی ہونے والی تھی لیکن شادی سے ایک دن پہلے لڑکی کو سانپ نے کاٹ لیا اور کچھ دنوں بعد یہ مجذب ہو گئے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔“

حسن شاہ نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور اس خوبصورت عورت پر آنکھیں نکال کر بولا ”مجذب تیرے باپ ہوں گے۔ ساٹھ سال کی عمر تیری ہوگی۔ سانپ نے تیرے شوہر کو کاٹ لیا ہوگا۔ اور سننے کل میری شادی ہوگی۔ گانا بجاتا ہو رہا ہے اور کھنت کھتی ہے سیدہ کو سانپ نے کاٹ لیا ہے۔ تیری زبان سڑ جائے“ مجھے بیساختہ ہنسی آگئی۔ میزبان کی بیوی نے میرے کان میں جھک کر کہا ”ذرا اُسے پوچھئے کہ ان کی عمر کھلی ہے“ میں نے پوچھا تو جواب ملا ”۲۵ برس“ اب میری دہشت دور ہو گئی اور مجھ پر عبرت چھا گئی۔ میزبان کی بیوی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ یہ دیکھ کر حسن شاہ جلدی سے اٹھا اور اس کے آنسو پوچھ کر کہنے لگا ”یہ کیا ہے آنسو اس کو بری طرح غارت کر دیتے ہیں“ اور پھر اپنے سر کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا ”انھیں آنسوؤں نے میرے اس حصہ کو جلا کر سیاہ کر ڈالا ہے۔ جب میں کسی کو روتے دیکھتا ہوں تو مجھے ایک بات یاد آ جاتی ہے جسکو میں سمجھ نہیں سکتا کہ کیلئے“ حسن شاہ یہ کہہ کر چپ ہو گیا اور بیٹھ کر سوچنے لگا۔ چند لمحوں بعد آپ ہی آپ کہنے لگا ”بیشک ساٹھ برس! بڑھا ضعیف۔ ناکارہ۔ اپنے ہوش میں نہیں لڑکوں کا کھلونا۔ تم لوگوں کا ”مجذب“ دنیا میں تنہا۔ بے یار و مددگار“ اس نے اپنا سراپہ زانو میں چھپا لیا۔ میزبان کی بیوی نے متحیر ہو کر کہا ”ان کو اس طرح کی باتیں کرتے ہوئے آج تک کسی نے نہیں سنا تھا۔ یہ تو اب اپنے حواس میں معلوم ہوتے ہیں“

میں اب حسن شاہ سے مرعوب نہ تھا۔ مجھے اس کے ساتھ ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے سراٹھایا تو اس کے آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں نے کہا ”تم روتے کیوں ہو؟ کل تو تمھاری شادی ہونے والی ہے اور تم بدھگونی کر رہے ہو؟ خوشیاں مناؤ اور اپنی قیمت پرناز کرو کہ سیدہ کے ساتھ تمھاری شادی ہو رہی ہے“ حسن شاہ یک بیک پھر شگفتہ ہو گیا اور اس کے خیالات کا سلسلہ جوڑ ٹک گیا تھا پھر مل گیا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا ”اسی وجہ سے تو کہتا ہوں کہ میرے ساتھ چلو۔ رات بھر تم کو قصے سناؤ گنا کل تم میری شادی میں شریک ہونا“ میں اس کے ہمراہ جانے کا پورا ارادہ کر چکا تھا۔ مگر پھر اسی عورت نے کہا ”حسن شاہ ان کو کل لیجانا۔ آج یہ بہت تنگ گئے ہوں گے۔ حسن شاہ نے ڈانٹ کر کہا ”پاگل تو نہیں ہوئی ہے۔ کل میری شادی ہے سب کے سب اہتمام میں مصروف ہوں گے ان قصے کو نہ بیان کرے گا“ یہ کہہ کر میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر وہاں سے چل کھڑا ہوا۔

طوفان ختم ہو گیا تھا مگر طوفان کے آثار باقی تھے۔ زمین دلدل ہو رہی تھی جا بجا درخت اکھڑے پڑے تھے ہم لوگ جنگل چھاڑی

میری بہت نہ ہوتی تھی کہ کسی طرح باپ سے صاف صاف اپنے دل کی حالت بیان کر دوں لوگ اپنی اپنی جگہ سیدہ کے لئے خانہ تیار کر رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا کر دوں۔ سیدہ نے مجھ سے ملنا کم کر دیا تھا اور جب ملتی تھی تو میں اس کے حرکات و سکنات میں تسنّع کا شوق محسوس کرتا تھا۔

حسن شاہ خلاف توقع بھر رک گیا اور رضائیں نہ جانے کس چیز کو دیکھنے لگا میں نے بھی اس کے ”سکوت بے عمل“ میں غلط انداز ہوتا نامنا سب سمجھا اور صبر کے ساتھ اس کے بھرپور ہوش میں آنے کا انتظار کرتا رہا۔ کوئی چند روز منٹ خاموش رہا کہ اس نے خود بخود ہلاکسی حرکت کے سلسلہ شروع کیا۔

”آخر کار میں مضبوط نہ کر سکا اور اپنے باپ کے پاس ایک مختصر تحریر بھجادی۔ سیدہ کی شادی مجھ سے ہونی چاہئے۔ اگر وہ کسی غیر کی آغوش میں دی گئی تو پھر دریا کی بے شمار موجوں میں میرا پہنچ بھی نہ لگیگا“ ہر طرف ایک شورش پھیل گئی کسی کو مجھ سے ایسی امید نہ تھی باپ نے مجھے ہلا کر سمجھایا۔ ترش روئی کے ساتھ بائیں کہیں۔ دھمکیاں دیں مگر مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا میں فیصلہ کر چکا تھا۔ میرا ارادہ زور پکڑ چکا تھا میں اپنی بات پر اڑ رہا باپ مجھ پر جان دیتا تھا اس لئے اس کو شکست ہوئی اور سیدہ مجھ سے منسوب ہو گئی۔ مگر کہیں یہ سب خواب تو نہیں تھا؟.....“ اس کے خیالات پھر پریشان ہونے لگے میں نے جلدی سے کہا ”بچہ کیا ہوا“ حسن شاہ نے جواب میں کہا۔

میں اپنے قصہ کو بیکار طوالت نہیں دے رہا ہوں اس سے تم میری پوری زندگی کی سرگزشت سمجھ لو گے۔ گھر والوں نے مجھ پر ہمو کر یہ طے کیا کہ ڈیڑھ سال بعد سیدہ عمر بھر کے لئے میری ہو جائیگی۔ دونوں کلیاں جو مچھاری تھیں پھر شگفتہ ہو گئیں۔ سیدہ پھر نکاح میں زندگی کی لہریں محسوس کرنے لگی اور میں تو گویا دوبارہ پیدا ہوا۔ لیکن اس کے بعد ہم کو ایک دوسرے سے ملنا نصیب نہیں ہوا۔ سیدہ ہم کے مطابق مجھ سے پردہ کرنے لگی تھی۔ تقریباً ڈیڑھ سال کی مدت تھنے چن بچپنیوں میں بسر کی ان کا اندازہ ہر شخص تئیں کر سکتا تھا کہ جیسے کا بہانہ صرف یہ امید تھی کہ ہم بہت جلد ایک دوسرے کی آغوش میں پہنچ جائیں گے خدا خدا کر کے ڈیڑھ سال ختم ہوئے کہ ہوسے بیاہ کی تیاریاں شروع ہوئیں گانا بجانا شروع ہونے لگا۔ خوشیاں منائی جانے لگیں میں خود ہر کام میں سرگرمی کے ساتھ نمایاں حصہ لے رہا تھا میرے لئے کائنات پر ایک نیا رنگ بھر رہا تھا۔ سیدہ کے لئے ”جملہ عروسی“ تیار ہو رہا تھا..... اور اس کے بعد کیا ہوا؟

میں نے فوراً کہا ”ہاں بتاؤ کیا ہوا؟“ حسن شاہ نے غور کرتے ہوئے کہا۔

”شادییں پاگل ہو گیا۔ مجھے پہلے سے خبردار کر دیا گیا تھا کہ اگر سیدہ تم نے شادی کا بیخام دیا تو وہ مر جائیگی اور تم پاگل ہو جاؤ گے ہم کو معلوم ہونا چاہئے کہ بچپن ہی سے مجھ پر کبھی کبھی ایک خواب کی سی حالت طاری ہو جاتی تھی جہیں ہلاکسی ظاہری تو سطح کے مجھ کو ہونیوالی بات کا علم ہو جاتا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ مجھ پر جن یا پیری کا سایہ ہے۔ باپ کو وہ خوش تحریر ردا تہ کرنے سے پہلے

میں دیکھ چکا تھا کہ میری سعیدہ کو ایک کاسے نے ڈس دیا ہے مگر میں متنبہ نہ ہوا محبت نے مجھ کو اندھا بنا رکھا تھا میں نے اس کو داہمہ سمجھ کر دل سے نکال دیا۔ اگلا اجمعت ہڑی نو دغرض ہوئی ہے میں نکاح کا بیخاتمہ دیتا تو سعیدہ آج اسی دنیا میں ہوتی اور میں بھی شاید اس حالت کو نہ پہنچتا سعیدہ تو مجھے چھوڑ کر چلی گئی میری برباد زندگی کی جھلکوں ذرا برداشت نہیں۔

من بے تو تیرہ روز تو بے من چکونڈ؟

حسن شاہ: نکاح کر خاموش ہو گیا۔ میں نے پوچھا ”کیا قصہ پورا ہو گیا؟“ یہ سنا کہ وہ سوچنے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اپنے حافظہ پر زور دے رہا ہے سوچتے سوچتے اس نے ایک قہقہہ لگایا۔ اس قہقہہ نے میرا دل دکھا دیا۔ حسن شاہ نے اپنی بے ہنگام ہنسی قائم رکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں اس کے بعد میں دیوانہ اور مجذوب سمجھا جانے لگا۔ دنیا واسے ہر بات میں اپنے مطلب کی بات نکال لیتے ہیں اب بعض بزرگ دنیا اور بزرگ کمال سمجھتے ہیں اور بعض مجنون اور فاجر اطفال۔ سچ ہے جسکو دنیا کی باتوں میں کوئی دلچسپی نہ ہو وہ دنیا کے خیال سے دیوانہ ہی ہے مگر بڑی مصیبت تو یہ ہے کہ لوگ اب بھی مجھے چین تیں لینے دیتے اور خواہ مخواہ آکر پریشان کرتے ہیں۔ میں گلیاں دیتا ہوں، صلواتیں سنا تا ہوں لیکن اس کا کیا علاج کہ میرے معتقدین اسی میں اپنی فلاح سمجھتے ہیں۔ ہر جگہ یہ مشہور ہے میری بدعاؤں کا اٹنا اثر ہوتا ہے۔ میرا ب قصہ بہت مختصر ہے اسے بھی سن لو سعیدہ مجھ سے اب بھی غافل نہیں ہے وہ مجھے گاہے گاہے خاک بھیجا کرتی ہے اور مجھ کو تسلیاں دیا کرتی ہے میں جا کر ان کو لے آتا ہوں اور چند شنب کر کے تم کو دکھاتا ہوں“ وہ اٹھ کر ایک کمرے میں گیا اور ایک بوسیدہ صند بچھی اٹھالایا جہیں بہت سے کرم خورہ خطوط بے ترتیبی کے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔

میں حیران تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے حسن شاہ نے مجھ کو ایک تحریر دی اور کہا ”پہلے اسکو پڑھو یہ اس وقت کا ہے جبکہ سعیدہ کی موت کے بعد مجھ پر وہ کیفیت اچھی طرح طاری نہیں ہوئی تھی جسکو سب دیوانگی سے تعبیر کرتے ہیں اور میرے والدین میرے دماغ کی طرف مائل کہنے کے لئے میری دوسری شادی کرنا چاہتے تھے میرے ماں باپ کو میری بڑی فکر تھی اور وہ بھی میرے ہی غم میں مر گئے“ میں سنا خط پڑھنا شروع کیا۔ لکھا تھا۔

”پیارے حسن یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا تم سعیدہ کو بھول گئے جس کے لئے زندگی سے بیزار ہو کر ماں باپ سے بغاوت پر آمادہ ہو گئے تھے؟ کیا تمہیں یاد نہیں کہ غاٹوں کس محل سے تم کو میرے ساتھ شادی کرنے کی اجازت دی تھی؟ میں مان نہیں سکتی کہ تم میرے ہوتے ہوئے کسی اور کو اپنے پہلو میں جگہ دو گے۔ میرا حسن اگر دوسرے کا ہو گیا تو میں کہاں جاؤں گی اور کیا کرونگی؟ نہیں نہیں مجھ کو نہ چھوڑو صبر کے ساتھ انتظار کرتے رہو۔ دن کٹتے دیر نہیں لگتی۔ وہ دن ہی آہی جائے گا جب ہم ایک دوسرے سے مل جائیں گے اور پھر کوئی قوت ہم کو جدا نہ کر سکیگی۔“ مختصر سی کنیز سعیدہ۔

دوسرے خط میں بیٹابی کا اظہار کیا گیا تھا۔۔

”اب تشنگی ناقابل برداشت ہو رہی ہے آخر یہ صبر آزمائیاں گزریں گی نہیں جاتیں؟ حسن تم کو میں کب دیکھوں گی؟“

.....“

تیسرے خط کو پڑھ کر میں میساختہ رو دیا۔ صرف اس قدر لکھا تھا:۔

”کونسی رات آن ملے گا؟“

”دن بہت انتظار میں گزر رہی۔ سعیدہ۔“

حسن شاہ نے جتنی تحریریں مجھے بڑھنے کو دیں سب ایسی ہی تھیں کہ واقعی کوئی دل والا بھی اُن کی تاب نہیں لاسکتا تھا پھر اگر بیچارہ حسن شاہ اس حقیقت کو سمجھنے سے معذور تھا کہ سعیدہ کو سانپ نے کاٹ لیا ہے تو کوئی حیرت کی بات نہ تھی سبب آخری خط میں لکھا تھا:۔

”نشاباش حسن شاباش! تم بڑے بختہ مغز ہو۔ آئین و فاقہ خوب بنا ہا میں جب سوچتی ہوں کہ میرا چاہنے والا ایسا دھن کا بچا ہے تو اپنی قسمت پر ناز کرنے لگتی ہوں۔ بس اب جدائی کا دور ختم ہو رہا ہے۔ گھبراؤ نہیں تم بہت جلد مجھے ملے والے ہو۔ اللہ اشد! پھر کی یہ دوازدہ بھی کیسی کٹھن تھی۔ (مختار می منتظر سعیدہ) اس خط نے مجھے تشویش میں ڈال دیا میں اس کا مطلب سوچنے لگا چندہ میں خطوط پڑھ چکا تھا حسن شاہ نے کہا اب جانے دوں یہ کسی بن تم بہت تھکے ہو گے خواہ مخواہ میری وجہ سے پریشان ہو کے صبح ہو رہی ہے کچھ آرام کرو“ یہ لکھ کر وہ اس طرح بیٹھ گیا تو اب اس کو کچھ کرنا نہیں تھا۔ اس وقت اسکی بالکل وہی حالت تھی جو کسی عویز کے جنازہ کی تجسیر و تکفین کے بعد مام و داروں کی ہوتی ہے یعنی وہ ایک مکان محسوس کر رہا تھا جسے اس کے اعصاب کو ڈھیلہ کر دیا تھا۔ چار بج چکے تھے ہوا کی غلاب اور کیفیت نے مجھ پر اثر کیا اور میں حسن شاہ کی مسرت کی صورت دیکھتے دیکھتے سو گیا لیکن تب وہ گھنٹہ بھی پورا نہ ہوا تھا ایک نامعلوم خطرہ کے احساس سے میری نیند اچٹ گئی دیکھا تو حسن شاہ سامنے نہ تھا اور اس کے خطوں کی صندوقچی بھی غائب تھی میں گھبرا کر اٹھا اور سارا مکان جھان مارا۔ کہیں اس کا پتہ نہ لگا میرا دل دھڑکنے لگا۔ احاطہ میں تلاش کرتا ہوا چہار دیواری سے باہر آیا اور ایک ٹیلہ پر چڑھ کر ادھر ادھر نظر دوڑانے لگا یکایک میں نے دیکھا کہ حسن شاہ مجھ سے بہت دور دریا کے کنارے کنارے بھاگتا ہوا چلا جا رہا تھا اس کی نفل میں اس کی صندوقچی بھی تھی میری جان سوکھ گئی۔ میں ٹیلہ سے کود پڑا اور پکار کر کہا ”حسن شاہ ذرا ٹھہرو ایک بات تو سنو“ اس نے چلا کر جواب دیا ”میرے پیچھے آؤ میں اب کسی کی نہیں سن سکتا۔ میں اپنی سعیدہ سے ملنے جا رہا ہوں“ میں نے دوڑنا شروع کیا مگر تیکر۔ وہ ایک جگہ جہاں دریا بہت گہرا تھا رکا اور صندوقچی کے لئے کود پڑا میں اس کو ڈوبتا دیکھ رہا تھا اور کچھ نہ کر سکتا تھا۔ گاؤں والوں کو آواز دی لیکن جب تک وہ آئیں جن و اپنی منزل مقصود کو پہنچ چکا تھا۔

رات بھر میرے گھردلے میرے لئے پریشان تھے۔ ہر جگہ میری تلاش کی گئی مگر میں نہ ملا۔ لوگوں کے دلوں میں نہ جانے کیا کیا اندیشے پیدا ہو رہے تھے آٹھ بجے کے قریب میں صبح و سالم داہن ہوا تو سب کی جان میں جان آئی۔ مجھے اتنی فرصت نہ تھی کہ کسی سے کچھ کتسا سنتا۔ میں نے کچھ کھائی کر حن شاہ کی سرگزشت پر تبصرہ کرنا شروع کیا۔ غور کرنے سے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس کی اس دردناک موت کا بھانہ میں ہوا ہوں مجھے دیکھتے ہی اس کے دماغ میں صحت کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ تھوڑی دیر میں وہ اچھی طرح اپنے ہوش میں آگیا تھا۔ اس کا جنون دور ہو گیا تھا۔ وہ اپنے خواب سے دفعتاً بیدار ہو گیا تھا۔ اس کی "محبذویت" بچھن گئی تھی اور اس کی قوتوں نے جواب دیدیا تھا۔ اب وہ زمانہ کی گردش پہنچ نہ پاسکتا تھا اس کی سعیدہ کو سانپ نے ڈس لیا تھا اور وہ اس صدمہ کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ۳۵ برس کا زمانہ اسپر سے چند گھنٹوں میں گزر گیا اتنی مدت کا غم میں اتنے قلیل عرصہ میں برداشت کرنا حن شاہ کے بس کی بات نہ تھی اور اس نے اس کا علاج سوا اسکے اور کچھ نہیں دیکھا کہ خود بھی سعیدہ کی پاس چلا جائے۔

مجنون گور کھپوری

پادۂ ناب۔ مجموعہ رباعیات فارسی بیرونی اللہ صاحب بی لے۔ عصر
مطالعہ فطرت۔ (مجلد) اتحاد فلسفہ اسلام پر ایک نیشنل تصنیف مصنفہ محمد فاروق ایم۔ ایس۔ سی۔ عصر
نکد ان فصاحت۔ عربی فارسی اردو کے بہترین علمی ادبی تاریخی لطائف کا مجموعہ۔ عصر
تذکرہ حضرت بلھے شاہ۔ پنجاب کے نہایت مشہور بزرگ کے تاریخی حالات مستند ذرائع سے۔ ۸
جہاں آرا بیگم۔ شاہزادی جہان آرا نہایت شاہجہاں کی نہایت دلچسپ مستند تاریخ۔ ۸
بندگی۔ امام ابن تیمیہ کی مشہور کتاب "البدویت" کا نیشنل ترجمہ حقائق دینی و تصوف کی منظر کتاب۔ عصر
لسان الغیب۔ حافظ شیرازی کی مکمل سوانح عمری اور ان کے دیوان کی بہترین شرح جلد اول تھے جلد دوم۔ ۸
فتنہ خلق قرآن۔ امام عبدالعزیز بن نجی کی کتاب "المجیدہ" کا ترجمہ قرآن کے متعلق ایک منظر محاکمہ۔ ۱۰
کاس الکرام۔ عمر خیام کے مفصل حالات زندگی اور رباعیات کی مکمل شرح اس موضوع پر پہلی کتاب ہے۔ ۸
یادگار غالب۔ مرتبہ شمس اللہ خواجہ الطاف حسین حالی بانی تہجی۔ ۸
کلیات نظم حالی۔ شمس اللہ حالی کے تمام منظوم کلام کا مکمل مجموعہ جلد اول۔ ۸
نقش ارژنگ۔ جلال الدین صاحب اکبر کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ۔ ۸
ابوسلم خراسانی۔ جرعی زبدان مصری کے مشہور ناول کا اردو ترجمہ۔ ۸
منیجر نگار بک ایجنسی نظیر آباد لکھنؤ

اکبر، آئین اکبری میں

(یہ سلسلہ سابق)

ایک جوان شخص کی اعلیٰ تعلیم کا اُسوقت یہ معیار سمجھا جاتا تھا کہ وہ عربی زبان لکھ پڑھ سکتا ہے۔ صرف غنہ اور عروض کے قواعد سے واقف ہے۔ قرآن کی بڑی بڑی سورتیں زبانی پڑھ سکتا ہے، فارسی اس کی مادری زبان ہے اور حافظہ وسعتی کے قریب قریب کل اشعار اور فردوسی کے بہت سے اشعار اُسے یاد ہیں، بادشاہوں اور شہزادوں کی سواخ سے علم رکھتا ہے، کسی قدر علم ہندسہ، ہنریت اور پتھر و لکڑی سے علم موسیقی بھی جانتا ہے۔ تیمور کی اولاد جہانگیر کے عہد تک ترکی زبان سے یقیناً واقف تھی۔ چنانچہ جہانگیر خود ترکی زبان جانتا اور اس میں لکھ پڑھ سکتا تھا۔

اکبر میانہ قدر تھا لیکن اس کا قد درازی کی طرف مائل تھا، اس کا رنگ گندمی تھا بلکہ اس میں سانولا پن زیادہ تھا۔ وہ سیاہ چشم و سیاہ ابرو، قوی الجنتہ، فراخ سینہ اور کشادہ پیشانی تھا۔ ہاتھ اور بازو لالہ تھے۔ اس کی آواز بلند تھی اور طرز کلام نہایت پاکیزہ اور خوشگوار تھا۔ اس کے عادات و اطوار دوسرے لوگوں سے بالکل جدا گانہ تھے اور اس کے چہرہ سے رعب تقدس ظاہر ہوتا تھا۔ یہ بیان اس کے بیٹے جہانگیر کا ہے۔

اپنے بزرگوں کی طرح اکبر بھی بڑا سرگرم شکاری تھا۔ ایک دن میں اس نے خود ۱۶ تیز رفتار جنگلی خرگوش شکار کئے، اس نے اگرہ کے قریب سیلوں کے نشانات کو بارہ سگلوں کے بے شمار سینگلوں سے آراستہ کیا جن کو شکار میں مارا تھا۔ ایک بار اس نے ۴۸ گھنٹے میں ۲۲ میل کا سفر گھوڑے پر طے کیا۔

”اس کی تاریخ عجیب و غریب بہادرانہ مثالوں سے بھری ہوئی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ خلقی طور سے اس کو خطرات میں پڑنے کی ایسی ہی تحریک ہوتی تھی جیسا کہ ایک عاقلانہ کام کرنے کی“ اس نے شخصی شجاعت کے اُس خیال کو مکمل طور پر ثابت کر دیا جو اس کے عہد میں عام طور پر بے پلا ہوا تھا۔ ذیل کے بہادرانہ اور وفادارانہ واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ ترکی سپاہی کس حد تک اس جوہر کا مالک تھا۔ تیمور کے بیٹوں میں سے ایک (جہانگیر) قمر الدین کا تعاقب کر رہا تھا اور بالآخر اسے پکڑ لیا۔ ایک سپاہی آگے نکل آیا اور ٹھکانہ لہج میں چلا اٹھا ”میں قمر الدین ہوں“ اور اپنے آقا کے بجائے ہلاک ہو گیا۔

قاسم کو کا اور بابر دونوں کو ایک روز بک قوم کے خان نے قید کر لیا۔ قاسم نے اپنے تئیں بابر ہونا ظاہر کیا اور ٹکڑے ٹکڑے

۱۵ کل تعلیم کا پچھپ خاکہ دیکھنے کے لئے ۱۶ ص ۱۷ اور اس کی نوٹس توڈو کا تھہ لٹری برٹن کی کتاب انٹیلیجنٹ سوسائٹی، ۱۷۷۷ء چھپنا چاہئے۔ مصنف

کر دیا گیا۔ اور بابر آزاد ہو گیا۔ بیرم خاں، ہمایوں کا ایک ممتاز عہدہ دار (اور نوجوان اکبر کا اتالیق) ایک دشمن کے ہاتھ میں اچانک گرفتار ہو گیا۔ ابوالقاسم ایک وجہ شخص بجائے بیرم کے سہو آچکڑا لیا گیا اور قریب تھا کہ ہلاک کر دیا جائے کہ بیرم نے آگے قدم بڑھا کر دلیرانہ آواز سے کہا ”میں بیرم ہوں“ ابوالقاسم نے کہا ”نہیں“ وہ محض میرا خدمتگار ہے اور چونکہ بہادر اور مطیع ہے چاہتا ہے کہ بجائے میرے خود ہلاک کر دیا جائے اس لئے اسے چھوڑ دو“ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ابوالقاسم قتل کیا گیا اور اس کا آقا بیرم بچ گیا۔ اکبر نے راجہ جے مل (جس کو اس نے اپنی دل پسند ہندو شکرگام کا نشانہ بنایا) اور اس کے بھائی کے بہادرانہ مقابلہ کے بعد چتور کا مشہور سنگین قلعہ تسخیر کیا۔ ان شریف عالی نسب دشمنوں کے غیر معمولی بہادری کی یادگار باقی رکھنے کی غرض سے اکبر نے دونوں کے بت (جو ہاتھیوں پر سوار تھے) دہلی کے پھاٹکوں پر نصب کرائے برنیر لکھتا ہے ”یہ زبردست ہاتھی جن پر دو بہادر سوار ہیں نہایت شاندار ہیں ان کو دیکھ کر ایک ناقابل بیان عجب و عروت کا خیال میرے دل میں پیدا ہوا“

ایک خوفناک بارہ فرد کرنے کی غرض سے اکبر نے تین ہزار سپاہیوں کی فوج لیکر چار سو پچاس میل کا سفر برسات کے موسم میں فونڈ کے اندر طے کیا۔ اور باغیوں کی فوج پر (جو اکبر کی فوج سے کہیں زیادہ تھی) جو خیموں میں بڑی سوہی تھی اچانک چھاپہ مارا۔ بعضی جوان میت ہو شیارھے بادشاہ کی موجودگی پر اعتبار نہ کر سکے کیونکہ اس کی فوج میں اس وقت کوئی جنگی ہاتھی تک نہ تھا۔ شاہی سرداروں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ دشمن پر یخیزی کی حالت میں اچانک حملہ کرنا بہادری کے خلاف ہے ہم اس وقت تک انتظار کریں گے جب تک کہ وہ بیدار ہوں، لہذا اکبر نے بجل بجانے والے کو حکم دیا کہ حملہ کا اعلان کرے۔ اسپر باغی فوج مقابلہ کو طیار ہوئی اور بالآخر بال بال کر دی گئی۔ ولیدمدی کے زمانہ میں جہانگیر کی طبیعت سخت سزا دینے کی طرف زیادہ مائل تھی جس کا اظہار کئی بار ہوا۔ ایک موقع پر اس نے ایک نوکر کی بابت حکم دیا جو اس کے ہلاک کرنے کی سازش میں شریک ہو گیا تھا کہ اس کی کھال کھینچ لیجاوے۔ جب یہ خبر پاپ کے کانوں تک پہنچی جس کی حکمت عملی ایسے معاملات میں ہمیشہ جداگانہ روش مکتبی تھی اور جو ظنی طور پر نہایت نیک تھا اس نے اپنے بیٹے کو نہایت سرزنش آمیز خط لکھا جس میں بہت کچھ لطم دہاں کی گئی تھی اور یہ کہتا تھا کہ ”اگر وہاں ایک بھی کھال کو اس کے جسم سے علیحدہ کیا جانا بغیر خوف نہ ہوئے ہیں دیکھ سکتے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیونکر ایسے شخص کا بیٹا ایک انسان پر اسی خوفناک سزا کا حکم دینا جائز رکھتا ہے“ تاہم اکبر جو بھی بعض اوقات نہایت کم سخن اور صندی ثابت ہوا ہے۔ ایک شہسخت اور کاہل ایلیچی کو جس نے دیر لگا لی تھی اس نے یہ تحریر بھیجی ”اگر تم اسد کے ساتھ دربار کو جلد واپس نہیں آتے تو تم دیکھو گے کہ تمہارا بھجراے اہل دعیال پر کیا گزرتی ہے“ اس کے بہت سے قصے ظاہر کرتے ہیں کہ وہ تند و تیز اور ہر گز نہ ہارنے والا تھا اور اس کی رحمدلی نے بتدریج ترقی پائی تھی۔

بادشاہ نماز مغرب کے بعد ٹھیکہ میں چلا جاتا تھا اس وقت خادم اتر اور دوسرے ملتے ہو جاتے۔ تھے اور جب بادشاہ کے ہونے وقت سمجھتے

پھر حج ہو جاتے تھے۔ ایک روز شام کو ایسا اتفاق ہوا کہ بادشاہ اپنے معمول سے ذرا پہلے محل آیا اور ایک بدنخت مشعلی کو اُس نے سوتے دیکھ لیا اور ایسا برہم ہوا کہ اسے مینار پر سے نیچے گرا دے جانے کا حکم دیا اور اس کا جسم پاش پاش ہو گیا۔ "محافظین کی بھی نہایت ذلت کی گئی اور ان کے بجائے دوسرے مقرر ہوئے۔"

محنت نشینی کے بارہویں برس جتوہ کے قیدی کر لینے پر آٹھ ہزار راجپوت تہ تیغ کئے گئے اور سترہویں سال میں اُس نے ایک قیدی کی زبان نکال لئے جانے کا حکم دیا۔ اٹھارہویں سال میں اُس نے تیمور کی طرح دو ہزار انسانی سروں کا مینار چنوا دیا اور اہل زندہ حکومت میں بہت موقعوں پر اس نے ظالمانہ اور وحشیانہ سزا دی، اور عقوبتوں کی منظوری دی یہ باتیں اسوقت کی ہیں جبکہ اکبر کے شباب کا زمانہ تھا اور اسوقت تک اس کے مزاج میں ابوالفضل کی صحبت کا اثر نہ پیدا ہوا تھا۔ لیکن ہر ایک ایسے وحشیانہ کاموں کے ساتھ ہی بیسیوں عاقلانہ اور نرم آمیز قوانین منضبط بیان کئے جاتے ہیں۔ حسن جلوس کے ساتویں برس اس نے حکم دیا کہ جو سپاہی لڑائی میں قید کئے جائیں ان کی بیویاں، اور بچے آئندہ سے ظلام نہ بنائے جائیں۔ آٹھویں برس جاتریوں پر جوناگور محمول قائم کیا گیا تھا معاف کر دیا نوں سال جزیرہ سو قوت کیا بیچیسویں سال کل باشندہ دکن مروجہ شامہ سی (معنا نام اور پیشہ) کی گئی تاکہ محصولات کا ادھار فردو بشر پر برابر رہے۔ اٹھائیسویں سال سنہی ہونے کی چیز رسم بند کی گئی۔ ہر اکبر نے اس قاعدہ کو خود موقع پر موجود ہو کر شکست کیا۔ یہ اور اس قسم کی بہت سی مثالیں پیش کیا جاسکتی ہیں۔

وہ نہایت جبری اور مجسم الفضا تھا اس کا منشا تاکہ وہ تمام آدمیوں کو جمع اور اس کی زیر نگرانی میں ایک ساتھ جکڑ دے وہ اس جدوجہد میں تھا کہ اپنی تمامی رعایا کا بادشاہ تسلیم کر لیا جائے اور اس کے یہاں ۱۵۰ منصب دار یعنی سواروں کے کمانڈر تھے جن میں سے ایک سو دس ہندو تھے یہ بالکل غیر ممکن تھا کہ ان سرداروں کے ماتحتوں پر اسلام کے سخت خانوں کے ذریعہ حکومت کی جاتی مذہبی رواداری ایک سیاسی مہارت تھی جیسا کہ لارڈ کینٹن نے اپنے اس نوٹ میں لکھا ہے جو اس نے اپنی نظم الیگر کے جواب میں تحریر کیا ہے ”اسکی مذہبی رواداری کا یہ عالم تھا کہ ہمارے ٹیوٹور بادشاہوں کو سرگرمیاں ہونا چاہئے۔“

۱۷۰۰ء کے زمانہ سے، ایک صدی قبل کثیر کے مسلمان قرائد اعلیٰ شاہ نے اپنے ہندو عا کا کو با تھرتاؤ کرنے میں بہت سی اصلاحوں کے بادی کرنے میں اکبر سے پیشقدمی کی تھی اس نے جزیرہ کو موقوف کیا۔ گاؤں کو فوج کیا جانا بند کیا۔ اس کے علاوہ علم و ہنر کا جڑا قدر دان اور سرگرم ہر بنی تھا۔ یہ اور اس قسم کے اور بہت سے معاملات سے اکبر کے کان آتا ہو چکے تھے اور کئی نئیسی کے بارہوں میں نتائج کثیر کے ذریعہ سے جسے فہمی ترتیب دے رہا تھا ان اصلاحوں کے اطلاع ہو چکا تھی، عام مذہبی آزادی کا اصول بھی ہندوستان میں کوئی نیا مسئلہ تھا۔

سولہویں صدی کے آثار نام تو دیر کھولنے سے اس اصول پر عمل کیا اور اس کی اشاعت کی مدد سے
 اسے بنگالہ میں سترہ سو ۷۱ء ق تک انتشار پھیل گیا اور ۱۸۷۸ء میں وفات پا کر ایسویں صدی کے انگریزی شعرا میں بڑا ہیہ رکھتا ہے۔ ۱۸۷۸ء میں کلمہ الشعرا
 کے لقب سے ممتاز واد ۱۸۷۸ء میں امارت کی درجہ میں ہو گیا۔

۳۵۰ عیدِ میلاد: حضرت خاتم النبیین پر قابض ہو کر وہ دنیا و مافیہا سے اس خاندان کا بچا ہوا شاہِ ہنری مہتمم ہو کر ان کا پرہیزگار اور خاندان کے دیگر اراکین پر بھی اتنی ہی خیر خواہی اور لبرل رویہ کو برقرار رکھ کر دنیائے مکی میں درجہ امتیاز حاصل کیا۔

ہر قسم کا عطر حضرت علی محمد علی باجوہ عطر لکھنؤ سے خرید کر لانا۔

از عقل سرکش کہ مشیر است موثق بردہم دل منہ کہ سفید است مغزی
شرمندہ باش و نظر خود کہ خویش را میزان کل لقب نبی و جشود و فزری
خواہی بسبر معنی ایشان و داری با خود ہلا ملی کن و با غیر شکاری
جان پدر ستارہ طالع بکام تو پیوستہ کے رود نہ فلک ابراری
حریف خلوت من عقل و ذوق من مست صبر و کلک کن با دوازا غنوں منست
عجب کہ حوصلہ روزگار بر تابد اگر ہون فگنم انچہ در و در منست
یہ اشعار اس کے غزلوں سے انتخاب کئے گئے ہیں۔

یہ کہ گذارم و زو طرح دل و گر نیم چند روز گری کند صبر دل و نیم را
گر چہ جاں بے تو لب نزدیک است دور بودن بآب نزدیک است
نا شکری عشق چوں تو ان کرد؟ غم بر سر غم فرد و مارا
حیران نسوں ساز غمی شکم کہ جفا از دید و دروں آید و درینہ بکجا
عجب ترا ز دل فیضی ندیدہ ام ظلم کہ ہم گہر و دہم محیط و ہم خواص
یہ مصرعے اس کی رباعیات سے منتخب کئے گئے ہیں جنہیں بادشاہ کی مدح سے تجاویز کر گئی ہے

خواہی کہ چوں راہ ہدیٰ بنشاسی نشاختہ شاہ را کجا بنشاسی
این سجدہ ناقبول سود نہ دہد اگر بنشاس تا خدا بنشاسی
۱۵۹۲ء تک اکبر کم سے کم ظاہر طور پر ایک سیدھا سادہ مسلمان تھا۔ اولیاء اشرکے عذرات پر جایا کرتا تھا۔ لیکن اس میں شبہ نہیں ہے کہ اس سے کچھ عرصہ پہلے اس کے دل میں مذہبی شکوک پیدا ہوتے تھے۔ ابوالفضل کی صحبت کے اثر نے اکبر کے خیالات کو بچتہ کر دیا جس سے اسکو مکمل تحقیقات کرنے کی تحریک ہوئی۔ شاہ نواز خان (۱۶۹۹ء) ایک معتبر شخص اکبر کے بارہویں بھتیجے

۱۵۹۲ء یعنی ایک ریاضیہ ہے ۵۵ قاضی کہ بعض ذوقون خواہش در راہ خدای بہنوں خواہش
ادور خداست ساہ چون خواہش اسی نام کی ایک ریاضی صاحب نے عالمگیری کا تالیف منسوب کر کے لکھی ہے جو شاہ جہان کے عہد میں بادشاہ نے کچھ نظم کی شرح پر مامور تھا۔
گروہ نوک خواست او شاہ دین و دامت زین کلاہ عاجم بدیل دباہ نیست
۵۵ سن طوس کے بارہویں سال اس نے چور کی خوشایا گریں بلا تک ایک حد تک پولیس وجہ سے لیکن زیادہ تر مذہبی خیال سے بھی یہ کلام بر باد کر دین والا کو خراب کر دیا۔ مصنف

”اس امر کا بار ہوا اعلان کیا گیا ہے کہ ابوالفضل کا فر تھا لیکن یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ وہ وحدت الوجود کا قائل تھا۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ وہ اعلیٰ صفات کا شخص تھا اور خلق افشد کے ساتھ صلح کل چاہتا تھا۔ وہ اپنے دشمنوں کے حق میں عالی حوصلہ تھا اور جوں لہو کے معاملہ میں نہایت ایسا نڈر اور استباز تھا۔ وہ بڑا نازک خیال فشی تھا۔ لوگوں کے دل اکبر کی تلوار سے زیادہ ابوالفضل کے قلم سے دہشت زدہ تھے۔“ یہ اعلیٰ درجہ کا مدبر و فادار اور جان نثار وزیر، ایک فیاض مرئی اور خیر اندیش دوست تھا۔ اکبر کی حکومت کی جو کچھ عظمت قائم ہوئی اس میں بڑا حصہ ابوالفضل کا تھا۔

ملا عبد القادر بدایونی (جو اکبر کے عہد کا بڑے مورخ اور زبردست عالم تھا) ابوالفضل کی نسبت کہتا ہے کہ ”اکبر بہ نسبت میرے اس پر زیادہ عنایت کرتا تھا۔“

”اکبر کی خدمات کی بجائے وہی دنیا کی، زمانہ سازی، ریا کاری، بادشاہ کی مزاج دانی، اور بچہ چالوسی سے اس کا منظور نظر بن گیا تھا۔ ابوالفضل کی چالوسی واقعی بسا اوقات حد سے زیادہ بڑھ جاتی تھی لیکن نہ اتنی زیادہ جتنا کہ اس زمانہ کا مقتضا تھا۔ وہ اس معاملہ میں ایسا نادان نہ تھا جیسا کہ وہ درباری جس نے بادشاہ سے یہ کہا تھا کہ مقام مارے پر بارش کی یانی میں ترسی نہ تھی۔ ابوالفضل (اپنی غرض نصیبی سے) (جس کا وہ درحقیقت سخت تھا) وزارت کے درجہ تک پہنچ گیا۔ لیکن ملا صاحب کہتے ہیں ”اپنی نا تجربہ کاری اور ساوگی کے سبب ترقی نہ کر سکا“ اس میں شک نہیں کہ ملا صاحب اپنی بد نصیبی کے خود ذمہ دار تھے کیونکہ انھوں نے بہت سے دشمن بنائے تھے اور ایسے غافل تھے کہ دلوں بلا اجازت اپنی خدمات سے غیر حاضر رہے بادشاہ ان کو پسند نہ کرتا تھا اور ایک موقع پر عین دربار میں ان سے نہایت ترش رو ہو کر سخت گلائی کی تھی، چنانچہ بدایونی کہتے ہیں کہ اس دن سے میں اپنا گستاخانہ طریقہ اور بحث و تکرار کی عادت ترک کر دی۔“ ابوالفضل اور فیضی ہمیشہ بدایونی پر قریب چالیں برس سے مہربانی کا برتاؤ کر رہے تھے لیکن ملا صاحب ان کو ہمیشہ ملامت کرتے رہے جس کا سبب ایک حد تک بلاشبہ ان کی کامیابی پر محض ذاتی حسد تھا بلکہ یہ کہنا مناسب ہے کہ وہ ایک سچے دیندار مسلمان تھے اور ان دونوں آزاد خیال دہریوں کے قول و فعل سے آگے دن ان کے مذہبی عقاید کی تحقیق کجاتی تھی۔

ملا صاحب کو بالکل انہی مرضی کے خلاف، شاہی کتب خانہ کے لئے جماعت کا فارسی ترجمہ کرنے کی ہدایت کی گئی۔ ایک دیندار شخص کے لئے یہ کیسا کام تھا! چنانچہ لکھتے ہیں کہ ”میں نے (اٹھارہ فنون میں سے مترجم) (دفعہ کا ترجمہ کیا جو طفلانہ اور یہود خیالات سے بڑھ ہے اور جسے بڑے بکھر خونی خدا حیرت میں آجائگی ایسے ایسے احکام ہیں جو کسی نے آج تک نہ سنے ہوں گے۔ بہت سی چیزوں کے لئے سخت ممانعت کی گئی ہے اور شلیم کھانے کی تو سخت ممانعت ہے، لیکن یہ میری قسمت کی غیبی ہے کہ میں ایسے کام پر مامور کیا گیا ہوں!“ ابوالفضل نے اس کا دنیابہ لکھا۔ ملا صاحب نے راسن کا بھی ترجمہ کیا تھا۔ اس کام میں چار برس کا زمانہ صرف ہوا۔ اس کتاب کا ترجمہ

جواہرات کی چوری

(فلسفہ)

ارتکاب جرم

(۱)

انسان کے ضمیر کے متعلق ادھر ادھر کی بہت سی باتیں کہی جا چکی ہیں اور یہ مان لیا گیا ہے کہ انسان کی آزدگی یا آسودگی کا

دار و مدار ضمیر پر ہے خواہ وہ منفعل ہو یا غیر منفعل۔

اس میں شک نہیں کہ اگر انسان کی ضمیر کو اپنے کردار کا احساس نہ ہو تو اسے آزدہ خاطر ہونے کی کوئی وجہ نہیں لیکن یہ نظریہ قوی دلائل پر قائم نہیں اور پھر یہ بھی ممکن ہے کہ ایک نہایت راسخ ضمیر بھی بعض مواقع پر غیر منفعل رہے اور مواقع بھی مری جو ایک کمزور سے کمزور ضمیر کو عرق انفعال میں غرق کر دیں۔ علاوہ ازیں یہ بھی واقعہ ہے کہ خوش قسمتی سے بعض آدمیوں کی کوئی ضمیر ہوتی ہی نہیں اور اس وجہ سے وہ عوام الناس کی طرح شک و شبہ میں مبتلا ہی نہیں ہوتے۔

مثال کے طور پر ابراہیم کو ہی لیجئے اس کے بھروسے سے ہر وقت خیر خواہی اور سہمدردی عیاں تھی۔ کوئی شخص اس کے متبسم، بشارت کشاں، چہرے کو دیکھ کر یہ گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ مجرم ہے اور اس کا پابند سووم و صلوات ملازم جو اسے ہمیشہ مکان میں خوش و خرم ادھر ادھر گائے لٹکاتے ہوئے دیکھتا اس کی شاکستگی کا شاہد تھا۔

ابراہیم کی آمدنی بھی اوسط درجے کی تھی اور وہ آسودہ زندگی بسر کرتا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی آمدنی کا ذریعہ چوری تھا یہ کام بہت مشکل اور خطرناک ہے لیکن اگر احتیاط کو ہاتھ سے نہ دیا جائے تو ایسا خطرناک بھی نہیں ہے۔ ابراہیم حدود درجہ محتاط تھا۔ وہ ہمیشہ تنہا کارروائی کرتا اور کسی سے مشورہ و تذکرہ نہ کرتا۔ اس کا کوئی ساتھی ہی نہ تھا کہ کبھی سرکاری گواہ بن سکتا۔ کوئی اس کا راز دہی نہ تھا کہ غصے کی حالت میں خفیہ پولس کو اطلاع دیدیتا اور نہ وہ طماع و مسرف تھا جیسا کہ اکثر مجرم ہوتے ہیں اور اسکی ترکیبن بڑی ہوشیاری کی ہوتی تھیں اور راز کے ساتھ عمل میں لائی جاتی تھیں اسی طرح آمدنی بھی دانائی کے ساتھ سیونگ بنک میں جمع کر دی جاتی تھی۔

ابتداءً ابراہیم جواہرات کی تجارت و حرفت سے دلچسپی لیتا تھا اور اب بھی کبھی کبھی اس کا اظہار ہو جاتا تھا لیکن دوسرے تجارتی اسپر شہ بہ کرتے تھے کہ وہ ناجائز اور ممنوع طور پر مسروقہ جواہرات کی خرید و فروخت کرتا ہے۔ مگر ابراہیم ہر ممکن بشارت

اتھوہم کے ساتھ اپنی زندگی بسر کر رہا تھا جو کچھ وہ جانتا تھا بس وہی جانتا تھا اور بھبھوہی اس کے خریدار اس سے متفرق نہ ہوتے تھے۔ اکتوبر کے مہینے میں ایک شام جبکہ وہ اپنے باغ میں چیل قدمی کر رہا تھا تو آبی درجے کی خوشحالی کا مجسمہ معلوم ہوتا تھا وہ لباس اس کے زیب تن تھا جسے وہ اکثر بھبھوہی کے سفر میں استعمال کرتا تھا۔ اس کا بیگ بیٹھک میں کرسی پر تیار رکھا تھا جو اہرات کا ایک ہنڈل جو اس نے دیاننداری سے آگے میں خریدے تھے اور کسی قسم کے نامناسب سوالات سے بچنے والوں سے نہیں کہتے تھے، اس کی واسکٹ کی اندرونی جیب میں تھا۔ ایک دوسرا بیٹھک اس کے دھپنے بوٹ کی ریڑی کے خلا میں پوشیدہ تھا ڈیڑھ گھنٹے میں اس کی روانگی کا وقت ہو جانے والا تھا اور اس کی آمدنی کس طرح بنک میں داخل کی جائے اس مسئلے پر غور کرنے اور ٹھٹھنے کے علاوہ کوئی اور کلام اسی اتنا میں نہ تھا۔ اس کا مذہم سودا خریدنے کے لئے شہر گیا ہوا تھا۔ اور شاید رات کے گیارہ بجے تک اسے وہیں نہ آنا تھا اس لئے وہ بنگلے پر تہنا تھا اور اسی وجہ سے کسی قدر کچھ یونہی سا۔ مکدر وہ باغ سے لوٹ کر بنگلے میں داخل ہوئی تو اسی ہی تھا کہ اسے باغ کے قریب سے گزرنے والی کچی سڑک پر کسی کے پیروں کی آہٹ سنائی دی وہ ورک گیا اور کان لگا کر سننے لگا۔ بنگلے کے آس پاس کوئی اور مکان نہ تھا جہاں یہ جا رہا ہے تو پھر کوئی ملاقاتی یا ہمارا ہے؟ یہ بھی قرین قیاس نہ تھا کیونکہ ابراہیم کے بنگلے پر شاید وہاں ہی کوئی ملنے آتا تھا۔ اس شانیں قدموں کی آہٹ قریب تر ہو گئی اور بنگلے کی کچی سڑک پر زیادہ جھناکت کے ساتھ آنے لگی ابراہیم باغ کے دھارے تک آیا اور جھک کر تجسس لگا ہون سے دیکھنے لگا۔ عین اس وقت روشنی کی چمک میں اسے کسی شخص کا چہرہ نظر آیا جو سکرٹ سلگا رہا تھا۔

— یہ شخص آگے آیا اور باغ کے مقابل ہکا بک گیا۔ اجنبی نے سکرٹ منہ سے نکال کر دھوان چھوڑا اور پوچھا — ”کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ یہ سکرٹ اسٹیشن کو جاتی ہے؟“

— ابراہیم نے جواب دیا۔ ”جی ہاں، کچھ آگے چل کر الپ اور پکڈنڈی ہے جو اسٹیشن کو جاتی ہے۔“

— ”پکڈنڈی“ اجنبی نے ترشی سے کہا ”انہوں نے تو نا کہ میں دم کرو یا۔ میں صدر سے چلا تھا کہ ٹھٹھا ہوا اسٹیشن پہنچ جاؤں گا اور اسی وجہ سے بختہ سڑک پر روانہ ہوا مگر کسی گدھے نے کہہ دیا کہ پکڈنڈی ہو جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ گدھے سے نصف گھنٹے سے اندھیرے میں ادھر ادھر ٹھہر کر رہا ہوں میری نگاہیں سیدھ رکھ کر رہے۔“

— ”آپ کس گاڑی سے جائیں گے؟“ ابراہیم نے پوچھا۔

— ”جو سات بج کر اٹھاون منٹ پر جاتی ہے۔“

— ”میں بھی اسی گاڑی سے جانے والا ہوں، لیکن ابھی ایک گھنٹہ اور انتظار کروں گا۔ اسٹیشن بیان سے باغ چھوڑا ناگ ہے۔ اگر آپ جا ہیں تو اندر تشریف لائے۔ ذرا آرام کیجئے۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ چلیں گے اور پھر آپ یقیناً راستہ نہ بھولیں گے۔“

آپ کی بڑی عنایت ہے اجنبی نے تاریکی میں مجھے کی طرف ذرا غور سے دیکھتے ہوئے کہا رہا حالانکہ وہ عینک لگائے ہوئے تھا مگر میں خیال کرتا ہوں۔“

”ایڈیشن پر استخارہ کیا یہیں نہی“ ابراہیم نے اپنے مخصوص انداز سے دروازہ کھولتے ہوئے کہا اجنبی ایک لمحہ توقف کے بعد داخل ہوا اور اپنا سگریٹ پھینک کر ابراہیم کے عقب میں بنگلے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ کمرے میں تاریکی تھی لیکن ابراہیم نے اپنے ہمان سے پہلے کمرے میں داخل ہو کر لمپ روشن کیا۔ لمپ روشن ہوتے ہی کمرہ جگمگا اٹھا اور دونوں آدمی باہمی تجسس آمیز نگاہوں سے ایک ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

”سیٹھ یوسف! ابراہیم نے اپنے ہمان کو دیکھ کر آہستہ سے خود بخود کہا۔“ اور مجھے بچا تھا بھی نہیں۔ اتنے برسوں کے بعد بچان بھی کیا سکتا ہے بنگاہ الگ کمزور ہے“ کرسی پر تشریف رکھتے ”اس نے باواز بلند کہا۔“ آئے چائے پی میں وقت ہی طرح گزرے آپ چائے تو پیتے ہوں گے؟“

یوسف نے چائے کی دعوت قبول کی اور ابراہیم نے ایک الماری کھولی۔ یوسف نے اپنی ٹوپی گوشے میں یک کرسی پر رکھ دی اور اپنا بیگ میز کے کنارے پھینک کر چھتری میز کے ہمارے کھڑی کردی اور خود آرام گاہ پر بیٹھا ابراہیم نے چائے تیار کی اور دونوں نے پینا شروع کیا۔

”کیا بسکٹ نہ لیجے گا؟“ ابراہیم نے کئی آگے بڑھائے ہوئے کہا کشتی میں نکل کی جا رہی تھی وغیرہ اور دو نہایت عمدہ بلوریں چائیاں رکھی تھیں جن پر تارے منقوش تھے۔

”شکریہ یوسف نے کہا۔“ ریل کا سفر دلکش ہے اور اس پیدل سفر نے ابھی سے کافی۔“

”جی ہاں“ ابراہیم نے فوراً کہا ”حالی ہیٹ سفر کرنا درست نہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ کو یہ بسکٹ ناگوار نہ ہوں گے اتفاق سے کسی اور قسم کے موجود نہیں۔“

یوسف نے اسے اطمینان دلایا کہ اس قسم کے بسکٹ وہ ہمیشہ پسند کرتا ہے اور اس بات کی تائید کے طور پر اس نے بہت کم دودھ کی ایک پیالی بنا کر بسکٹ مزے لے لیکر کھانے شروع کئے۔

یوسف خوش خوراک آدمی تھا اور اس موقع پر اسے اشتہا بھی بہت تھی۔ چونکہ وہ چائے بڑے اطمینان سے پی رہا تھا اور بسکٹ اس سے بھی زیادہ سکون سے کھا رہا تھا اس نے گفتگو زیادہ نہ کر سکتا تھا۔ بس گفت و شنید کا سلسلہ ابراہیم ہی کھینچی رکھنا پڑا اور اپنی تمام زندگی میں اس خوش مزاج بدعاش کو پہلا موقع تھا کہ اسے باتیں کرنے میں کچھ تشویش کچھ تکلف کچھ جھجکا احساس ہوا جب قاعدہ اسے اپنے ہمان کی منزل مقصود اور شاید غرض سفر و زیارت کرنی چاہئے تھی۔ لیکن یہی وہ باتیں تھیں

جن سے ابراہیم گم کر کے تاجا پتا تھا۔ کیونکہ اسے دونوں باتیں معلوم تھیں۔
یوسف بواہرات کا بڑا مانجر تھا۔ اس کا کاروبار نوب پل رہا تھا اور اس ناس نامرشدہ حالت میں خرید کر لیا تھا اور اسے
سیروں کی اسے بہت شناخت تھی اسے معلوم سے زیادہ جیسے اور قیمتی جواہرات خریدنے کا شوق تھا۔ اور اس کا یہ معمول سب کو معلوم
تھا کہ سب اس کے پاس سیروں کی کافی تعداد جمع ہو جاتی ہے تو وہ بدانت خود اس کو بیسی لیا تاکہ اس کی تلاش وغیرہ کا اتمام
کرتا ہے ابراہیم بھی اس بات کو جانتا تھا اور اسے کسی قسم کا شبہ نہ تھا کہ یوسف اب اس غرض سے روانہ ہو رہا تھا۔ وہ جانتا تھا
کہ اس کی حقیر پوشاک کے کسی کہنے میں کاغذ کا ایک پیکٹ پوشیدہ تھا جو غلبہ گئی ہزار کی مالیت کا تھا۔

یوسف نے بیشاپز ایسٹ چپا چکر کھا رہا تھا اور بہت کم گفتگو کرتا تھا۔ ابراہیم اس کے مقابل بیٹھا اور کسی قدر اضطراب آمیز لہجے میں باتیں کر رہا تھا اور کبھی کبھی بالکل بے ٹکی بات کہہ جاتا تھا۔ اپنے نمان کو وہ نہایت دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ ابراہیم قہقہہ خفاصکر ہیرے، اڑانے میں بہت مشتاق تھا۔ چاندی سوسے کے زیور سے وہ سخت گریز کرتا تھا۔ اور سوائے نقد سکوں کے کچھ اور بھجوتا ہی نہ تھا لیکن ہیرے جن کی کافی تعداد وہ اپنے حوتے کی اڑی میں پوشیدہ کر کے لجا سکتا اور آسانی سے فروخت کر سکتا تھا۔ اس کی کاروباری دنیا کی جان تھی۔ اور اب اس کے ساتھ ایسا آدمی بیٹھا تھا جس کی جیب میں ہیروں کا پیکٹ تھا جس کی قیمت ابراہیم کی دس بارہ چوریوں کی آمدنی کے برابر ہوگی۔ وہ اپنے دل میں خیال کر رہا تھا کہ ان ہیروں کی قیمت شاید — یہ ایک اُس نے اپنے اوپر قابو حاصل کر کے جلدی جلدی باتیں بنا کر شروع کیں۔ گو وہ کچھ بے ربط یقین کیونکہ دوران گفتگو میں غیر ارادی طور پر اور الفاظ بھی اس کے منہ سے نکل جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا دماغ دو جہاں کا نہ سلسلہ خیالات میں بھٹسا ہوا تھا۔

مذکر کل شام کی وقت سر دی ہو جاتی ہے " ابراہیم نے کہا۔

”ہاں جو تو جانتی ہے“ یوسف نے کہا اور پھر بسکٹ کھانے شروع کر دئے

کم سے کم پچھتہ ہزار ابراہیم کو خود بخود خیال پیدا ہوا "اور شاید اسی... نوے... یا ایک لاکھ!" ابراہیم انہی کڑی پر بے جبینی سے حرکتیں کر رہا تھا اور اس نے اپنے خیالات کو کسی دیکھ بپ موضوع پر جمع کرنے کی کوشش کی۔ اس کے دماغ کی حالت عجیب تھی اسے ناگوار تھی۔

— کیا آپ بلغے دیکھی رکھتے ہیں؟ ” اس نے دریافت کیا۔ ہیرزن کی آغوش اور سیونگ جبک کے حساب کے بعد اگر اُسے کسی چیز سے شوق تھا تو ہمیا کی کاشت سے۔

— ”میرے مکان کے قریب کچنی گارڈن ہے“ یوسف نے تراجعت سے مسکرا کر کہا اور وہ یکایک خاموش ہو گیا پھر کہا ”شاید آپ کو معلوم ہو، میرا مکان دہلی ہے“

ابراہیم نے اس بے موقع وقفے کو محسوس کیا اور اس کی وجہ بھی وہ یہ کہ سانی سمجھ گیا۔ جو آدمی اس قدر مال اپنے ساتھ لجا رہا ہو اسے گفتگو میں احتیاط رکھنی لازم ہے۔

”ٹھیک ہے“ اس نے بے توجہی سے جواب دیا ”ایک دہلے کو باغ سے کچھی ہونا مشکل ہے اور پھر اس نے اپنے دل میں حساب لگانا شروع کیا۔ فرض کرو کہ پچھتر ہزار میں فروخت ہوئے اس کا سود سیونگ بنگ میں کیا ہو گا؟ اگر وہ کالین خریدیں مگر تو کیا آمدنی ہوگی؟ پچھلی مرتبہ اس نے جو دو کالین خریدی تھیں ان میں سے اوسطاً ہر ایک کی قیمت پونے چار ہزار تھی اور ماہوار کرایہ چودہ روپیہ اس حساب میں پچھتر ہزار میں بیس دوکانیں خریدی جاسکتی ہیں ایک ماہ میں دو سو اسی روپیہ کرایہ، فوراً دو روپیہ روزہ — سو تیس ہزار روپیہ سال کے قریب! — اور ساری عمر کے لئے! یہ جائداد مع اسکی موجودہ دولت کے واقعی جائداد و کملائے کی متقی ہوگی۔ اتنی آمدنی پر وہ اپنے پیشے کو ترک کر کے باقی زندگی امن و اطمینان گزار سکتا تھا!

اس نے نکلیوں سے اپنے ہمان کی طرف دیکھا اور پھر فوراً ہی اپنی نگاہ پھیر کر کیونکا سے احساس ہوا کہ اس کے دل میں وہ مجراۂ خواہش پیدا ہو رہی تھی جس کو وہ بیان نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اس خواہش کو دل سے نکال دینا چاہتا تھا۔ وہ کسی بھی روح کے قتل کو دیوبند بن سے تعبیر کرتا تھا یہ سچ ہے کہ ایک مرتبہ اس نے ایک سپاہی پر ہاتھ صاف کر دیا تھا۔ مگر وہ واقعہ خلاف توقع تھا اور صورت حالات ناگزیر۔ اس کے علاوہ ساری خطا تو پوسین کی تھی۔ راہ امر ترستیں دربان والا واقعہ سوا اس کی بات یہ ہے کہ اگر وہ احمق اتنی بری طرح نہ چلاتا تو خیر وہ اتفاق تھا اور یقیناً بڑا افسوس ناک اتفاق اور ابراہیم سے زیادہ کسی کو اس حادثہ کا رنج نہ ہوگا۔ مگر جان بوجھ کر قتل کرنا، اور مال اڑا لینا! یہ تو بالکل پاگل آدمی کا کام تھا!

ہاں اگر وہ اس قماش کا آدمی نہ ہوتا تو تمام عمر کے لئے چین ہی چین تھا۔ زرکیز، سنسان گر، دونواح، خالی مکان، سڑک سے دور اور دوسرے بنگلوں سے فصلاً، رات کا وقت اور رات بھی اندھیری — مگر نفع کے بارے میں بھی تو سوچنا چاہئے یہ بڑی وقت تھی۔ نقش کا کیا انتظام کیا جائے۔ ابراہیم یہ سوچ رہا تھا کہ اس نے ریل کی سیٹی کی آواز سنی جو مکان سے کچھ دور عقب کی جانب سے گزرتی تھی۔ اس آواز نے اس کے دماغ میں نیا سلسلہ خیالات چھڑک دیا اور دوران تخیل میں اس کی آنکھیں پونے بج گئیں جو اطمینان سے بیٹھا ہوا چائے پنی رہا تھا۔ آخر کار اس نے کوشش کر کے اپنی نظر پھیری اور یکایک اپنی کرسی سے اٹھ کر سائے آتش دان پر کھڑی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھنے لگا اور اپنے ہاتھ آگ کی طرف بڑھا دیئے۔ اس کے احساسات میں تلاطم سا پنا تھا اور بار بار اسے کوئی اندر دینی طور پر تاکید کرتا تھا اس مکان کو چھوڑ کر چلا جائے اس کا جسم کانپنے لگا تو بہ نسبت سردی کے گرمی زیادہ محسوس کر رہا تھا اس نے پیچھے پھر کر دروازے کی طرف دیکھا۔

بڑی سرد ہوا چل رہی ہے۔ اس نے ذرا کپکپاتے ہوئے کہا۔ معلوم میں نے دماغ اچھی طرح بند کیا تھا یا نہیں؟ وہ کہہ کر

وہ اتنا قریب تھا کہ اگر وہ اپنا منہ پھیر لیتا تو اس کا۔ سانس یوسف کے سر کے بالوں کو جنبش دیتا۔ نصف منٹ تک وہ اسی طرح بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ وہ جبری قاتل کی مانند خوفناک روشنی آنکھوں سے بے خبر تاجروں جواہر کو بغور سے دیکھ رہا تھا اور اس کا سانس تیزی سے لیکن ہلاکی آواز کے اس کے کھلے ہوئے منہ سے گزر رہا تھا۔ اس کی انگلیاں مینابی سے متحرک تھیں اور پھر ایسی ہی خاموشی کے ساتھ وہ اسٹاپاؤن دروازے تک واپس آیا اور منہ پھیر کر جلدی سے باورچی خانے میں چلا گیا۔ اور وہاں پہونچ کر اس نے ایک گھبراہٹ سے لیا۔ معاملہ نازک ہو چکا تھا۔ یوسف کی جان بچ گئی تھی۔ وہ نہ مار دینا کچھ مشکل نہ تھا۔ جب وہ یوسف کی کرسی کے پیچھے کھڑا تھا۔ اگر اس کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار ہوتا۔ کوئی پتھری ہوتا تو..... اس نے باورچی خانے میں ہر طرف نگاہ دوڑائی اور اس کی نظر ایک لوہے کی سلاخ پر پڑی جسے وہ مزدور دہان پڑا چھوڑ گئے تھے جنھوں نے باورچی خانے میں جنگ لگایا تھا۔ یہ ایک قتل لمبی اور ایک اپن مربع موٹی تھی۔ اگر ایک منٹ پہلے اس کے ہاتھ میں یہ سلاخ ہوتی تو.....

اس نے سلاخ کو اٹھا لیا۔ ہاتھ میں تول کر دیکھا اور اپنے سر کے پار میں طرف گھمایا۔ بڑا غمزدہ وں ہتھیار تھا۔ آواز ہونے کا بھی خبر نہ تھا اور اس نے جو ترکیب اپنے ذہن میں ترتیب دی تھی اس کے موافق بھی تھا۔ ماحول ولاقوتہ! کیا یہ وہود خیال ہے مجھے اسے یہیں ڈال دینا چاہئے۔ اس نے خیال کیا۔

لیکن اس نے سلاخ کو پھینکا نہیں۔ وہ دروازے تک آیا اور یوسف کو اسی طرح بیٹھے ہوئے اور اطمینان سے سگریٹ پینے ہوئے پایا۔ اس کی رشتہ منور باورچی خانے کی طرف تھی۔

یہ ایک ابراہیم پر ایک دوسری کیفیت طاری ہو گئی۔ اس کا چہرہ تہمتا گیا اس کی گردن کی رگیں پھول گئیں۔ اس کے چہرے پر خوفناک وحشت نمایاں ہو گئی۔ اس نے اپنی جیب سے نکال کر گھڑی کو بغور دیکھا اور چہرہ میں رکھ لیا پھر قریب لیکن خاموشی سے بیٹھنے کے کرنے کی طرف بڑھا۔

اپنے شکار کی کرسی سے ایک قدم پیچھے وہ رکا اور احتیاط سے نشانہ لیا۔ سلاخ ہوا میں گھومی لیکن اس کی حرکت سے خفیف سی سرسراہٹ کی آواز ہوئی کیونکہ یوسف نے اک دم پچھپا کر دیکھا جس سے قاتل کا وار اوچھا بڑا اور سلاخ یوسف کے سر میں اچھٹی ہوئی لگی اور معمولی سا زخم آیا۔ یوسف فوراً ہلکا کر کھڑا ہو گیا اور حملہ آور کے بازو غیر معمولی سختی سے پکڑ لئے موت کے خوف سے اس کے اٹھنا کو توانائی دیدی تھی۔

دونوں آدمی ایک دوسرے سے تنگی ہو گئے اور گفتگو شروع ہو گئی آپس کی کشتی میں کرسی لوٹ گئی اور میز پر سچا۔ کے کی بوری پیا لیاں گر کر چکنا چور ہو گئیں۔ یوسف کا چہرہ بھی گرگمہ پروں میں کھل گیا۔ یوسف کے منہ سے تین مرتبہ ایک خوفناک، یاس آمیز وحشت زدہ چیخ نکلی اور باوجود اس کے کہ ابراہیم پر خون سوار تھا وہ خوفزدہ ہو گیا کہ سب کوئی اتفاقی راہگیر ان جینوں کو نہ سن لے۔

اس نے اپنی تمام طاقت آخری کوشش کے لئے مجتمع کر کے یوسف کو میز پر بٹخا دیا اور میز پر پوش کا ایک کونہ اس کے سر پر ڈال دیا اور پھر جو یوسف نے چلانے کے لئے منہ کھولا تو وہی میز پر پوش اس کے منہ میں ٹھوس دیا۔ دو منٹ تک دونوں ایسی طرح یہاں جس پرٹ رہے رہے۔ جب سانس کی حرکت بالکل بند ہو گئی تو ابراہیم نے اپنی گرفت ڈھیلی کی اور یوسف کا مہرہ جو میز پر پھیل کر زمین پر گر پڑا۔
 دھمت کا قصہ تمام ہو گیا تھا، انجام خواہ نیک ہو یا بد۔ ابراہیم کھڑا ہوا اور یوسف کی بیٹھالی سے پسینہ مانا کرتے ہوئے اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ سات بجے میں صرف ایک منٹ تھا۔ ساری کارروائی میں کچھ اور تین منٹ صرف ہوئے تھے۔
 کارٹی جانے میں ایک گھنٹہ باقی تھا اور ابراہیم کو تمام کام اسی روز انجام دینا تھا۔ مال کارٹی جس کا اس تبدیلی سے بہت حلق تھا سات بجکر میں منٹ پر مکان کے عقب میں صرف تین سو گز کے فاصلے سے گزرتی تھی۔ مگر وقت ضائع کرنا ٹھیک نہ تھا اب ابراہیم کی طبیعت بالکل مطمئن تھی۔ اسے فکر تھا تو کیونکہ یوسف کی جینیں کسی نے نہ لی ہوں اور اگر کسی نے نہیں سنبھالی... بچ کر کیا تھا! اُس نے جھک کر آہستہ آہستہ میز پر پوش نقش کے منہ سے نکال کر احتیاط سے اسکی جیبوں کی تلاشی اپنی شریعت کی اور پھوڑی ہی دیر میں اپنی مطلوبہ شے کو پایا۔ اس نے کاغذ کے پیکٹ کو دبا کر دیکھا۔ سنگ ہائے پیش ہما کی رگڑ کی آواز سکر گناہ کی تمام پشیمانیان خوشی میں تبدیل ہو گئیں۔

پھر وہ باقاعدگی اور پھرتی کے ساتھ اپنے کام کی طرف متوجہ ہوا۔ لیکن گھڑی کی طرف بار بار دیکھتا جاتا تھا خون کے چند بڑے بڑے قطرے میز پر پوش پر گر گئے تھے اور نقش کے سر کے قریب قالین پر بھی ہو کا ایک بڑا داغ پڑ گیا تھا۔ ابراہیم باورچی خانے سے پھوڑا سا پانی اکھڑا اور سخت بالوں کا برش لایا۔ میز پر پوش پرٹ سے تمام دھبے دھو ڈالے اور میز پر پوش کے نیچے سے پھر جو داغ ہو گئے تھے ان کو بھی صاف کیا۔ قالین کو بھی صاف دھویا اور دھینگے ہوئے مقامات کو کپڑے سے خشک کر دیا۔ نقش کے سر کے نیچے ایک کاغذ رکھ دیا تاکہ پھر قالین پر خون نہ گرے میز پر پوش کو عمدہ طریقے سے بچھا دیا۔ کرسی کو سیدھا کیا۔ ٹوٹی ہوئی عینک کو فرش پر سے اٹھا کر میز پر رکھا۔ آدھا جلا ہوا سگریٹ جو ہاتھ پائی کے دوران میں پائٹا ہو گیا تھا اٹھا کر آستان میں پھینک دیا۔ شیشے کے تمام ٹکڑے جو فرش پر پڑے تھے بکھا کوئے کچھ تو بیانیوں کے ٹکڑے تھے اور کچھ ٹوٹی ہوئی عینک کے ریزے اس نے سب کو کاغذ کے ایک تختہ پر رکھ کر نہایت احتیاط سے دیکھ کر عینک کے تمام ٹکڑے بڑے ٹکڑے جو حفاظت میں آسکتے تھے علیحدہ کاغذ پر رکھے اور کچھ مختلف ذرے ان میں آمیزش کئے۔ شیشے کے باقی ماندہ ریزوں کو اُس نے مکان کے عقب میں کوڑے کے دھڑ پر ڈال دیا۔

چلنے کا وقت ہو گیا تھا۔ ابراہیم نے جلدی سے ڈوری کے گچھے میں سے ایک ٹکڑا نکال کر یوسف کا بیگ اور جیب میں ایک جگہ باندھ کر اپنے نشانے پر نکلائی۔ عینک کے شیشوں والے کاغذ کی پوٹیا باندھ کر منع چشمے کے فریم کے اپنی جیب میں رکھی۔ نقش کو

کنڈے پر ڈالا۔

یوسف دبلا پتلا آدمی تھا، وزن میں ڈیڑھ سونے سے زیادہ نہ تھا اور اتنے وزن کا اٹھالینا ابراہیم جیسے توانا اور تنومند کسرتی آدمی کے لئے کوئی مشکل بات نہ تھی۔

رات بالکل تاریک تھی اور جب ابراہیم نے اپنے نیگلے کے عقبی دروازے سے اس اجازت میدان پر نگاہ ڈالی جو نیگلے سے ریل کی لائن تک پھیلا ہوا تھا تو اسے شکل سے میں گز فاصلہ کی چپ سے نظر آتی تھی۔ کچھ دیر احتیاط سے کان لگا کر سنا اور جب کوئی آواز نہ سنائی دی تو وہ باہر نکلا۔ دروازہ آہستہ سے بند کیا اور تیز لیکن محتاط قدموں سے ناہموار میدان کو طے کرنا شروع کیا۔ اگلے رفتار اتنی خاموش نہ تھی جتنی کہ وہ چاہتا تھا کیونکہ اگرچہ وہ چھوٹی مچھوٹی گھاس جو وہاں اگی ہوئی تھی اس کے قدموں کی آواز کی مانند تھی۔ لیکن بیگ اور چھتری جو اس کے شانے پر آویزاں تھے نہایت پریشان کن طریقے سے کھڑکھڑاتے تھے اور اسکی رفتار میں بہ نسبت وزن کے یہ دونوں اشیاء زیادہ غل ہوتی تھیں۔

ریل کی لائن تک تقریباً تین سو گز کا فاصلہ تھا۔ عام طور پر وہ اس فاصلے کو تین چار منٹ میں طے کر سکتا تھا لیکن اب جبکہ وہ اپنے بوجھ کی وجہ سے احتیاط کے ساتھ چل رہا تھا اور کبھی کبھی جھک کر کسی آہٹ کو سننے کی کوشش کرتا تھا کہ کوئی آہٹ نہیں رہا۔ اس فاصلے کے طے کرنے میں پورے چھ منٹ لگے اور وہ ان تاروں تک پہنچ گیا جو میدان کو ریل کی لائن سے جدا کرتے تھے یہاں پہنچ کر وہ ایک لمحہ کے لئے رکا اور پھر توجہ کے ساتھ کان لگا کر سنا اور تاریکی میں ہر طرف آنکھیں بھار بھار کر دیکھا۔ مگر اس سنان مقام پر نہ کوئی ذی روح موجود تھا نہ کسی کی آواز لیکن بہت دور سے ابلین کی سیٹی کی آواز آ رہی تھی جو اس کے لئے پھرتی کا پیغام تھی۔

اُس نے آسانی سے نقش کو تاروں کے جھگڑے کے اوپر اٹھایا اور چند گز کے فاصلے پر گئے گیاجاں ریلوے لائن میں خم تھا۔ اُسے نقش کا منہ نیچے کو کر کے اس کی گردن اپنی طرف کی پٹری پر کھدی جیب سے چاقو نکال کر اس نے وہ گروہ کاٹ ڈالا۔ اس نے جیسے چھتری اور بیگ بندھے ہوئے تھے اور جب چھتری اور بیگ کو نقش کے قریب لائن پر ڈال دیا تو اس نے احتیاط سے ڈوری کو جیب میں رکھ لیا مگر وہ کاٹنے کے وقت ذرا سا محکوم زمین پر گر گیا اور ابراہیم سے غصہ اٹھانے لگا۔

آنے والی مال گاڑی کی آواز اور انجن کی جھج جھج اب بخوبی سنی جاسکتی تھی۔ ابراہیم نے جلدی سے عینک کا فریم اور شیشے کی پڑیا جیب سے نکالی۔ فریم نقش کے قریب ڈال دیا اور شیشے کے ٹکڑے پڑیا میں سے نکال کر عینک کے چاروں طرف بکھیر دیے۔

یہ سمجھنا چاہئے کہ اس نے یہ سب بالکل ٹھیک وقت پر انجام دے لیا۔ کیونکہ انجن کی آواز بالکل قریب آگئی تھی۔ پہلے تو اسے

کی توفیر نہ تھی اسے بھانسی پر لٹکا دینے کے لئے کافی تھی!۔

اس ہولناک خیال سے اس کا تمام جسم کانپ گیا لیکن باوجود خوف کے اس نے استقلال کو ہاتھ سے نہ دیا۔ باورچی خانے میں تھوڑی سی پتلی تیلی لکڑیاں لایا جو اس کا ملازم آگ سلگانے کے لئے رکھتا تھا۔ اور انھیں لاکر اس نے بیٹھک کے کمرے کی آفتاب میں ڈال دیا گو آگ بجھ چکی تھی لیکن راکھ میں چنگاریاں باقی تھیں۔ جو کاغذ اُسے یوسف کے سر کے نیچے رکھا تھا تاکہ قالین پر وہ بہہ نہ آئے اور جہراب اسے پہلی مرتبہ دیکھ کر خون کا جھوٹا سادغ تھا اس کاغذ کو تہ کر کے لکڑیوں کے نیچے رکھا اور ایک دیاسلائی جلا کر اس میں آگ لگا دی۔ جب لکڑیاں بھڑک اٹھیں تو اس نے اپنے جیبی چاقو سے ٹوپی کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے اور سب کو آگ میں ڈال دیا۔

اس دوران میں خوف انکشاف سے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ ٹوپی کے ٹکڑے اشتعال پذیر نہ تھے بلکہ جلنے کے بجائے آگ میں پڑ کر انیشتے، سلکے، دھواں دیتے، اور بڑی تیز بدبو پیدا کرتے تھے۔ اس بدبو اور دھواں کو منتشر کرنے کے لئے اسے باورچی خانے کا دروازہ کھولنا پڑا کیونکہ سامنے کا دروازہ کھل نہیں سکتا تھا وہ لکڑیاں توڑ توڑ کر آگ میں ڈال رہا تھا لیکن ان کے چٹختے کی آواز کے علاوہ کسی اور آواز کے سننے کے لئے وہ ہمہ تن گوش تھا۔ مخدوش قدموں کی آواز، دروازے پر دستک کی آواز۔ جو اس کے لئے موت کا پیغام ہو گئی۔

وقت گزر جا رہا تھا۔ آٹھ بجنے میں صرف اکیس منٹ باقی تھے۔ چند منٹ کے اندر اسے روانہ ہو جانا چاہئے ورنہ گاڑی چھوٹ جائیگی۔ وہ بھاگ کر ادب کی سٹرل پر گیا تاکہ دو منٹ کے کھڑکی کھول دے کیونکہ جانے سے پہلے باورچی خانے کا دروازہ بند کرنا ضروری تھا۔ جب وہ واپس آیا تو ٹوپی کے آخری ٹکڑے بل کھا کر کوئلے کی مانند سیاہ ہو چکے تھے اور چربی کی طرح سن سن کر کے جل رہے تھے اور متعفن دھواں ان میں سے نکل نکل کر چینی کی طرف جا رہا تھا۔ آٹھ بجنے میں انیس منٹ! جلنے کا وقت آگیا تھا۔ اس نے کرچھا اٹھا کر ٹوپی کی راکھ کو کوٹ کر چور چور کر دیا اور پھر منظر کر کے لکڑیوں کی راکھ اور انگاروں میں ملا دیا۔ ظاہر طور پر آفتاب ان سے کوئی غیر معمولی بات ظاہر نہ ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ خطوط اور دوسری اشیاء بیٹھک کے آفتاب میں جلنا نا اہم کا روزانہ کا معمول تھا اس لئے اس کا ملازم کوئی غیر معمولی بات محسوس نہ کرے گا۔ اور غالباً لازم کے داپس آنے سے پہلے ہی ٹوپی کے تمام انگارے کچھ کر راکھ ہو جائیں گے۔ یہ اسے پہلے ہی غور سے دیکھ لیا تھا کہ ٹوپی میں کوئی غریبی حصہ نہیں تھا جو جلنے سے باقی رہ گیا ہو۔

اس نے اپنا بیگ پھر اٹھا یا اور چاروں طرف ایک سرسری بھگاہ ڈال کر لمپ دھیا کیا۔ دروازہ کھول کر چند منٹ انتظار کیا اور باہر نکل کر دروازے کو مقفل کیا (کیونکہ لازم کے پاس دوسری چابی موجود تھی) اور تیز قدمی سے اسٹیشن کی راہ لی۔

وہ وقت سے کافی پہلے پہنچ گیا اور ٹکٹ خرید کر پلیٹ فارم پر ٹپلنے لگا۔ گاڑی آنے کا سگنل نہیں ہوا تھا لیکن اسٹیشن پر غیر معمولی ہنگامہ اور انتشار تھا۔ تمام مسافر پلیٹ فارم کے ایک سرے پر جمع تھے اور سب ریل کی لائن کی طرف دیکھ رہے تھے اور جیسے ہی وہ پریشان کن تجسس کے ساتھ انکی طرف بڑھتا رہا کہیں دو آدمی پلیٹ فارم کے ڈھال پر چڑھے جن کے کندھوں پر تریال سے ڈھکی ہوئی ارٹھی کی قسم کی کوئی شے تھی۔ تریال کے نیچے سے ارٹھی پر لیٹے ہوئے آدمی کے جسم کا نقشہ نظر آتا تھا اور تمام مسافر جب ارٹھی لانے والوں کو راستہ دینے کے لئے ہٹے تو انھوں نے متفکر نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ جب ارٹھی اسٹیشن کے ایک کمرے میں پہنچ گئی تو تمام مسافروں کی توجہ اس قلی کی طرف مبذول ہوئی جو کچھ ہی دور ایک بگ اور چھتری لئے آ رہا تھا۔ یکایک ایک مسافر چلا کر آگے بڑھا۔ ”کیا یہ اس کی چھتری ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”جی ہاں“ قلی نے رک کر اور چھتری اس کی طرف بڑھا کر جواب دیا۔

”ادھو!“ وہ چلایا اور پھر پلیٹ کر ایک دراز قدر آدمی سے جو قریب ہی کھڑا تھا گھبرا کر بولا ”یہ تو یوسف کی چھتری ہے۔ میں قسم کھا سکتا ہوں۔ آپ بھی تو یوسف کو جانتے ہوں گے؟“ دراز قدر آدمی نے سر ہلایا اور اس مسافر نے پھر قلی کی طرف رج کر کے کہا۔ میں اس چھتری کو شناخت کرتا ہوں۔ جس شخص کی یہ چھتری ہے اس کا نام یوسف ہے۔ اگر تم اس کی ٹوپی میں دیکھ گے تو اس کا نام لکھا ہوا پاؤ گے۔ وہ اپنا نام اپنی ٹوپی میں ہمیشہ لکھ لیتا ہے“

”ایہی ٹوپی تو ملی نہیں“ قلی نے کہا۔ ”بیٹے اسٹیشن ماسٹر صاحب بھی آگئے“ وہ اپنے افسر کی آمد کا انتظار کرنے لگا اور جب وہ قریب آگیا تو کہا ”حضور انھوں نے اس چھتری کو شناخت کیا ہے“

”اچھا“ اسٹیشن ماسٹر نے کہا ”کیا آپ چھتری کو بچا رہے ہیں؟ تو بہتر ہوگا کہ کمرے میں جا کر آپ نعش کی بھی شناخت کر لیں؟“ مسافر خوف زدہ سا ہو کر ذرا ٹٹکا۔

”اس کے بہت زیادہ ضرب تو نہیں آئی؟“ اس نے کانپتے ہوئے پوچھا۔

”ضرب؟ یہ تو آپ خود خیال کر سکتے ہیں“ جواب ملا ”ابن اور چھ گاڑیاں اس کے اوپر سے گزر گئیں قبل اس کے کہ گاڑی روکی جاسکے۔ واقعہ یہ ہے کہ سرتن سے جدا ہو گیا ہے“

”چہ چہ چہ“ مسافر نے ازراہ تاسف سر ہلا کر کہا ”میں خیال کرتا ہوں کہ اگر آپ مصرعہ ہوں تو میں کمرے میں نہ جاؤں۔ ڈاکٹر صاحب، کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ میرا شناخت کرنا ضروری ہے؟“

”ہاں یقیناً ضروری ہے“ دراز قدر آدمی نے جواب دیا ”جتنی جلدی شناخت ہو جائے اتنا ہی ہی اچھا ہے“

”خیر تو پھر مجبور ہی ہے“ مسافر نے کہا۔

بہت بیدلی سے وہ اسٹیشن ماسٹر کے ساتھ کمرے میں گیا اور اسی وقت گھٹنے بدمی کی گاڑی کی آمد کی اطلاع دی ابراہیم بھی پیچھے پیچھے پہونچا اور مسافروں کے ہجوم کے درمیان بند دروازے کے باہر کھڑا ہو گیا۔ چند ہی لمحوں میں مسافر باہر نکلا اس کا چہرہ زرد تھا۔ خوف اور دہشت اس پر غالب تھی۔ وہ اپنے دوست کی طرف لپکا۔ ”وہی ہے؟“ ”یوسف ہی ہے! بچا رہ یوسف! بچا رہ یوسف!“ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ مجھے یہاں لپکا اور میرے ساتھ بمبئی چلیگا۔

”اس کے پاس کچھ سامان تجارت تو نہ تھا؟“ دراز قد آدمی نے دریافت کیا۔ ابراہیم نے غور و غل میں بمشکل جواب کو سنا۔ ”ہاں اس کے پاس کچھ ہیرے تھے تو ضرور لیکن مجھے معلوم نہیں کہ کتنے اور کسے کلرک کو ضرور معلوم ہوگا۔ اور..... ڈاکٹر صاحب کیا آپ میرے حال پر عنایت کر کے اس معاملے کی نگہداشت اپنے سر لین گے؟ یہ یقین کرنے کے لئے کہ یہ درحقیقت حادثہ تھا۔ یا کچھ اور۔ میں اور یوسف دونوں سے دوست تھے۔ آپ کو بھی معلوم ہوگا کہ ہم دونوں ایک ہی جگہ کے باشندے تھے ہم دونوں احمد آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ میں امید کر رہا تھا کہ آپ اس معاملہ پر نظر کھینٹے۔“

”اچھا“ دوسرے نے جواب دیا۔ میں اپنا اطمینان کر رہا تھا کہ واقعات ظاہری کے پردے میں کچھ اور پوشیدہ نہیں ہے اور پھر اطلاع دوں گا کہ کیا یہ کافی ہوگا؟“

”دوست شکر یہ جناب کی بڑی عنایت ہوگی۔ اچھا گاڑی آگئی۔ یہاں قیام کرنے اور اس معاملے کی تفتیش میں آپ کا کوئی ہرج تو نہ ہوگا؟“

”نہیں، نہیں، بالکل نہیں۔ ہمیں اٹا دے کل دوپہر تک پہونچنا ہے اور میرا خیال ہے کہ میں کل ضروریات کو معلوم کر کے وقت مقررہ تک وہاں پہونچ سکا ہوں۔“

ابراہیم نے کچھ دیر تک بڑے غور سے اس دراز قد مرعوب کن آدمی کی طرف دیکھا جو گویا اس کے مقابلے میں شطرنج کھیلنے کے لئے بیٹھ رہا تھا۔ ابراہیم کی جان داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ ظاہر تو وہ بڑا زبردست حربہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں اس کا سنجیدہ چہرہ اس کی متانت۔ ”برویاری“ استقلال سب اس بات کی دلیل تھے۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے ابراہیم نے پھر ایک مرتبہ اپنے مقابل کی طرف دیکھا اور بڑی تشویش کے ساتھ یوسف کی ٹوپی کا خیال کو کہ یہ اسید کرنے لگا کہ اس سے کوئی اور فرد گواہ تو نہیں ہوئی ہے۔ (ترجمہ)

(شباب برنی) باقی ————— باقی

اکثر حضرات

پرچہ نہ پہونچنے کی جب اطلاع دیتے ہیں۔ تو نمبر خریداری نہیں لکھتے ایسی صورت میں ہمارے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں ہے کہ ایسے خطوط کے جواب میں صرف سکوت اختیار کریں۔ (منبر)

اصغر علی محمد علی تاج پور لکھنؤ سے ہر تہ کا عطر منگانا چاہیے۔

تحفہ محبت

(فشا)

ایک ڈالر اور ۸۷ سینٹ بس ہی سرمایہ بھدان میں سے ۶۰ سینٹ بیٹی کی شکل میں تھے۔ ایک ایک دودھ بیٹی بنے بقال بھاب کے سودے میں جھٹ دھار کر کے بچائی گئی تھیں جو بظاہر نیکل و ذرات کی حد کو پہنچ گیا تھا ڈیلا نے تین مرتبہ گنا۔ ایک ڈالر اور ۸۷ سینٹ اور کل کر سس کا دن ہے۔

اب سو اس کے کیا چارہ تھا کہ بڑے ٹوٹے کوچ پر گر پڑے اور رونے لگے ڈیلا نے یہی کہا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی گریہ آہ اور تبسم سے مرکب ہے جن میں آہ کو غلبہ و کثرت حاصل ہے۔

اٹھ ڈالر فی ہفتہ کرایہ کا مکان فقیر کا نمونہ تو نہ تھا لیکن عیش و راحت کی شان بھی نمایاں نہ تھی دروازے پر پیریکس لگا ہوا تھا لیکن خطوط سے ہمیشہ یہ نیاز رہتا تھا۔ برقی بٹن بھی لگا ہوا تھا لیکن کوئی انسانی انگلی اس میں سے آواز پیدا کر سکتی تھی ایک تختی بھی آویزاں تھی جس پر ستر جیس ڈنٹھکھم ٹنگ "کا" ام لکھا ہوا تھا۔ سائن بورڈ کے نقوش کبھی روشن و نمایاں بھی رہ چکے تھے جب اس کے مالک کی آمدنی تیس ڈالر فی ہفتہ تھی۔ اب جبکہ یہ رقم بیس ڈالر رہ گئی تھی تو حرف اسم کی تابانی نے بھی سٹی کی بے رونق تھی کا ساتھ دیا تھا۔

لیکن جب ستر جیس ڈنٹھکھم ٹنگ دفتر سے گھر واپس آتا تھا تو ستر جیس یعنی ڈیلاجم "لکھ" اس کا استقبال کرتی تھی اور جم بادہ محبت سے سرشار ہو کر خمار افلاس کو بالکل بھول جاتا تھا۔

ڈیلا اور دو ہو کر اٹھی آنسو پچھے اور کھڑکی میں آکر کھڑی ہو گئی سوچنے لگی کہ کل کر سس ہے اور صرف ایک ڈالر اور ۸۷ سینٹ موجود ہیں۔ ازہم کے لئے بڑے دن کا تحفہ خریدنا ہے۔ ریتیک غور کرتی رہی ان تھوڑے سے دھموں میں کیا چیز آسکتی ہے چیز نفیس اور عمدہ ہو اور جہم کے قابل کھڑکیوں کے درمیان شیشہ لگا ہوا تھا۔ ڈیلا کو کچھ خیال آیا اور دفعتاً شیشہ کے مقابل جا کھڑی ہوئی۔ آنکھیں ایک غلط کیفیت کے ساتھ جھک رہی تھیں۔ لیکن چہرے کا رنگ میں سکندھ ہی کے عرصہ میں فقی ہو گیا۔ اس نے جلدی سے بال کھول کر جھپٹو اور شیشہ میں دیکھنے لگی۔

ان سیان بیوی کی ملکیت میں دو چیزیں تھیں جن پر دونوں کو بجا طور پر فخر و ناز تھا۔ ایک جسم کی طلائی گھڑی جو باپ دادا سے ترکہ میں ملی تھی۔ دوسری ڈیلا کے بال۔ اگر نیکر سب کا محل ڈیلا کے مکان کے مقابل ہوتا اور ڈیلا کھڑکی میں کھڑی ہو کر سکھانے کی غرض

سے اپنے بال نکال دیتی تو ملکہ کا کوئی مرصع نیلور ان کا مقابلہ نہ کر سکتا۔ اگر حضرت سلیمان بناتمام بیش قیمت خزانہ نکال کر بیٹھے اور حجم ادھر سے گزرتے وقت جیب سے اپنی گھڑی نکال کر دیکھتا تو ہر مرتبہ گھڑی کو دیکھ کر حضرت اپنی داڑھی کھانے لگتے۔

ڈیلا کے خوبصورت بال اس کے جسم کے گرد لٹکے ہوئے تھے گویا سنہرے پانی کا دریا موجیں مار رہا ہے۔ بال ڈیلا کے زانو سے نیچے تک پہنچتے تھے اور اس کے لئے لباس کا کام دیتے تھے۔ اس نے جلدی سے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بالوں کو پسٹ کر باندھ لیا۔ ایک منٹ کے لئے ٹھنکی، خاموش گھڑی رہی اور ایک دو قطرہ اشک میلی سرخ درسی پر ٹپک پڑے۔ لیکن یہ تامل صرف ایک لمحہ کا تھا دوسرے لمحہ میں میلی جیکٹ اور پرانی ٹوپی پہن زینہ سے اترتی اور ٹرک پر آ گئی۔ اور ایک طرف کو روانہ ہو گئی۔ چلتے چلتے جس مکان پر پہنچی اس پر آدینان تھا۔

میڈم سو فرونی
بالوں کا بنا ہوا ہر قسم سامان
ڈیلا زینہ پر پرٹھی اور ایک عورت کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اور پوچھا۔
”میرے بال خریدو گی؟“

”مین ہی کارو بار کرتی ہوں سیٹ امارو کہ اک نظر دیکھ لون“
آن واعدین چکلا سنہرے بالوں کا دریا لہرانے لگا۔
میڈم نے ماہر و شاق ہاتھوں میں بالوں کو لیکر کہا۔ ”بیس ڈالر“
ڈیلانے فوراً کہا ”جلد عنایت کر دو“

آئندہ دو گھنٹے ڈیلانے حجم کے لئے تحفہ تلاش کرنے میں صرف کئے۔ تمام اسٹور چھان مارے۔ ساری دکانیں دیکھ ڈالیں آخر تحفہ مل گیا۔ وہ تحفہ جو گویا حجم ہی کے لئے بنا تھا۔ یعنی گھڑی کا چین پلٹینم کا بنا ہوا۔ قیمتی نفیس۔ نازک۔ جس کے بیش قیمت ہونے کے لئے قیمتی دہات کا نام ہی کافی تھا۔ یہ چین حجم کی گھڑی کے لئے نہایت موزون تھا۔ ڈیلا دیکھنے ہی پھر گئی۔ یہ چیز حجم کے قابل ہے۔ سادہ و گران بہا جیسا حجم ہے ویسا ہی یہ چین بھی ہے۔ اکیس ڈالر چین کی قیمت طلب کی گئی۔ فوراً ادا کر دی اور ۸۷ سینٹ لیکر گھر چلی آئی۔ چین گھڑی میں لگا ہو گا تو حجم ہر جلسے میں بار بار وقت دیکھنے کیلئے چین ہو گا۔ گھڑی اس قدر بیش قیمت و شاندار تھی کہ چمڑے کے شمع سے حجم کو ندامت ہوتی تھی۔

ڈیلا گھر پہنچی روشنی کی۔ اور زلف بیچ سلاخ آہنی نکال کر اس نقصان کی تلافی میں مصروف ہو گئی جو فیاض محبت نے اس صورت میں پیدا کر دیا تھا۔ چالیس منٹ کی محنت سے اس سر پر چھوٹے چھوٹے گھونگر نظر آنے لگے اور وہ اس کیل سے

بھاگا ہوا لڑکا معلوم ہونے لگی۔ آئمنہ میں اپنی شکل دیکھی اور دیر تک نقادانہ نگاہ سے دیکھتی رہی پھر دل میں کہنے لگی: ”اگر جسم دوسری نگاہ ڈالنے سے پہلے مجھے ہلاک نہ کر دے تو کسے گا کہ میں جزیرہ کوئی کی رقاصہ لڑکی معلوم ہوتی ہوں۔ لیکن میں کیا کر سکتی تھی۔ ایک ڈالر وارے سینٹ میں کیا ہو سکتا تھا۔“

جسم ہمیشہ وقت پر گھر پہنچتا تھا۔ ڈیلانے چہین مٹھی میں دبایا اور دروازے کے قریب میز کے سامنے بیٹھ گئی۔ سر نیزہ پر جسم کے پاؤں کی آہٹ سنی اور ایک لمحے کے لئے اس کا رنگ سفید ہو گیا۔ اسکی عادت تھی کہ ذرا درسی باتوں کے لئے بھی دل ہی دل میں مائیں مانگا کرتی تھی۔ اسوقت اس نے کہا: ”خدا یا۔ اس کے دل میں ڈال دے کہ میں اب بھی خوبصورت ہوں“

دروازہ کھلا۔ جسم داخل ہوا۔ او کوڑ بند کر دئے۔ وہ خلاف معمول منہ محل اور خاموش تھا۔ آہ! صرف بائیس سال کی عمر اور متاثر زندگی کے افکار! اس کو نئے اور کوڑ کی ضرورت تھی۔ اس کے پاس دستانے بھی نہ تھے۔ جسم نے اندر قدم رکھا اور اسکی آنکھیں ڈیلا پرچم گئیں۔ آنکھوں سے کچھ ایسا افسردہ ظاہر ہوتا تھا کہ ڈیلا مطلق نہ پڑھ سکی اور ڈری گئی۔ جسم کے چہرے پر نہ غصہ تھا نہ تعجب۔ نہ ملامت نہ خوف۔ کوئی ایسا جذبہ نہ تھا جسکے لئے ڈیلا پہلے سے تیار تھی۔ صرف نگاہ میں ڈیلا پر جمی ہوئی تھیں اور چہرے کا ایک خاص انداز تھا۔ ڈیلا نیز سے اٹھی اور اسکی طرف بڑھتے ہوئے کہا ”پیارے جسم! اس طرح نہ دیکھو۔ میں مجبور تھی۔ بال کٹوا دیے اور بیچ ڈالے کیونکر ممکن تھا کہ کمرس گزر جاے اور تمہیں تحفہ نہ دوں۔ بال پھر بڑھ جائیں گے۔ ان کا خیال نہ کرو۔ کیونکر پیارے! خفا ہو۔ میرے بال تو بہت جلدی بڑھتے ہیں۔ جسم! کمرس کی مبارکباد دو اور خوش ہو۔ تمہیں خبر نہیں میں تمہارے لئے کیسا نفیس۔ تحفہ لائی ہوں۔“

جسم بڑی شکل سے بولا: ”بال کٹوا دئے؟“ معلوم ہوتا تھا کہ باوجود اسقدر غور و تامل کے وہ ابھی اس حقیقت تک پہنچ نہ سکا تھا۔ ”کٹوا دئے اور بیچ ڈالے۔ کیا میں یوں خوبصورت نہیں معلوم ہوتی؟ بغیر بالوں کے مجھی میں میں ہی ہوں۔ نہیں ہوں؟“

”تم کہتی ہو کہ بال نہیں رہے؟ جسم کا انداز غماز پر کر رہا تھا کہ وہ ایک کچھ نہیں سمجھا۔

”ڈیلا بولی۔ ”اب بالوں کو کیا مٹھو نہ دیتے ہو۔ وہ تو بیچ دئے گئے۔ میں کہتی ہوں کہ بال نصبت ہوئے آج کمرس کی شام ہے۔ پیارے خوشی مناؤ۔ بال تمہارے ہی لئے گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ میرے سر کے بال شمار کئے جاسکیں۔ لیکن میری محبت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ جسم کھانا پکاؤں؟“

جسم کی وہ کیفیت یکایک دور ہو گئی۔ اور اس نے جلدی سے ڈیلا کو سینے سے لگا لیا۔ دس سکند کے لئے ہم دوسری طرف نظر پھیر لیتے ہیں۔ آٹھ ڈالرنی ہفتہ ہوں یا دس لاکھ سالانہ۔ حساب محبت کی رو سے ان میں کچھ فرق نہیں۔ ریاضی دان فسق بتائے گا۔ لیکن اسکی رائے سچی ہے اور غلط۔

جمنے اور کوٹ کی جیب سے ایک پکیٹ نکالا۔ اور میز پر ڈال کر بولا ”ڈیل! میری نسبت کسی قسم کی غلط فہمی نہ کرو۔ بالوں کا کٹنا، مڑنا۔ چھوٹا ہونا اور بڑا ہونا سب برابر ہے۔ میری محبت ایسی نہیں جو ان باتوں سے کم ہو جائے۔ لیکن تم اس پکیٹ کو کھولو گے تو معلوم ہو گا کہ میں پہلے کیوں کھوایا گیا تھا۔“

خوبصورت - سفید - تیز انگلیوں نے ڈورے اور کاغذ کو توڑ کر پینک دیا۔ پکیٹ کا کھلنا تھا کہ ڈیلا کے منہ سے فرط مسرت سے ایک جھنجھکی۔ اور اس کے بعد گریہ نساہیت شروع ہو گیا۔ جسکی متکین کے لئے شوہر کو انتہائی قوت محبت صرف کرنی پڑی۔ پکیٹ کے اندر کنگھے تھے۔ پہلو و پشت سر کیئے کنگھوں کا سٹ۔ خوبصورت شیل کا بنا ہوا۔ کناروں پر مرصع کارڈ ڈیلا کے حسین بالوں کے لئے کس قدر موزوں تھا۔ ڈیلا کو مدت سے ان کی تمنا تھی۔ ہاربا دکا فن پر دیکھ کر اس کے دل میں شوق و آرزو کا دریا اُبڑا۔ لیکن تنگدستی نے مجبور رکھا۔ اب کنگھے میسر آئے تو بال ضرر ہے۔ اس نے بے اختیار کنگھوں کو سینے سے چٹا لیا اور دیر تک پیار کی نگاہوں سے دیکھتی رہی دیر کے بعد چشم پر غم از سر ہم برقیں کے ساتھ نظر اٹھا کر۔ ”جمن میرے بال بہت جلدی طرہ جاتے ہیں۔“

استنہین یکا یک اچھل کر گھڑی ہو گئی اور بے اختیار زبان سے نکلا ”اوہو!“

جمن نے ابھی اپنا خوبصورت تہہ نہیں دیکھا تھا ڈیلا کی مٹھی میں دیا ہوا تھا۔ ہاتھ کھول کر جمن کو چہن دکھایا معلوم ہوتا تھا کہ اس بے زور دہاتہن ڈیلا کے جوش و شوق سے روشنی پیدا ہو گئی۔ چہن دکھا کر بولی۔

”جمن کیسا خوبصورت ہے۔ میں نے اس کی تلاش میں تمام شہر جھان مارا۔ اب تم دن میں سو سو بار وقت دیکھا کرو گے لاؤ گھڑی دو۔ دیکھو ان میں کیسا معلوم ہوتا ہے۔“

گھڑی دینے کے بجائے جمن کوچ بڑھ پڑا۔ اور سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر مسکرا کر کہنے لگا۔

”ڈیل! ہم کو اپنے اپنے تحفے کچھ عرصے کے لئے رکھ چھوڑنے چاہئیں۔ یہ اتنے نفیس اور اعلیٰ ہیں کہ ابھی استعمال نہیں ہو سکتے

میں نے تمہارے کنگھے خریدنے کے لئے گھڑی بیچ دی۔ اچھا اب کھانا پکاؤ۔“

(جامدین قادری)

دکھپ تارخی جاسوسی ناول

۸	مراب فیشن	۸	عاصمہ بیس	۸	حسن نارس	۸	زیر پرست	۸	اکرمہ زبان	۸	نازنین مراکش
۸	ہاشوک شہزادی	۸	شیخ علی	۸	فخرتی جاسوس	۸	کجنو کاراز	۸	دفا داروسن	۸	سمندر کی سیر
۸	شہیر دفا	۸	ہماور ترک	۸	طرکی حرم سرا	۸	عبید الرحمن ناصر	۸	لوان زمین	۸	اسرار ہاشوک
۸	متا دیگم	۸	ہرام کی داسپی	۸	جنگ طلہس	۸	عبدین مصر	۸	ریاحت زمین	۸	روح جلیلی
۸	شعلہ رنگینی	۸	انقلاب فرانس	۸	ہرام چور	۸	سیلاب خون	۸	سیاحت ہوا	۸	امین بک

(مینجر ”مکھار“ لکھو)

کارخانہ مطبعہ: محمد علی تاج محلہ کھٹہ۔ ریلوے۔ خطہ مکھار۔

لکھنؤ کی پھبتیاں

تشبیہ کی ایک قسم کو پھبتی کہتے ہیں، تشبیہ کل سہ اور پھبتی جز، تشبیہ تو وہ ہے جس میں کتر چیز کو بہتر چیز کے ساتھ نسبت دیا جائے۔ اور پھبتی وہ جس پر بدتر شے کے ساتھ نسبت دی جائے یعنی پھبتی میں مثال بدتر چیز سے دی جاتی ہے اور اس میں ایسا حسن کلام پیدا کیا جاتا ہے کہ سننے والا حقیقت حال سے آگاہ ہو جاتا ہے۔

اس لحاظ سے پھبتی حقیقت میں علم بیان کا ایک جز ہے۔ پھبتی ہمیشہ مجازی معنی میں صرف ہوتی ہے اور کبھی پھبتی استعارہ بن جاتی ہے جب مشبہ کو چھوڑ کر مشبہ بہ کو بیان کرتے ہیں تو ایسی پھبتی کو استعارہ کہنا چاہئے اور عمدہ پھبتی کی تعریف بھی یہی ہے کہ چھپتی کہیں اس کا نام نہ لیا جائے۔ اور سمجھنے والے بخوبی سمجھ لیں۔ کیونکہ اسمین بعض قرآن ایسے ہوتے ہیں جن سے سننے والے کا ذہن اس طرف جلد منتقل ہو جاتا ہے۔ شعر کی اکثر پھبتیاں بطور استعارہ ہوتی ہیں۔

نواب یوسف حسین خان یوسف لکھنوی شاگرد منشی مظفر علی اسیر، ذومعنی، ضلع جگت کے استاد تھے اور پھبتی ہمیش کہتے تھے ان کے دوست شیخ حسن خان رسا دراز قدآورے، کرنبے، دُبلے پتے آدی تھے۔ دور سے دیکھتے ہی اپنے احباب سے کہنے لگے۔
— دیکھنا سیپ لگا بگلا آ رہا ہے، پھبتی کی لطافت اور نزاکت کو سمجھنا ہو تو مشبہ اور مشبہ بہ کی ایک ایک چیز کا مقابلہ کرو۔
اول تو یہ بات سمجھ لو کہ پھبتی مرکب بے مشبہ کی کرنبی آنکھوں، لاغری جسم اور درازی قد سے یہی بابتیں مشبہ یعنی ستارہ زمین بھی ہیں کہ بگلا کر بجا ہوتا ہے، دُبلتا ہوتا ہے اور حسین سیپ لگی ہوتی ہے وہ اور بھی دُبلتا ہوتا ہے دراز قد ہوتا ہے لمبی لمبی ٹانگین رکھتا ہے۔ یہ پوری پھبتی مرکب ہے۔ چند مخصوص باتوں سے پھبتی کے مدارج بہت ہیں۔ شعر اور خواص کی پھبتی، عام اور عوام کی پھبتی سب لگا لگتے ہیں۔
مردار فیع سودا پھبتی کہنے میں مشاق تھے ان کی ہجو میں مشہور ہیں اور ان میں اکثر کہ یہ پھبتیاں نظم کی ہیں لیکن غزل میں بعض پھبتیاں لطیف لکھی ہیں مثلاً :-

آنکھوں کے گرد میرے مرزا کان کی ہے یہ صورت - جیسے کنار دریا خس بہ کے آ رہا ہے -

مرزا کان پہ خس کی پھبتی کئی -

سیر وزیر علی صبا "پھبتی میں، کمال رکھتے تھے مگر نہایت تہذیب کا پہلو لے ہوئے، فرماتے ہیں -

س کی جو اس گل نے ہمارے پانچ دیاں کی نہ سیر مصرع تراپنا ہر اک خشک ڈالی ہو گیا

مصرع تر پر خشک ڈالی کی پھبتی کئی -

اصو علم ارجو علم تاجر علم لکھنؤ کی ایک شاخ گلدار حوض، دکن اور ایک شاخ جانشینی جو کل علی میں ہے

میر علی اوسط رشک تلمیذ ناسخ

پھبتی کہتے ہیں سیہ اطلس پہ اُٹو ہو گیا

ماہر کہ تلوار اپنے تیرہ بخت زار پر

شیخ محمد جان شاد کسی کی جو تین کہتے ہیں :-

نخاس کا دلال ہے کشمیر کا رمال

کیا محنتب شہر کے نائب کا لکھنؤ حال

یا قوم مکیری سے مسلمان ہے یقیناً

کچوکا بساطی ہے مکینور کا ابدال

تفہیم نئی کیا ہو طبیعت نہیں لگتی

بجزور کا عطار ہے قنوج کا گندھی

موچی کی پشاور میں ہے بخت کی دکان

پنجاب کا سائیس ہے یا ہے شہزبان

ابلیس کی صورت ازلی دشمن انسان

گمراہی مردم کے لئے غول سیابان

یہ بوم نہ بند رہے نہ کھوسٹ جو نہ خربے

سب شکل ہے لنگور کی اک دم کی کسر ہے

موٹھوں کو دم سگ سا جڑ مار کر بچھڑی

کنکڑے کی بھیل کی طرح لٹکی ہے ڈاٹھی

اس سے معلوم ہوا کہ بعض مرتبہ شعرا جب کیسی کہتے ہیں تو عوام کی پھبتیوں سے بھی کام لیتے ہیں۔ اور جب کسی اور صنف سخن میں

موزون کرتے ہیں تو خواص کی پھبتیاں استعمال کرتے ہیں۔

ڈاڑھی منڈ واؤ میں بازار آئی خدا کے لقمے سے

جان صاحبہ اور کیا پھبتی کون بن آئے ہینگور سے

جرات سع۔ اس زلف پہ پھبتی شب و بچور کی سوچھی۔

شیخ ناسخ سیاہ فام گران دہل کثرتی تھے ہر روز بارہ سو پھیاسی ڈز پلٹتے تھے خوراک تین سیر تھی۔ نواب مرزا تقی علی خان

ترقی سالار جنگی آتش کی شاعری کے معتقد تھے خود بہادر تھے اور بہادر و ن کے قدروان تھے آتش بھی بانکے تھے اپوجی بنے رہتے

تھے۔ غازی الدین حیدر بادشاہ نے مشاعرہ کیا اور لکھنؤ کے تمام شعراء مدعو ہوئے ناسخ بھی آئے آتش بھی آئے جس وقت

نواب ترقی نے ناسخ کو دیکھا کہنے لگے دیکھنا یہ دم کٹا بھینسا کہاں سے آگیا، لوگوں کو یہ پھبتی ایسی پسند آئی کہ اُس دن سے

ناسخ کو دم کٹا بھینسا کہنے لگے۔

نواب خدا پھبتی کہنے میں بہت مشہور تھے نواب شیش محل کے ایک مصاحب خاص ضعیف العمر گول چہرہ سانہ بے چمک تھے

مختارین کوئی دانت نہ تھا اس لئے جوٹ اندر کودھتے ہوئے تھے آپ نے ان پر چوچ ٹوٹے اٹوٹی بھیجی تھی اور ایسی کہی کہ دھوئے دھوئے نہ چھوٹی۔

حسن باندی طوائف سیاح فام پیشکش فرمہ اندام گھاؤ دیدہ مگر حسن اخلاق میں مشہور تھی پڑھی لکھی تھی موسیقی میں بھی کمال رکھتی تھی اور فیاض بھی تھی اس کی تعریف میں جان صاحب نے تقصید کہا تھا ساس نے اپنی عالی ہستی سے جان صاحب کو سورہ پیہ تھیدہ کا صلہ دیا تھا ایک دفعہ کسی محل میں صبح کے وقت بجا کر رہی تھی مستی کی دھڑکی ڈنگری گہری ہونٹوں پر جمی تھی مگر بیان کا لکھنؤ ٹاڈ تھا اس لئے مستی کی سیاحتی کالی رنگت کے ساتھ ملکر بدنامی پیدا کر رہی تھی یہ جلسہ نوابہ ممتاز الدولہ بہادر کے دو انگدے پر تھا سید حسن لطافت بھی شریک جلسہ تھے نواب کو بھی طلب کر کے کہنے لگے حضور ملا خط فرماتے آج تو بطح کیچہ کھاکرائی ہے اور لکھنویوں سے طوائف کی طرف اشارہ کیا نواب اس بھیتی پر بے ساختہ ہنس پڑے۔

یہ تو شہر اور خاص لوگوں کی چھبیتیاں تھیں اب عام کی چھبیتیاں بھی مٹنے۔
بے کس کا لگا۔ بلے آدی کو کہتے ہیں۔

لاسا لگی چھڑ۔ دسٹے پتے تحیف الجتہ کمزور دراز آدی کو کہتے ہیں۔

مولابخش طلبہ سائنس کے یہاں ایک کوئٹہ قاصت دہلا پتلا اظہلیہ آتا تھا۔ اسے سب لوگ شرک کوٹنے کا ڈور منٹ کہتے تھے آخر یہی اس کا نام پڑ گیا۔

ایک صاحب کی گردن موٹی اور چھوٹی تھی اور وہ نہ کسی قدر رکھلا رہتا تھا چہرہ چھچک کے داغ تھے انہر شیر وہاں سے مٹنے کی بچھتی موزون کہی۔

ایک صاحب گران ڈیل پستہ قاصت جتنے چوڑے اتنے ہی جلسہ تھے۔ ان کو مولوی کچھوا کہدیا۔

ایک شخص گدی کے بال منڈواتے تھے ان سے کہا حضرت آپ نے شیعہ سلطان کی گھڑی کیہاں بنوائی۔

ایک طوائف نہایت لاغر تھی مگر قد مائل بلندی تھا اس پر ایک صاحب نے بھیتی کہی کہنے کی چوڑی پٹی۔

ایک مجتہد صاحب تھے جن کے یہاں تمام شہر کے مسلمان مدرسے کے چالیسویں کا اسباب بھیجتے تھے اور نماز روزہ کا نقد و پیہ دیتے تھے لوگوں نے ان کا نام رکھا جنت کے پٹواری۔

ایک اور مجتہد صاحب جو ہمیشہ باریک تمیز کا کرتہ اور سفید باریک دوپٹہ سفید صافہ سفید عبا زینکوش استعمال فرماتے اور خود بھی گویہ پٹے تھے۔ ایک خوش اتفاق دانہ ان کا نام نہر فرات کا بنگلہ رکھدا۔

چوک میں ایک طوائف تھی جو فودہ بت گوری تھی اور سفید لباس سے آراستہ رہتی تھی ایک ان کو ٹٹے پچھو خرام تھی کہ ایک صاحب نے

کہا کہ دیکھو سفید چیل منڈلا رہی ہے۔

ایک نواب صاحب تھے جو ہمیشہ اپنی عسرت کا روزنار دیا کرتے تھے ان کا نام رکھا نواب فاقہ ایک حکم صاحب دراز تھے۔ لاغز اندام قوی کامون مین بہت لچسپی رکھتے تھے ان پر چھتی کسی قوم کے شتر بے مہار۔ واضح رہے کہ تشبیہ اور چھتی مین یہ فرق ہوتا ہے کہ تشبیہ مین حرف تشبیہ بھی لاتے ہیں جیسے وہ آدمی جس مین چانکے ٹکڑے کے اندر ہے لیکن چھتی مین نہ حرف تشبیہ آتا ہے نہ وجہ تشبیہ بر بیان کی جاتی ہے نہ مشبہ آتا ہے یعنی کسی آدمی کا نام بھی نہیں لیتے اس سے مدام ہوا کہ چھتی یہی ہے جو استعارہ بن جائے تشبیہ نہ رہے جیسے سست رفتار آدمی کو کہیں ادوان کا تو تا۔

یہ بھی واضح رہے کہ چھتی پر اعتبار اغلاق و اطوار تعلقات پوشیدہ وغیرہ کے بھی کئی جاتی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ چھتیاں بہ اعتبار صورت وضع قطع لباس کے موزون کی جاتی ہیں ایک ٹیٹن ساز تھے جو آخر زمانہ مین جب صنعتی نے پاؤں پھیلائے اور کام کرنے مین اعتدور ہوئے تو سبز پگڑی باندھ کر شاہ صاحب بن گئے۔

اول تو خیفۃ الجیش گورے آدمی دوسرے پان اسقدر کھاتے تھے کہ دہ نہ باجھون تک لال رہتا تھا اسپر سبز پگڑی ایک صاحب نے تو تاشاہ کی چھتی کی آخر تو تاشاہ ان کا نام ہو گیا اور شاہ صاحب تمام لباس سبز پہنتے گئے۔

عام کی چھتیاں نواب بن چکے اب عوام کی چھتیاں بھی گوش زد فرمائے۔ ایک مصائب خوان تھے نہایت گورے بے انتہا کرتے کہ سیقدر چٹیاک رو ان کا نام دو دو صیا بھٹا رکھا گیا۔ ایک نواب صاحب نہایت سیاہ فام تھے ان کو سب نواب کو کہتے تھے۔

ایک صاحب بنے اور فری تھے انھیں چراغ رکھنے کا ڈیوٹ کہتے تھے۔ ایک طویل القامت چھتی کسی کسر میٹ کا اونٹنٹا ایک صاحب گھبرائے ہوئے جا رہے تھے دوسرے صاحب پوچھتے ہیں خیر تو ہے آج کٹے ہوئے کنکوے کی طرح کمان جاتے ہو۔

نبی گردن کے ایک بیرسٹر صاحب ولایت سے پاس ہو کر آئے اور گردن ہلا ہلا کر شانے پھر کا پھڑکا کر تقریر کرنے لگے۔ ان کو حاجی قلی قلی کا خطاب دیا گیا۔

ایک طوائف تھی گران ڈیل مگر زیادہ عمر کی پیٹ کی کھاں تنک آنی تھی جسم کے بوجھ سے چلنا پھرنا دشوار تھا لوگوں مین چھکڑا بانی کے نام سے مشہور ہو گئی۔

ایک ماما دُکری سے برطن ہو گئی تو محلے بھر مین پھر کر تیرا میرا کام کر کے بچوں کو پالتی تھی گھڑی اس گھر مین گھڑی اس گھر مین لوگ اسے جملے پاؤن کی پٹی کہتے تھے۔

ایک عمر عورت شامانہ جوڑا اپنے جا رہی تھی کسی نے پھبتی کہی۔ بڑھی گھوڑی لال لگام پر لنی پتیلی پر قلعی یہ پھبتی اسی عورت پر کہتے ہیں جو ضعیفی میں بناؤ سنگار کرتی ہے۔

کاہل آدمی کو کہتے ہیں یہ تو پکی ہیری تلے مرنے والے ہیں۔

میان لائے پتیلی بی بی نے پھبتی کہی یہ دیوالی کی کلھیا بجے پسند نہیں پتیلی اتنی تو ہو کہ آدھ سیر خشک پک جائے چھوٹی پتیلی کو دیوالی کی کلھیا کہا۔

ایک صاحب انگرکھا اُجلا پانچامہ میلا اپنے ہوئے جارہے تھے ان کے دوست نے کہا آہا آج تو تم دھوبی کے چھیللا بنے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ دھوبی اچلے میلے جیسے کپڑے جھان کے ہوتے ہیں پنہن لیتے ہیں۔ اس لئے میلے اُچلے پر دھوبی کے چھیللا کی پھبتی کہی۔

جو آدمی مارا مارا پھرتا ہے اُسے دھوبی کا کتا کہتے ہیں جبکہ ایک جگہ قیام نہیں رہتا کبھی گھاٹ پر کبھی گھر میں۔ میر نفیس نے اپنے مرثیے میں پھبتی کا استعمال کیا ہے۔

گر نیر دیو بھی جس سے کہے وہ فتنہ خوم
اس میں کلائی کو فیل مست کی خرطوم کی پھبتی کہی۔

نہیم زبور سیاہ خال اس کے
خال پر زبور سیاہ اور بال پر برگد کی جٹاؤن کی پھبتی کہی۔

میر فضل مت پوچھو کھانے کا ہے بلی
منہ ہے چٹون سے جیسے روٹی جلی
چنے داغ پر جلی ہوئی روٹی کی پھبتی کہی۔ اس میں مشبہ بہ مرکب ہے۔

حندنی دیگ ہے شکم اس کا
شکم کو صدنی دیگ کہا اور دم کو نفس اژدہ کہا۔

گال کھچے سے پھر تو اسے سیاہ
کمال کو کھچے سے اور کاسے سر کو اوندھے کڑاہ سے تشبیہ دی۔

پیش کو لوسے کا غنور کہا
آہنی ہے تنور اس کا پیٹ
کوئند کالی جو کھول جائے لیٹ

کہ وہ زلف اور لڑیاں موتیوں کی
سیر ناگن ہے یا اندون پہ بیٹی

زلزلت اور موتی کو سبب ناکن اور اٹھ دن سے تشبیہ دی -

زلزلت یوں روئے غرق آلودہ پر لہراتی ہے
ضلع جون ناکن گلوں پر چاٹنے اوس آتی ہے
زلزلت کو روئے غرق پر لہرانے سے ناکن کو بھولوں کی اوس چاٹنے سے تشبیہ دی - اس میں مشبہ مشبہ بہ دون مرکب ہیں -
ایک خوبصورت عورت کو کالے پر شکل ناسب نے ملازم رکھا مرزا چھو بیگ نے پھبتی کہی
زارغ کی چوچی میں انگور خدا کی قدرت
پہلو جو رہن نگور خدا کی قدرت

ایک حسین خوبصورت نوجوان رئیس نے ایک بوٹی بھدی کالی چڑیل کو اپنا ذکر کھا شاعر نے پھبتی کہی -
ع - ناکن مٹے کی توپ پہ گور دن کا پہرہ ہے -

فارسی اور عربی کے علم بیان میں تشبیہ اور پھبتی تین کئی فرق نہیں ہے نہ پھبتی کے لئے کوئی دوسرا نام ہے - وہ لوگ پھبتی کو بھی
تشبیہ کہتے ہیں جیسے صفت موصوف میں اچھی بات کو بھی بات کو بھی صفت کہتے ہیں اور برائی کو بھی صفت کہتے ہیں - اور اس کی
پیروی اردو کے اہل زبان بھی کرتے ہیں لیکن تشبیہ میں جو استیاد اردو نے قائم کیا ہے وہ یہ ہے کہ اچھی تشبیہ کو تشبیہ اور بری تشبیہ کو
پھبتی کہتے ہیں اور اس کو استعارے کی حد تک پہنچا دیا ہے یعنی نہ حروف تشبیہ کا بیان کرتے ہیں نہ مشبہ کا ذکر کرتے ہیں صرف مشبہ بہ
کے ذکر سے استعارہ بنالیتے ہیں یعنی مشبہ بہ کو عین مشبہ بنا کر استعمال کرتے ہیں -

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اردو کے لوگ پھبتی کو استعارہ بنا کر استعمال کرتے ہیں مثلاً -

کشمیری جملے میں ایک حکیم صاحب تھے ہنایہ صغیت ہشتہ لاغر نازک اندام دو قدم چلنے میں سیکڑوں بل کھاتے تھے بات آہستہ
آہستہ کرنے تھے وہ بیشیش عمل کی سرکار سے ان کا تعلق تھا، لوگوں نے ان کا نام حکیم مرمر رکھ لیا اور یہ نام کچھ ایسا پھلا پھولا کہ بہت کمالے
لوگ ہیں جبکہ حکیم صاحب کا اصلی نام معلوم ہو - جب قدر ہنسے بیان کیا اس میں اکثر ایسی پھبتیاں ہیں جو استعارہ بن گئی ہیں - لیکن
ایسی پھبتیاں بھی ہیں جو تشبیہ کی حد میں داخل ہیں - جیسے تنکا سا پیٹ - چھکڑا سا ڈیل ڈول - گروہ سے ہونٹ - پھاؤڑا سے
ہاتھ پاؤں - سن سی ڈارمی - ابلہ سے گال - چیان سی آنکھ میں

ایک صاحب منہ چور تھے احباب کی صحبت میں بیٹھنا جلسوں میں شریک ہونا گھر سے سیر تماشے کو نکلنا - ان کے لئے دشوار
تھا - ان پر پھبتی کہی کرتا کہ مرعی -

جس آدمی کے متعلقین زیادہ ہوں اور ان سب کا خرچ اسی ایک شخص کے ذمہ ہو اسے چونٹوں بھر کباب کہتے ہیں -
یہ ایسی عام پھبتی ہے کہ آنکھل محاورہ بن گئی ہے -

بعض پھبتیاں ایسی ہیں کہ ان کو حد استعارہ میں نہیں لاسکتے - جیسے

وہ ہنستا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ پُرانی جوتی کے ٹانگے ٹوٹ رہے ہیں۔

لڑکا تو بالکل ٹیڑھی ہو رہا ہے۔ لڑکی بالکل دہان پان ہے۔ طبیعت تولد ماشہ ہو رہی ہے۔

جس طرح اہل علم بھیتی کو بھی تشبیہ کہتے ہیں اور کوئی دوسرا نام انکی اصطلاح میں اسکا نہیں ہے۔ اور اسی تشبیہ تعلق سے

جب اوقات تشبیہ دور ہو جاتے ہیں اور مشبہ کو ترک کر کے مشبہ بہ کا ذکر کرتے ہیں تو وہ استعارہ بن جاتا ہے۔ اسی طرح متقدمین اور تشبیہ کو بھیتی کہہ دیتے تھے۔ چنانچہ شیخ امام بخش ناسخ نے ایک مطلع میں کہا ہے۔

اس پری رخسار پر بھیتی کی ہے حور کی
پس تو یہ ہے سو بھیتی ہے کیا ہی مجھ کو دور کی

اس میں پری رخسار مشبہ ہے۔ حور مشبہ بہ ہے۔ وجہ مشبہ دونوں کی خوبصورتی ہے۔ لیکن اصطلاح ضمایع اموؤین

اسے بھیتی نہ کہیں گے بلکہ تشبیہ کہیں گے اس لئے کہ اصول مقررہ سے بھیتی وہی ہے جس میں کوئی معیوبے خال دی گئی ہو۔

جیسے ایک حکیم صاحب تھے جو نہایت لاغر طویل القامت نحیف الجثہ، ان کو چوینٹے سے تشبیہ دی پھر ایسا ہوا کہ لوگوں نے ان کا نام لینا موقوف کر دیا اور سب حکیم چوینٹا کہنے لگے۔

بھیتی کی نزاکت سب سے زیادہ یہ ہے کہ وہ کنایہ بن جاے ایسی پھبتیاں شاذ ہوتی ہیں۔ کنایہ کی تعریف یہ ہے کہ کسی چیز یا

کسی آدمی کی صفت بیان کرین جو موصوف کی عادت یا شکل و صورت سے تعلق رکھتی ہو اور اس سے مراد موصوف کی ذات ہو

جیسے سست کاہل آدمی کی نسبت ایک بھیتی کہتے ہیں۔ پکی بیری تلے کام کرنے والا اور مراد اس صفت سے کاہل آدمی لیتے

ہیں۔ جو چاہتا ہے کہ مجھے بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے کھانے کو مل جائے اسی واسطے پکی بیری کے تلے لیٹتا ہوتا کہ جویر کرے وہ آپسے

آپ منہ میں چلا جائے۔ کبھی خیالی بھیتی بھی کہتے ہیں۔ امانت

سندل اسکی ہے مانگ میں کیا خوب

راہ ظلمات میں یہ دلدل ہے۔

ناسخ کی طرح اور شعرا نے بھی تشبیہ کو بھیتی کہہ دیا ہے

سر کے قویذ و ن پر تیرے میں کون بھیتی نئی

خوشہ پروین ہے یہ اسے مہربان بالاسے سر

سر کے قویذ کو خوشہ پروین سے تشبیہ دی ہے اسے تشبیہ کہنا چاہتے ہیں کہ قویذ کی مدح ہے خدمت نہیں ہے۔

ایک خدمت گار سیاہ فام پہتہ قامت گول جسم مائل بہ فرہی ایک ایسے عارضہ میں مبتلا ہوا جس سے اس کے پاؤں بگنے

بیٹھے بیٹھے چلتا تھا۔ ایک صاحب نے اس پر بھیتی کی جلی ہوئی مڈھی بھیتی ایسی مبارک ہوئی کہ اس غریب کا نام جلی ہوئی مڈھی

ایک وکیل صاحب دراز قد فرہ اندام ضعیف العمر تھے۔ بیچارے دو قدم چلتے تھے اور سود فہ بانہتے تھے ان پر ٹوٹے ہوئے

چھکڑے کی بھیتی موندن کی گئی۔

ایک نواب صاحب پستہ قامت گران ڈیل تھے ان پر حیدر جان کا پاٹھا کی بھبتی تھی۔
 پاٹھا اصطلاح میں ہاتھی کو کہتے ہیں اور حیدر جان چوڑے والی ایک مشہور طوائف تھی جسکے بیان ایک ہاتھی پلا تھا۔
 ایک مشاعرے میں ایک لیڈر صاحب بھی لالہ کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ لالے کی روشنی آپ کے چہرے پر پڑتی تھی۔ آپ
 گندی رنگ فرہ جسم طباقی چہرہ چمک رو دراز لیش کر بچے تھے۔ ایک شاعر بولے آج کے مشاعرے میں شاہناہ اہتمام ہے لالے کے سامنے
 سورج کھلی بھی ہے۔

رجب کی نوچندی ہے نال کوڑے کی کر بلا میں ماتم داران حسین جمع ہیں بیرونی عمارت کی جھت پر لوگ کھڑے ہوئے آنے والوں
 سیر دیکھ رہے ہیں اتنے میں بھانک سے ایک برقع پوش طویل القامت گران ڈیل عورت آتی ہوئی دکھائی دی، جسکے برقع میں ہوا
 بھری ہوئی تھی اس جہت کو دیکھ کر ایک صاحب نے بھبتی کہی۔ ارے بھائی دیکھنا تو یہ حسین آباد کے غلاف پوش بھھاڑ
 کون لے آیا۔ حسین آباد کے غلاف پوش بھھاڑ کی بھبتی اسکے قد و قامت پر ایسی موزون ہوئی کہ سب لوگ بے اختیار ہنس دیے۔
 ایک صاحب ہدنگو کر یہ صورت تھے۔ انہر بھٹے ہوئے ڈھول کی بھبتی کہی۔

خواجہ عبدالرؤف عشرت

کام کی باتیں

معزز ناظرین! یوں تو اس وقت ملک کے عرض و طول میں صد ہا بک ایجنسیاں یا بک ڈپو قائم ہیں اور اگرچہ ان میں
 سے اکثر کا یہ ادعا بھی ہے کہ وہ کتابیں ارزان نرخ پر فروخت کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس قیمت اور رعایت
 کے ساتھ ہمارا یہ چھوٹا سا بک ڈپو بہر قسم اور ہر علم و فن کی کتابیں ”خواہ وہ کسی زبان کی ہوں“ آپ کو دے گا۔
 دوسروں سے اگر ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ اور یہی سبب ہے جو نسبتاً آندہ دو آنے فی روپیہ کی رعایت ایک
 معمولی سی بات ہے۔ مفصل حالات و اسباب رعایت اور نادوہ روزگار کتب کی تدرست کے لئے آدھ آنے کا ٹکٹ
 ارسال فرمائے فقط والسلام۔

المعلن۔ آپ کا مخلص (ایچ ایم) عزیز الدین احمد قرشی جنرل منیجر پروپر ایسٹر ”مفید علم بک ڈپو لکھنؤ“

لارڈ پرن کا عہد حکومت

(مسل)

ناکامی کی معذرت

۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۸ء کی میری سیاحت ہندو گزشتہ اوراق میں بیان ہو چکی ہے اور جن اصحاب نے ان کا مطالعہ کیا ہے وہ بجا طور پر یہ حال کر سکتے ہیں کہ میں نے نیکو نگار ایک بہت بڑے موقع کو اپنے ہاتھ سے کھو دیا جو میرے پیش نظر تھا اور جوشن میں نے اپنے لئے مقرر کر رکھا تھا اسکی تکمیل کرنے کے لئے دوسرے سال کیوں نہیں آیا۔ میں خود بھی اپنے دل سے یہی سوال کرتا ہوں۔ ہندوؤں، مسلمانوں اور پارسینوں میں جو سوخ مجھے حاصل ہو گیا تھا اس کا خیال جب کبھی آجاتا ہے تو میرے دل میں رنج و غم کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں کہ میں نے اس سے پورا پورا فائدہ کیوں نہیں اٹھایا۔ اگر میں استقلال کے ساتھ اس راستہ پر گامزن رہتا جس پر میں جارہا تھا اور اگر میں نتیجہ نکالنے تک مستعد رہتا تو میری سیاحت سے جہاں جتنا تو مجھے یقین ہے کہ میں ہندوستانی باشندوں کے لئے واقعی بھلائی کا کوئی کام کر سکتا تھا اور یکن ہے کہ اگر سیاسی اصلاح میں کوئی کام کر سکتا تھا تو میری سیاحت سے کم حقیقی سواشرقی اور مذہبی اصلاح کے لئے مسلمانوں کو ابھار سکتا تھا۔ اس کے لئے ضرورت تھی کہ میں ساری زندگی وقت کو دیتا اور دیگر امور اور خانگی معاملات کو بالائے طاق رکھ دیتا۔ اس کام پر آمادہ کرنے کے لئے ہمدردی سے بڑھ کر ایک شے کی ضرورت ہے اور میرا خیال ہے کہ مجھ میں اس جوش و اعتقاد کی کمی تھی جسکے بغیر کسی کام کی جانب کا دل تو مجھ میں نہیں مبدل ہو سکتا تھا۔

بہر حال مجھ سے رخصت ہوتے وقت میرا خیال یہ تھا کہ میں آئندہ موسم سرما میں لوٹ آؤں گا اور مجھ پر اسلامی یونیورسٹی لندن کے لئے ضروری روپیہ کی فراہمی کی غرض سے دو فکروں کا۔ مجھے تین لاکھ کے وعدے مل چکے تھے جس کا بیشتر حصہ میرے دوست رائیڈ امیر حسن لکھنؤ کی عنایت کرنے والے تھے۔ نظام کی سرپرستی اور لارڈ پرن کی رضامندی سے کم از کم میری تنخواہ کی تکمیل حیطہ امکان میں ضرور آگئی تھی اور اگر اس میں رکاوٹ پیدا ہوئی تو سارا الزام مجھے عائد نہیں ہو سکتا۔ سال بھر میں ہنسی سے بہت سے وعدے ایسے پیش آئے کہ اسکا نہ کام رہ گئی۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اگرچہ لارڈ پرن حیدرآباد میں ایسے موافق حالات پیدا کر چکے تھے جن کے باعث اصلاح کا کام آسان ہو گیا تھا تاہم وہ کلکتہ کے دفتر خارجہ کو اپنی مرضی کے ماتحت لانے سے قاصر رہے۔ اگرچہ طریقہ رآباد سے بلدی ہی چلا گیا لیکن چریت بمبئی ریزیدنسی کا کلہ جن کا توں رہا۔ کارڈری کو رہنے کی اجازت مل گئی اور بلدی سازشیں بغیر مؤتم کے ساتھ نہ منع ہو گئیں۔ لارڈ علی کو ریزیدنٹ نے مفید صلاح و مشورہ نہیں دیا اور ان کی فوج اور کم پھر یہی بنا رہا۔ طیان ان سے سرزد

ہوئیں۔ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانے میں ان کے دشمنوں نے کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ جو اعتماد ابتدا سے نظام کو ان کی ذات پر تھا اسے تباہ کر دیا گیا اور دونوں کے بہترین ارادوں کے راستہ میں رکاوٹیں پیدا کر دی گئیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے اپنے اپنے فرائض سے غفلت برتنی اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنی شروع کر دی جو ان کی قوتوں کے لئے بالآخر تباہ کن ثابت ہوئی اس طرح سے میں ان اطلاعات کی مدد سے جو مجھے وقتاً فوقتاً موصول ہوتی رہیں اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ نظام کی سرپرستی پر اعتماد زمین کیا جا سکتا۔

دوسری مصیبت یہ تھی کہ لارڈ پرن نے اپنی مدت میعاد ختم ہونے سے پیشتر ہی استعفا دیدیا۔ یہ دیکھ کر ہندوستان میں آزادانہ سٹیٹیشنوں کی بنیاد ڈالنے میں ہر طرف سے روئے گئے۔ جاتے ہیں اور انگلستان کی گورنمنٹ کی جانب سے بھی حقیقی تائید و حمایت مفقود ہے، انھوں نے اپنے قیام کو بڑھانے سوچھا اور ہندوستانی باشندوں کو آہ و بکا کی حالت میں چھوڑ کر شکست خوردہ شخص کی طرح (اور میں یہ نہیں کہوں گا کہ باپس آدمی کی طرح) انگلستان روانہ ہو گئے۔

ان کے جانشین لارڈ ڈفرن (کے زمانہ حکومت) میں صورتِ حالات اپنی قدیم روش پر آگئی اور سیاسی اصلاحات کی ساری امیدیں منقطع ہو گئیں۔ جہاں تک سرکاری ملازمتوں کا تعلق ہے جدید و الأسرے نے مسلمانوں کے ساتھ حقہ خصوصیت برتی لیکن انھیں سخت پورروائی کرنے سے منع کیا گیا۔ جب سرکاری رجحان نے جذبات ٹھنڈے کر دیے تو ایسی آزادانہ روشی کا خیال جسکے اپنے ذرائع آمدنی ہوں اور جو سرکاری اخراجات سے بالکل پاک ہو، قدر تا کم ہوتا گیا اور بالآخر ان بڑے دل اشخاص نے جنھیں ہندو دیر سے اختیار کرنے کی ترغیب دی تھی، اس سے قطعی دست برداری کر لی۔ ہندوستان میں یہ بات شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتی ہے کہ جس کام کی سرپرستی گورنمنٹ نہیں کرتی، اس میں استقلال یا دوام کی صورت پائی جائے یہ یکدم اس وقت بالکل مردہ ہو گئی، جبکہ راجہ امیر جن جنھوں نے لکھنؤ میں اپنے شہید ہم نغمہ ہونے کے لئے کایا کھولنے کے خیال میں استقلال کا اظہار کیا تھا، بیمار ہو گئے، جس کا نتیجہ بالآخر جنھوں کی شکل میں نکلا۔ اگر میں ہندوستان میں واپس بھی جاتا تو مجھے شک ہے کہ میں ان مصائب کو روک سکتے مں کامیاب ہو سکتا۔ انھیں باؤن کا نچوٹھا کہیں ہندوستانی اسکیم کی جانب سے ناامید ہو گیا اور میں نے اپنی قوتیں اس کام پر لگائیں جسے میں موقع و وقت کے اعتبار سے عملی سمجھتا تھا۔

سندھ کے موسمِ خزاں میں میں نے قسطنطنیہ کا چارہ دورہ کیا۔ اس میں میرا ابتدائی جوش بہت کچھ سرد ہو گیا میرا خیال تھا کہ اگر یونیورسٹی کو سلطان الخطمی کی سرپرستی مائل ہو جائے تو پھر اس میں جان پکڑتی ہے عبد الحمید کے کیرکڑے واقع ہونے کے باوجود میری یہ رائے تھی کہ اگر مجھے ان سے باتِ حیرت کرنے کا موقع مل گیا تو میں انھیں اس امر پرائل کر سکوں گا کہ خلیفہ المسلمین ہونے کی حیثیت سے جو رسوخ انھیں ملی سلاطین ممالک میں حاصل ہے، اسے کام میں لائیں۔ لیکن میری یہ سیاست نامکامیاب رہی میں نے یہ دیکھا کہ سلطان المعظم سے ملاقات نہیں کیا جاسکتی اور اگر بھی مل سکتی ہے تو ان ذرائع سے جنھیں میں استعمال کرنا نہیں چاہتا تھا، مزید برآں اس میں بہت کچھ وقت اور روپیہ ضائع کرنا پڑتا تھا قسطنطنیہ میں رہنوت ستانی کا خوب دور دورہ تھا اور سردار اسلام کے ساتھ دربار ہون کی سازش کے بغیر ملاقات ناممکن تھی جب میں ان واقعات کا

نیچے شائع کون کا تو اس وقت معلوم ہو جائیگا کہ عمل کی آب و ہوا بخمدہ خیالات کے کس قدر مخالف تھی۔ اور میں اس یقین کو بیکر قسطاً غلطی سے شخصیت ہو گیا کہ ان حالات کا مقابلہ کرنا یا ناممکن کام کرنے کی کوشش کرنا بالکل بے سود ہے۔ دوسرے معاملات نے مجھے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ مثلاً مصری حالت یا خرطوم میں گارڈن کی حیثیت، ششماہی کے عام انتخاب نے اور اس وقت میں نے پارلیمنٹ میں داخل ہونے کا ارادہ کر لیا۔ ایسی طریقہ سے اگرچہ میں ہندوستان کے معاملات سے کچھ بھی لیتا رہا لیکن اس میں نمایاں حصہ نہیں لے سکا۔

لیکن ساتھ ہی میرا خیال ہے کہ میں ہندوستانی مسلمانوں کے لئے کچھ نہ کچھ کام کرتا رہا۔ ششماہی کے موسم بہار میں انگلستان واپس آنے پر میں لارڈ رینڈ ولفن چرچل سے ملا۔ ان کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ وہ پارلیمنٹ میں اسلام کا حامی ہونے کی حیثیت سے میری تجویز کی تائید کریں گے۔ میرے ہی کہنے پر انھوں نے موسم سرما میں ہندوستان کا سفر کیا اور جو تاریخی خطوط میں نے انھیں دیدئے تھے وہ ایک حد تک ان کی کامیابی کے ذمہ دار تھے۔ انجام کار ان کی سیاسی کچھ پیسیان اس قدر وسیع ہو گئیں کہ کسی ایک کام کے لئے مستقلاً دیکھ کر رکھنا ناممکن تھا۔ ان کی سیاحت کے وقت سے ہندوستانی مسلمانوں کی جانب سرکاری پالیسی میں تبدیلی کی گئی ہے جس پر ہمیشہ غلہ رائے ہوتا رہا۔ چھٹیت قوم ہندوؤں کی کانگریس کا اثر زائل کرنے کی غرض سے ان کی بہت افزائی کی گئی اور جو خیال میں نے ”مستقبل اسلام“ میں ظاہر تھا اسے گورنمنٹ نے رفتہ رفتہ اختیار کر لیا ہے۔

جو وعدہ میں نے اپنے ہندو دوستوں سے کیا تھا۔ یعنی یہ کہ ان شکایات کو اپنے ہم ملکوں سے بیان کر دینا جن میں پچھتر خودکچھ چکا ہوں اس سے بھی میں غافل نہیں رہا۔ وہ شکایات یہ ہیں۔ اس ملک کے باشندوں کی خوفناک غربت، ہمارے ہاتھوں ان کی تفریق، تباہی کا انجام پانا، لگان کی نظامداری، زمین جہین ہمیشہ اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے، جنگلات کے قوانین، اور ملک کا محصول سرکاری حکام کا غور و تمکنت، انگریزوں اور ہندوستانیوں میں باہمی نفرت و حقارت کی موجودگی۔ ششماہی عین میں نے ان تمام شکایات پر ”فارٹ مارٹلی ریویو“ میں سلسلہ مضامین لکھا اور انھیں بعد میں چھپوئی سی کتاب کی صورت میں دوبارہ شائع کر دیا۔ چونکہ وہ اب ناپید ہے لہذا میں اسے اس ڈائری میں تتمہ کے طور پر شامل کئے دیتا ہوں۔

اس میں ملکی اصلاحات کے بارے میں اسکیم بھی ملے گی جیسے پورے ایک نسل کے وقفہ کے بعد انڈیا آفس ہدوی کے ساتھ نافذ کر رہا ہے۔ جو تبدیلیاں اس عمل میں آئی ہیں ان کے بارے میں تشریحی نوٹ بھی لگا دیے گئے ہیں۔ انیسویں صدی کے اس قسم کی تبدیلیاں شاید نو اور ہی بہتری کی صورت رکھتی ہیں۔ نجل طور پر ہندوستان کی اقتصادی حالت ویسی ہے جیسی کہ لارڈ پرین کے زمانہ میں تھی۔ مگر صرف اتنا ہوا ہی کہ مسلسل قحط اور بے مفاسی کے بوجھ میں اور زیادہ اضافہ کر دیا ہے۔

ہندوستان کے قحط دیا وہ شدید رہے ہیں اور بار بار وقوع میں آئے ہیں اس کی زراعتی مفاسی زیادہ پاکہ ہو گئی ہے اس کی زراعتی پاکہ زیادہ مقرر ہو گئی ہے اور اس کی ناامیدی نے زیادہ خوفناک شکل اختیار کر لی ہے۔ لگان اراضی میں وقتاً فوقتاً پیش کرنے کی پالیسی میں کوئی ترمیم نہیں ہوئی

Review of the work of the Government of India in the year 1905-06

نمک کا حصول اگرچہ کسی قدر ہلکا کر دیا گیا ہے، تاہم غرابا کے لئے وہاں جان بننا ہوا ہے۔ بھوک اور وہ دباہین جو بھوک کا لازمی نتیجہ ہیں، وسیع تر رقبہ پر پھیل چکی جاتی ہیں۔ دکن کا کسان غالباً دنیا میں غریب ترین آدمی ہوتا ہے۔ نظامِ رالیا میں کوئی تبدیلی عمل میں نہیں آئی اور نہ کسی قسم کی اگاہیت ہو رہی جاتی ہے۔ جو بات ۲۵ سال پیش تر خراب تھی، آج بدتر حالت میں ہے۔ بہر صورت سابق کی طرح اب بھی ہندوستانی خام اجناس غیر ملکی معدون کی نڈا بن رہے ہیں۔ قحط اور طاعون جس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ برطانوی ہند دیہات کے ساہوکاروں کے قرض کی نڈا میں جکڑا ہوا ہے، ایسے واقعات میں جھین خوشحالی کے بارے میں سرکاری اعداد و شمار نہیں کر سکتے۔

سٹیشن من میں نے فقر، وقار، کیے جو واقعات دیکھے تھے وہ اب اور بڑھ گئے ہیں۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ان ۵۰ سالوں میں زندگی اور اقامت کے ساتھ سفید اقوام کے طرز عمل میں نمایاں تبدیلی ہو گئی ہے۔ عیسوی مذہب کی قدیم مذہبی تہذیب جیسے عیسائیت کو اس قدر ناز ہے، یہ بھی کہ تمام انسان کم سے کم خدا قوام کی نفرت میں مساوی درجہ رکھتے ہیں لیکن اسکی جگہ ایک اور اصول نے جو نیم سائینٹفک ہے۔ نے لی ہے یعنی کہ انسانی اقوام بنیادی طور پر غیر مساوی ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ ٹھیک ہو، لیکن اس کو سبباً اندازہ نظر بقدرت بیان کیا گیا ہے اور اسے سیاسی مقاصد کے لئے بدین غرض استعمال کیا گیا ہے۔

لے بدین غرض استعمال کیا گیا ہے۔

مل کے اور دنیا کی زندگی اور اقامت سفید اقوام کی باز حکومت کے دعوے کو تقویت پہنچانے کے۔ میں نے اسے نیم سائینٹفک اس بنا پر قرار دیا جو کہ دنیا کے قدرتی قوانین میں اس قسم کی کوئی شے موجود نہیں۔ ڈارون کا اصول کشمکشِ حیات، اس دعوے سے متضاد ہے کہ ایک قوم دوسری قوم سے فوقیت رکھتی ہے اور یہ کہ اسے باقی اقوام پر حکومت کرنی چاہئے۔ اور دنیا کی تاریخ میں ایک قوم نے کسی دوسری پر اس طرح غلبہ حاصل کیا ہے۔ کوئی قوم اگر زندہ رہی ہے تو اسکی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ زیادہ طاقتور تھی، یا یہ کہ زیادہ جاہل یا زخمی بلکہ اسے لے لے اس میں مقامی حالات کے موافق زندگی بسر کرنے کا زیادہ مادہ موجود تھا۔ یا جو داسکے یہ بات عام طور پر دیکھنے میں آ رہی ہے کہ سہند کے طور پر ڈارون کے اصول کو ایسے ممالک میں جو پورے دنیا کی زندگی کے لئے موزوں نہیں ہیں۔ امپیریل غلبہ و اقتدار اور نسلی تعصب اور بدکاری کے جواز میں پیش کیا جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قطع نظر پادریوں کے مشرق میں جو انگریزی دکھائی دیتے ہیں وہ برائے نام ہی عیسائی ہیں اور ان کا رعبان یہ ہے کہ چون جو موجودہ حالات کی ترقی ہوتی جائے وہ عیسائیت سے اور دور ہٹتے جائیں۔

برخلاف اس کے ہندوستانی اقوام جن میں سے اکثر ذہنی لحاظ سے پورے ہندوستانی اقوام کی ہمسر ہیں، خاموش بیٹھی ہوئی نہیں ہیں قطع نظر اس تعلیم کے جو وہ سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں حاصل کر رہی ہیں، مغربی اصول اور طریقے پورے ہندوستانیوں کے ساتھ دن بدن زیادہ میل جول رکھنے کے باعث ان میں زیادہ عام ہو رہے ہیں اور سفر کی ان سہولتوں سے انہیں واقفیت ہو رہی ہے جنہیں انہوں نے از خود حاصل کیا ہے۔ اگر ہندوستان کا ہر سرکاری مدرسہ بند کر دیا جائے اور ہر اخبار کو دبا دیا جائے تو مجھے شبہ ہے کہ اس قسم کی معلومات ترقی کرنے سے رک جائیں گی۔ سیاسی معلومات تحریر کے بجائے تقریر کے ذریعہ ایک دوسرے تک پہنچتی رہے گی اور بہر صورت یہ یقینی امر ہے کہ کم سے کم

Darewin

شہروں میں اصلی قیمت پہچان لی گئی ہے اور ہر شخص پر حتیٰ کہ غریب ترین شخص پر ان کی اخلاقی کمزوریوں اور ذہنی کمزوریوں کا حال اچھی طرح سے واضح ہو گیا ہے۔

مجھے اقرار ہے کہ میں یہ معلوم کرنے سے قاصر ہوں کہ اننگلو انڈین سول سروس کے نام قواعد وغیرہ نافذ کرنے سے یہ ناخوشگوار صورتحالات کس طرح سے تبدیل ہو سکتی ہے۔ میں اسکی جانب سے بالکل مایوس ہو گیا ہوں اسلئے کہ اسی قسم کی تباہ کن نشوونما میں بھر میں بھی دیکھ چکا ہوں۔ انگریزی قبضہ مقرر سے سات سال قبل انگریزوں اور مصریوں کے باہمی تعلقات نہایت اچھے تھے دونوں میں مراسم قائم تھے اور دونوں ایک دوسرے کا ادب و وقار ملحوظ رکھتے تھے اور انگریزی سیاہون کو (جسکی تعداد اُس زمانہ میں بہت کم تھی) اس امر پر فخر ہوتا تھا کہ قاہرہ کے مالدار مسلمان انھیں اپنے یہاں مدعو کرتے ہیں اور دیہات کے غرابو ہر وقت انھیں خوش آمدید کہنے کیلئے تیار رہتے تھے۔ لیکن ششہ ع کے قبضہ سے ہمارے اہل ملک نے جو غلط پوزیشن حاصل کر لی ہے یعنی حاکم اور محکوم کی اور جس میں حاکم تو غیر ملکی بن جو ملک کے باشندوں کے خلاف نسلی امتیازات برتنے کے خواہشمند ہیں۔ اُس نے گزشتہ صورتہ حالات کا بالکل خاتمہ کر دیا ہے۔ خوشگوار معاشرتی تعلقات صرف اُن لوگوں میں جاری رہ سکتے ہیں جہاں متعلقہ اشخاص مساویانہ طریقہ سے مل جل سکیں اور تمام امتیازات میں نسلی امتیاز ہی ایسی شے ہے جو مساویانہ تعلقات میں حائل ہوا کرتی ہے۔ ہندوستان میں معاملات یہاں تک ترقی پا چکے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ تا وقتیکہ ملک کا انتظام کلیدیہ ہندوستانی ہاتھوں میں نہ دیدیا جائے سول سروس کو مخصوص جماعت کی حیثیت سے موقوف نہ کر دیا جائے اور یورپیوں کو محض اعلیٰ تنخواہ پانے والے ملازمین (نہ کہ آقا) کی حیثیت نہ دیدی جائے اس وقت تک انگریز اپنی برتری و فوقیت کے دعاوی سے دست بردار نہ ہوں گے۔

آخری باب ”سیلف گورنمنٹ کا مستقبل“ پر میں کچھ اسے زنی کرنا نہیں چاہتا اس لئے کہ یہ مضمون پچیس سال قبل لکھا گیا تھا۔ تاہم اخبارات کے متعلق جدید قواعد کے ذریعہ ہندوستان میں جس تحریر و تقریر اور اظہار رائے کی آزادی کو سلب کیا جا رہا ہے اور ازسرنو استبدادانہ طریقہ سے گرفتاریاں عمل میں آرہی ہیں اور لوگوں کو مقدمہ چلائے بغیر قید کیا جا رہا ہے یہ ایک ایسی کارروائی ہے جس پر میں صدائے احتجاج بلند کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مبادا میری خاموشی کا یہ مطلب لیا جائے کہ میں اسے پسند کرتا ہوں حکومت کے طریقہ نہ صرف میرے نزدیک قابل نفرت ہیں بلکہ مجھے یقین ہے کہ وہ بیکار ہیں اور ان کا اثر بُرا ہوگا اور ان کو جاری رکھنے کے یہ معنی ہوں گے کہ جو گورنمنٹ اُن پر اعتماد رکھتی ہے وہ کچی ترقی پیدا کرنے والی اصلاحات کے نفاذ کا بخیرہ اوراد نہیں رکھتی۔

ص۔ ا۔ ب۔ برنی

مرکض کاخونی ڈاکوہر مالوے کی بیگم ۴ گوبربانو ۴ حُن عیار ۴ بھگارتی ۱۰ (منیجر بھگارتی بک ڈپنٹیرا بکٹ)

امیر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کا پتہ صرف خالکھنؤ کافی ہے

ضبط آرزو

اتنی کمان مجال کہ تجھ سپر نظر کر دین
کیونکر شرف یہ پائین کہ ہوں تجھ سے ہم کلام
پیدا کرین کمان سے وہ تاب سکوت سوز
بے چینوں کی کھینچ دین تصویریں طرح
کیونکر دکھائیں منظر خون گشتگی اشک
کیونکر یقین دلائیں کہ دل میں لگی ہوا گ
کس شکل سے دکھائیں تجھے سوزن دن
تھرا جب التفات ہی تیرا وہ اے دل
تیرے سوا کسی سے نہیں واسطہ تو پھر
کنے کو کہہ بھی جائیں اگر کچھ تو کس طرح
کیونکر وہ لفظ پائیں جو تصویر درہون
گھل گھل کے جان دین جو یہی ہوا تری
رور و کے کاٹ دین سحر و شام زندگی
تصویر شمع بن کے رہیں ہم جہاں بھی ہوں
جھکو بھلا دین دل سے نہیں تو ایس کی بات

ایسے کمان نصیب ترے دہین گھر کرین
اظہار حال کس طرح اے بے خبر کرین
جو ہم بیان کلفت در و جب گھر کرین
کیا ذکر نالہ شب و آہ سحر کرین
ہم کیا کرین جو تیری نگاہیں ادھر کرین
پیدا کمان سے نالہ پراز شر کرین
کیونکر تری نظر کو حقیقت نگر کرین
پھر کس غرض سے منت ہر چارہ گھر کرین
کسکے بتائیں راز کسے نامہ بر کرین
پھر تیرے ذہن میں بھی اُسے معتبر کرین
کس طور سے بیان میں پیدا اثر کرین
غم کا گلانا اب سے کبھی عمر بھر کرین
جل جل کے جتنی عمر رہی ہے بسر کرین
جس حال میں ہوں اُن نہ زبان سنگ کرین
جو کچھ بھی ہو مگر نہ خیال دگر کرین

من کر یہ حال مختصر کلفت شمیم
جو کچھ کرین حضور زرا سوچ کر کرین

شمیم خیر آبادی

غزلیات

محکمہ بی لے

نظم طرف چین بگل خندان افتاد ہواش دل سودا زده ام شد بر باد
چشم شوقم ہمہ و اماند بنظر آ رہ او غنچہ نشاطم از جلوہ حسنش نہ کشاد
دست شوقم بر سرش برد لا دیزی او ساخ گل دل آشفتم از دست نہ داد
چیدم از شلخ گل دبر زوش سیٹھ او بہ ہواداری وصلش ہمہ تن یوم شاد
یادم آمد گئے از پوسے ولا دیز کے مست بودم ز غم و فکر و عالم آزاد

گل خوش رنگ دلم بردنہ دانستم من ہمہ نیز نکی این دامگہ کون و فساد
رنت خامے یہ دلم با گل خندان چین می رسد از دل خون گشتہ ام ایک فریاد
گل سیدہ بخوان درد و غم باقی است غلٹے یا ہمہ دین نیست ہمہ بے بنیاد
عشق است یہ علم نتوان نشان کرد

دولت خاص بہر کس نتوان محنت داد

نظیر لودھیانوی

ہر طفل نازنین ترا پیدا کر ہے آج اس بہین وہ نرم خرامی کہ بھر ہے آج
ہمراہ میکدہ میں جو وہ فتنہ گر ہے آج اک کام ہے زمین پہ اک عرش پر ہے آج
مقتل میں اڑ رہی ہے یہ افواہ صبح سے یا تیغ آبدار ہے یا میر اسیر آج
گلشن میں کل اسی کا ہمارے مصقر بھا صیاد کے قفس میں جو بے بال و پر ہے آج
قاتل نے قتل کہ میں مجھے کیا بلا دیا دنیا کا کچھ پیہ ہے نہ اپنی خبر ہے آج
ارمان کچھ چراغ جلائے ہیں عشق نے یا آنسوؤں میں حری خون بگر ہے آج
گو لطف سے تہیں ہے سر کیس ہے مگر میں خوش ہوں اس طرف ہی کسی کی نظر آج

شاخ ستم بھی ہو گئی بار آور اور فلک
نیو پہ منگلا گاہ میں عاشق کا سر ہے آج
بے اعتدالیوں کے مضامین کی مانگ ہے
حیرت یہ ہے کہ عیب بھی بار بار ہر دو آج
کل جن کا آستان تھا فلک سے بلند تر
ان سب کا سجدہ گاہ ترا سنگ در ہر آج
آپ روانہ ہجوم گل دلالہ وقت صبح
تصویر تیرے حسن کی پیش نظر ہے آج
اے کاش کوئی حضرت داغظ کو دبوخبر
کیفیت بہشت مری بام پر ہے آج
تم بھی سیاہ کا رتھے کل تک تو اے نظیر
کیا ہو گیا کہ سنا غم سے حذر ہے آج

مجنون گورکھ پوری

ڈر ہے کہ روزِ عشرت کچھ رنگ پھر نہ لائیں
خون گشتہ آرزو میں رو کر وہ التجائیں
یہ کس کے رنگ دھتے معور ہیں فضا میں
چھپ رہی دالے ہم سے آہ تجھے دکھائیں
اک دوسرے کے یونی گرویدہ ہوتے جائیں
تم بار بار دھتورہ کے ہم منائیں
پھر کہہ رہی ہے وحشت لے راہ کوہِ مہرا
پھر جامہ خرد کی چل دھجیاں اڑائیں
پھر ہوک اٹھ رہی ہو پیہم دل و جگر میں
پھر یاد آ رہی ہے اس شوخ کی ادائیں
اک مشتِ تنہا رنگ میں پھر رہا ہے
پھر ہوں وہی دفا میں پھر ہوں جی جائیں
بیدار کر دیا ہے خوابیدہ حسرتوں کو
آفتہ قیامت تجھ کو گلے لگائیں

ساتی گری کے صدقے ہاتھ اب رکھنا ساتی

جب تک کہ دم میں دم ہے یونی نہیں پلائیں

جگر بریلوی

دلِ مرحوم کی اک اک صیت راز دکھاتا
نہ پوچھو ہم سے ساری عمر گزری کی لہجہ میں
کسی کی یاد پر آنکھوں میں آنسو لب چٹکائی
لے بیٹھا ہوں ل کی خاک میں آنسو دہن میں
تمیز نیک و بد کا ہے محبت وہ کرشمہ نہیں
نظر آئے گا کہو جلال دوست دشمن میں
صفائے قلب ہے تم جگر معذور ہو جاتے
اگر ہوتی نہ داخل عیب مینی خوشن میں
دل بہت بیقرار رہتا ہے
موت کا انتظار رہتا ہے

کبھی دل میں جھجھکتا جو کانٹا
اب رگ جاں کے پار رہتا ہے
میں بُرا ہو کے ہو گیا تیرا
یہ بہت ناگوار رہتا ہے
تھا یہی دل کبھی حیات نواز
اب جو زار و نزار رہتا ہے
کیا تبسم میں اس کے دیکھ لیا
کیون جگر آشکار رہتا ہے
یوسف گجراتی

جفاؤں پر جفا ہے اور میں ہوں
دل صبر آتش ہے اور میں ہوں
گئے، وہ دن کہ شکوے تھے جہاں کے
اب اپنا ہی گلہ ہے اور میں ہوں
ہزاروں آنرویں تھیں مگر اب
دل بے دعا ہے اور میں ہوں
نشاء تھا کبھی بیتابیوں کا
بھرا ب صبر و رضا ہے اور میں ہوں
سہارے ہو چکے سارے جہاں کے
خدا کا آسرا ہے اور میں ہوں
اشرفیہ لذت پیدا کا کچھ
تمنا ہے اور میں ہوں

اٹھائے رنج و نیا کے ہیں یوسف

غم روزِ جزا ہے اور میں ہوں

سونا اور روپے تولہ
سونے کنج میں حیرت انگیزی
کئی کراڑ ماہ

جہنمی کی حیرت انگیز ایجاد

میں فریق نہیں آتا۔ یہ ساری جہتی ہیں۔

صنعت کار کے لئے بہترین مفت

وہاں روپے ہیں انصور روپے کا کام لاجائے کتنا ہے ہر سال ان کو جو وہیں بیٹھ کر روٹھاتا تھا وہیں روزانہ فروخت ہوتی ہیں۔ جلد منگو بیٹے تاکہ ان کا حق نہ ہو جائے۔

چوڑیاں اس شرط پر روٹھاتی جاتی ہیں کہ ان کو پابند ہوں تو روپے اس کے کہ اسے روٹھائے۔

قسم خاص۔ چار روپے فی سٹ۔ تین سٹ کے لگے گا۔ وہ روپہ ایک سٹ میں آٹھ روپہ چار سٹ میں ہوں گی۔ مصلوہ لوگ ایک سٹ سے چھ سٹ تک ہر

میں نے اس کو

ہم اب بھی جرم سے بکرکے ہیں جو کچھ بھی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس قدر خوبصورت ہیں انہیں گھوڑے کی طرح جاتا ہے درجنوں کہان کے گھمائی بہت تیزی اور اونچے ترین کے

منہج کونسلان سلور پوسٹ بکس نمبر ۴۲- لاہور

استفسارات

حجر اسود۔ امام مہدی

(جناب منظور الہی صاحب۔ کلکتہ)

- (۱) حجر اسود کی تاریخی حیثیت کیا ہے۔ یہ پتھر کہاں سے آیا اور اس قدر قابل احترام کیوں شمار کیا جاتا ہے۔
- (۲) امام مہدی کب آئیں گے کیا آیات قرآنی ان کے نزول کی شاہد ہیں، اگر ہیں تو کون کونسی، آپ کے نزول کی کیا نشانیاں ہوں گی مفصل تحریر فرمائیے۔

(ننگار) آپ کو شاید معلوم ہو گا کہ عبادت کی اولین رسمی صورت جو دنیا میں قائم ہوئی وہ قربانی تھی، جسکا ثبوت خود قرآن پاک سے ملتا ہے (ملاحظہ ہو واقعہ ہابیل وقابیل) اُس وقت تک کہ انسان ڈانوا ڈول زندگی بسر کر رہا تھا اور کسی جگہ اس کے قیام کا ٹھکانا نہ تھا، رعم قربانی ادا کرنے کے لئے بھی کوئی متعین جگہ نہ تھی اور نہ ہو سکتی تھی۔ لیکن جب اس میں آثار تمدن پیدا ہوئے اور اس نے اپنے قیام کے لئے جگہ مقرر کی تو قدرتاً قربانی کے لئے بھی کوئی مقام اس کو مختص کر لیا ہے تھا۔ چنانچہ جائے قربانی کی تعیین کی رسم زمانہ قدیم سے چلی آ رہی تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نبی بنا کر بھیجے گئے اور انھوں نے بھی جب دستور قربانگاہ، یا مذبح جسے مقدس ترین معبد کی حیثیت حاصل تھی، قائم کی۔

قربانگاہ یا مذبح کی صورت یہ تھی کہ ایک پتھر بطور نشان کے قائم کر لیتے تھے اور اسی جگہ کو خدا کا معبد سمجھ کر قربانیاں کیا کرتے تھے، چنانچہ توریت مقدس سے ابراہیم اور آل ابراہیم کا اس طرح پتھر نصب کر کے فوج بنانا پوری طور پر ثابت ہے (ملاحظہ ہو کتاب پیدائش (باب ۲، آیت ۷)، (باب ۱۳، آیت ۸)، (باب ۲۲، آیت ۱۷)، (باب ۲۸، آیت ۱۸، ۱۹، ۲۲) اور کتاب خروج (باب ۲۴ و ۲۵)

جب حضرت ابراہیم سرزمین مکہ میں تشریف لائے تو انھوں نے وہاں بھی اسی دستور کے مطابق ایک پتھر قربانی کی جگہ متعین کرنے کے لئے افسب کیا جس کو حجر اسود کہتے ہیں۔ اخبار مکہ میں ارزقی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پتھر جبل بوقیس سے چلایا گیا تھا۔ بعد کو جب ابراہیم کی اولاد نے اس جگہ مستقل مکان (مذبح) بنایا تو اس پتھر کو لیکر اسی دیوار میں لگا دیا جس سے مقصود یہ تھا کہ طوائف کے شریع اور ختم کرنے کی جگہ متعین ہو جائے۔ پھر چونکہ حجر اسود حضرت ابراہیم کی یادگار ہے اس لئے

اس کا تاریخی، اثری اور مذہبی احترام ظاہر ہے۔

اب یہ پتہ چلنا بہت دشوار ہے کہ یہ پتھر اصل میں کتنا بڑا اور کس رنگ کا تھا کیونکہ اول تو کثرتِ مس سے اس کی سطح بالکل چکنی ہو گئی ہے اور دوسری یہ کہ دو دفعہ کعبہ میں آگ لگنے کی وجہ سے اس کا رنگ بھی سیاہ ہو گیا ہے۔

حجر اسود کے متعلق جو اور بہت سی روایات بائی جاتی ہیں کہ وہ پہلے سفید تھا اور انسان کے گناہوں نے اسے سیاہ کر دیا یا یہ کہ وہ بہشت کا لعل تھا یا یہ کہ قیامت کے دن اس کی آنکھ اور زبان ہو جائے گی اور وہ لوگوں کے بوسہ دینے کی شہادت دیگا یہ سب مجروح اور ناقابل اعتبار ہیں۔ کلام مجید میں کسی جگہ اس پتھر کا ذکر نہیں آیا ہے اور اسی سے اس کی عدم اہمیت ظاہر ہے (۲) امام مہدی کے نزول کا ذکر کلام مجید میں کسی جگہ نہیں ہے اور نہ میں اس کا قائل ہوں

مسلمانوں اور عربوں کا علم الکیمیا

(جناب سید فضل رسول صاحب - بھگلپور)

کہا جاتا ہے کہ عربوں اور مسلمانوں نے علم الکیمیا میں بڑی ترقی کی تھی، لیکن اس وقت ان کا کوئی کارنامہ ہمارے سامنے نہیں ہے۔ کیا آپ اس امر کی زحمت فرمائیں گے کہ اس مسئلہ پر بسیط نظر ڈال کر یہ بتائیں کہ مسلمانوں یا عربوں میں اس علم سے کیا مقصود تھا، ان کے کیا اصول تھے۔ اس فن کے جاننے والے کون تھے، کونسی کتابیں انھوں نے تصنیف کیں اور ان کے اصول علم الکیمیا کیا تھے؟

(ہنگار علم الکیمیا نے جو ترقی اس عہد میں کی ہے، وہ یقیناً اس سے قبل کبھی نہیں بائی جاتی تھی، اور نہ ایسا ہوا ممکن تھا کیونکہ علوم کی ترقی رفتہ رفتہ صدیوں میں جا کر ہوتی ہے، لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ مسلمانوں کے کارنامے اس علم میں بھی کم قابل احترام نہیں ہیں۔ آپ کا سوال نہایت بسیط گفتگو چاہتا ہے کیونکہ بحث کے مختلف پہلو ہیں اور ہر پہلو ایک مستقل موضوع سخن بن سکتا ہے لیکن اس وقت میں صرف مختصر مقالہ پر قناعت کروں گا اور کوشش کروں گا کہ کم سے کم الفاظ میں آپ کے سوال کے تمام اشارات کا احاطہ کر سکوں۔

کیمیا کا مفہوم اول عربوں میں یہ تھا کہ ایک دھات دوسری دھات میں تبدیل ہو جائے اسی لئے لفظ کیمیا، اکیس کا مترادف ہو گیا اور بعد کو اس مفہوم نے قدر و وسعت اختیار کر لی کہ ہر وہ ذریعہ جس سے کوئی شے حاصل ہو سکے کیمیا کہلائی جانے لگا، چنانچہ الفاظ کیمیا، اسعاد، کیمیا، والقلوب وغیرہ کی ترکیب اس پر شاہد ہے۔

امثالنی توام صغر علی محمد علی تاجر عطر لکنئو سے منگانا چاہئے

فہم کیمیا کے نام ان کے ہاں متناہتے اور صناعت الکیمیا، صناعت الاکیر، علم الصناعت، علم الاکیر وغیرہ ناموں سے پکارتے تھے بعض نے اس کو علم المیزان، اور علم المفتاح سے بھی تعبیر کیا ہے۔

اس علم کی ابتداء کے متعلق بعض مسلمان مصنفین کا یہ عقیدہ ہے کہ خدا نے آدم کو سکھایا اور اس کے بعد شیث، ابراہیم اور یس، داؤد، سلیمان، موسیٰ، سے منتقل ہوتا ہوا نبی آخر الزمان تک پہنچا اور پھر ان سے حضرت علی کو ملا، لیکن خیر یہ تو شاعری ہی شاعری ہے حقیقت یہ ہے کہ عربوں نے زیادہ تر اس فن کو یونانی کتابوں سے حاصل کیا جو ہر مس و دیمقر اطس سے بیکر فیثاغورس اور بطلیموس کے عہد تک لکھی گئی تھیں۔

فہرست ابن ندیم، اشکاف الظنون، الوافی فی تدبیر الکافی، المصباح فی علم المفتاح میں مسلمان ماہرین کیمیا کی فہرست اور ان کی تصانیف کا حال درج ہے جنہیں خاص خاص یہ ہیں:-

(۱) خالد بن یزید شامی جو خاندان نبی امیہ میں سے تھا شمسہ میں وفات پائی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے فردوس الحکمتہ ایک عمدہ کتاب علم الکیمیا پر لکھی تھی۔ (۲) جابر بن حیان اس نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں جنہیں سے خاص خاص کتاب الموازین الصغیر، کتاب التبع، الزہیق الشرقی ہیں۔ (۳) ابن الوحشیہ جن کا نام ابو بکر احمد بن علی الکلفانی تھا۔ یہ دوسری صدی ہجری میں پایا جاتا تھا اس نے متعدد رسالے علم الکیمیا پر لکھے (۴) ابو بکر محمد بن زکریا الرازی یہ تیسری صدی ہجری میں تھا اور اپنے عہد کا نہایت مشہور طبیب تھا۔ علم الکیمیا پر اس کی تصنیف ”کتاب الاسرار“ خاص چیز ہے۔ (۵) ابن امیل التیمی۔ آٹھویں صدی میں ہوا ہے اس کی کتاب مفتاح الحکمتہ العظمیٰ مشہور ہے۔ (۶) مسلمہ بن احمد الجریلی جو تہی ہدی ہجری میں ہوا ہے اور اس کی کتاب طبقات العلماء قابل ذکر ہے۔ (۷) ابو الحکیم محمد بن عبد الملک صاحب عین الصناعت و دعون الصناعت۔ (۸) مویہ الدین الطغرائی مشہور وزیر و شاعر۔ کتاب الالوار و المفتاح۔ مفتاح الرحمتہ، نور الحکمتہ اور جوہر المیزان فی صناعت الاکیر اس کی مشہور کتابیں ہیں۔ (۹) ابو الحسن بن موسیٰ صاحب شدور الذہب۔ (۱۰) ابو القاسم محمد بن احمد العراقی صاحب المکتب (۱۱) علی بن ایدمر۔ (۱۲) ابو الاصبغ بن تمام الطغرائی اور (۱۳) فارابی۔

یہاں اصول پر گفتگو کرنے کی گنجائش نہیں ہے، لیکن خود ان کی اصطلاحات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑی حد تک مکمل تھے چنانچہ الفاظ تجزیر، تدقین، تخریج، تحلیل، ترکیب، تدقیق، تقطیر، تصفیہ، تدبیر، تعقید، تجتید، ترجمیم، تشمہ، بھلیس، تجتید، تصفیہ، تحقیق، اللام وغیرہ سے اس کا بخوبی پتہ چلتا ہے کہ ان کے ہاں علم الکیمیا کس قدر وسیع تھا۔ جوہر اڑانا، منجمد کرنا، سیال بنانا، صاف کرنا، اجزا، علیحدہ علیحدہ کرنا، مرکب کرنا، صاف کرنا، مقطر کرنا، چونہ کی شکل میں تبدیل کرنا موم کی طرح نرم بنانا۔ یہ سب ان کے علم میں تھا اور کرتے تھے۔ تمام اعمال کیمیاء کی کئی انھوں نے آلات بھی بنائے تھے

جن کی تفصیل کتابوں میں موجود ہے۔ کو تو اب بھی بازار کی اشیاء کی جانچ انھیں اصول سے کرتا تھا اور دیکھتا تھا کہ ان میں کوئی میل تو نہیں ہے۔ عطر سازی کا فن بہت ترقی پر تھا۔ خصوصیت کے ساتھ دمشق و ایران میں اسی طرح شکر سازی، مختلف قسم کی روٹیاں بنانا، تعمیر کا سالہ طیار کرنا اور نقلی جواہرات بنانا یہ سب نہ صرف ان کی علم میں تھا بلکہ ان میں سے ہر ایک فن پر علحدہ علحدہ وہ مبسوط تصانیف چھوڑ گئے ہیں۔

علم الکیمیا جاننے والے دو جماعتوں میں منقسم تھے۔ ایک اس بات کا قائل تھا کہ ایک دھات دوسری دھات میں تبدیل ہو سکتی ہے اور دوسرا اس کا مخالف تھا، اول الذکر جماعت میں سے بہت سے لوگ ایسے بھی پیدا ہوئے جنھوں نے لوگوں کو دھوکا دینا شروع کیا، اور ان کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے۔

اس میں شک نہیں کہ علم الکیمیا کی کتابوں کی ایک بڑی فہرست مرتب ہو سکتی ہے۔ لیکن ان میں سے بہت کم ایسی ہیں جو ہم تک پہنچی ہیں اور اس لئے اس وقت تک مسلمان کیمیا دانوں کے کارنامے صحیح و مکمل روشنی میں پیش نہیں ہو سکے مسلمانوں نے اس فن کو زیادہ تر یونان والوں سے حاصل کیا، لیکن اس میں بعد کو بہت کچھ ابداع و اختراع سے بھی کام لیا اور متعدد آلات و طریقے ایسے پیدا کئے جو اس سے قبل وجود میں نہ آئے تھے۔

حیرت انگیز عزت

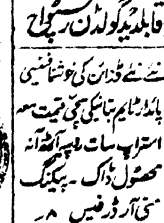
پندرہ روپے کی تین گھڑیاں

صرف دس روپے میں

محصولہ ایک اور پینک بھی معاف

آپ کے لئے + آپ کے کہہ کے لئے + بیوی کے لئے +

مندرجہ ذیل نوں گہرائی ٹایمیں
یہ تین گہرائی گراپیک شت طلب فرمائیں تو صرف مبلغ
دس روپے میں بھی جائیں گی یہ رعایت محض ان کی نکاحی
اور فرم کی شہرت کی وجہ سے جو اور یہ رعایت نہ وقت تک رہے گی
جو ایک پینک ہاں ٹاک میں دینی اسے بعد تمیل کے دہانہ ہوں گے
آپ فوراً آرڈر بھیجیں یا نہ ہو کہ اسٹاک ختم ہو جائے
اور آپ کی فٹنس کی تمیل نہ ہو سکے +

شہرہ نامی ایسے ہیں جن دیکھنے میں خوبصورت چال کا اجھا پنڈول کا مضبوط ٹائم کا تھپا۔ جو بہت سا۔ قیمت دور ہوئے۔ محصولہ ایک پینک۔ بیوی کر فٹنس۔	 گہرائی سال	ریلوے ٹیٹریٹ ایکٹ وایج محصولہ ایکس۔ خوبصورت۔ مضبوط ٹائم نہایت صحیح۔ تھپے والی قیمت مدد میں پانچ روپے آدھ محصولہ ایک۔ پینک مسی کر فٹنس۔	 قابلہ ٹیٹریٹ ایکٹ وایج نئے ٹیٹریٹ ایکٹ وایج بازار نامی ایسے ہیں جن استراپ سات روپے آدھ محصولہ ایک۔ پینک مسی کر فٹنس۔	 قابلہ ٹیٹریٹ ایکٹ وایج نئے ٹیٹریٹ ایکٹ وایج بازار نامی ایسے ہیں جن استراپ سات روپے آدھ محصولہ ایک۔ پینک مسی کر فٹنس۔	 قابلہ ٹیٹریٹ ایکٹ وایج نئے ٹیٹریٹ ایکٹ وایج بازار نامی ایسے ہیں جن استراپ سات روپے آدھ محصولہ ایک۔ پینک مسی کر فٹنس۔
---	---	---	---	---	--

نوٹ ایک دو گھنٹہ کے لئے کوئی رعایت نہیں ان سے جلدی قیمت مندرجہ چارج کیا جائے گی۔ اور محصولہ ایک پینک وغیرہ بھی ان کو ادا کرنا ہوگا +

مشتہ کیا۔ امریکن وایج ہوس اسٹاکٹ ویٹ اینڈ وایج کمپنی سے۔ مقام دھڑنی

معلومات

جواہرات کا بادشاہ | ہندوستان کے مشہور جوہری مسٹر گیش لال برج موہن حال میں لندن پہنچے ہیں وہاں ان کو ”شاہ جواہرات“ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ وہ اپنی صدی کے جیب میں ہر وقت ۵ لاکھ پونڈ کے جواہرات لئے بھرتے ہیں ان کے ساتھ ان کی حفاظت کے لئے ہر وقت چار مسلح ہندوستانی جاسوس موجود رہتے ہیں۔

فلیدیلیفیا میں جہاں انھوں نے اپنے جواہرات لوگوں کو دکھلائے، ۸۰۰ آدمی ان کی حفاظت کرتے تھے۔ لیکن بہت قدر سخت حفاظت اور نگرانی کے باوجود ایک چور مٹل میں پہنچ گیا۔ لیکن ناکام رہا۔ مسٹر لال ہندوستان کے ایک مشہور جوہری ہیں اور آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ ہیں انھوں نے ڈپلی کرائیکل کے نمائندہ سے دوران ملاقات میں بیان کیا کہ وہ یہ جواہرات اپنے چند دوستوں کو دکھلانے کے لئے لائے ہیں جب ذیل جواہرات ان کے پاس موجود ہیں۔

مشہور تاج محل ہار کا وہ وسطی زمر جس کا وزن ۹۳ قیراط ہے اور جس کی قیمت ساٹھ ہزار پونڈ ہے ایک نیلم ان کے پاس ۸۸ ۱/۲ قیراط کا ہے جو دنیا بھر میں بے مثل مانا گیا ہے اور جس کی قیمت ۱۲۰۰۰ پونڈ ہے۔ ان کے پاس ۲۰۴ زمرہ کے دانوں کا ایک ہار ہے جس میں ہر ایک دانہ آٹھ قیراط کا ہے اور جس کی قیمت ۸۵۰۰ پونڈ ہے۔ مسٹر لال کہتے ہیں کہ ”سات ماہ تک فلیدیلیفیا کی نمائش میں ہمارے ہندوستانی کیمپ میں لوگ جواہرات دیکھتے رہے اور شگاکو اور دیگر شہروں میں ہم بغیر کسی حادثے کے گئے اور آئے ہیں ۲۵۰۰۰ میل کا سفر طے کر چکا ہوں اور ان جواہرات کو اپنی جیب میں رکھے ہوئے ہوں۔ جب ہم فلیدیلیفیا کی نمائش میں اپنے کیمپ میں تھے تو تیس ۳۰ آدمیوں چھپ کر ہمارے کیمپ کی نگرانی کرتے تھے۔ جب نمائش بند ہوئی تو ۱۸۰ آدمی دھوم دھنگ میری حفاظت کرتے رہے میرے ہندوستانی محافظ ہر وقت کراٹا کا تین کی طرح میرے ساتھ ساتھ بہت ہیں جب میں رات کو سوتا ہوں تو ایک آدمی ہمیشہ مجھے اور جواہرات کو دیکھتا رہتا ہے۔ میرے ملازمین خجندوں سے مسلح ہیں وہ خجندوں کو ریوالورز پر ترجیح دیتے ہیں۔ بعض اوقات جواہرات میں اپنے ملازمین میں سے کسی کے پاس رکھ دیتا ہوں جیسا موقع ہوتا ہے اسی مناسبت کے لحاظ سے میں ان کی حفاظت کرتا ہوں۔“

ضعیف حافظہ کا علاج | انگریز کے ایک ڈاکٹر نے حال میں ایک ایسے عجیب و غریب مریض کا علاج کیا ہے جو اپنی قوت حافظہ کھو چکا تھا کہ اکثر دینک بیچ نے انہوں کے ذریعے اس کا علاج کیا جس سے مریض کو بہت فائدہ ہوا۔ علاج سے قبل مریض کو یہ معلوم نہ تھا کہ وہ کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور یہ بھی نہ جانتا تھا کہ کونسا موتم گزر رہا ہے آخر انہوں نے کئی انجیکشن کرنے کے بعد اس کی حالت میں تبدیلی پیدا ہوئی اور رفتہ رفتہ اپنے فراموش شدہ خاندان کی یاد تازہ ہو گئی اور وہ جاننے لگا کہ وہ کہاں ہے بالآخر کچھ عرصہ بعد اس کی قوت حافظہ بالکل اپنی اصلی حالت پر آ گئی۔

پتنگوں کی قوت شامہ | امریکہ کے ایک ڈاکٹر نے عرصہ کے تحقیق کے بعد ثابت کیا ہے کہ پتنگوں اور کیرڑوں میں مختلف بو یا خوشبو پائی جاتی ہے ایک دوسرے کو اسی خوشبو کے ذریعہ سے پہچان لیتے ہیں۔ ڈاکٹر مریضوں کا بیان ہے کہ سیلوچ کے بعض کیرڑوں میں عطریات یا سمن کی خوشبو پائی جاتی ہے اور بعض میں چاکلٹ کی۔ جنوبی امریکہ کے بعض کیرڑوں میں لنگ کی خوشبو ہوتی ہے اور آسام کا ایک کیرا بالکل مشک کی خوشبو رکھتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ خوشبو کیرڑوں کے لئے ایسی ہی ضروری ہے جیسے روشنی انسان کے لئے۔ چونکہ کیرڑوں کی نگاہ بہت کمزور ہے اور اچھی طرح دیکھ نہیں سکتے اس لئے وہ صرف خوشبو سے تیز کرتے ہیں اور اسی سے اپنی مادہ کو پہچانتے ہیں۔ چنانچہ شہد کی ملکہ قوت شامہ ہی سے خاص شہد کی تیز کرتی ہے اور چیونٹیاں بھی سونگھ ہی کر اپنے خاندان کے افراد کو پہچانتی ہیں۔

ایک عجیب عورت | فرانس میں سب سے زیادہ عجیب و غریب عورت مادام دلی نامی ہے جس کے ڈاڑھی اور مونچھیں دونوں موجود ہیں اس کو دیکھنے کے لئے تماشائیوں کا ایکہجوم رہتا ہے۔ بالخصوص نقاش اور مصور ضرور اس کی تصویر لینے کے لئے آتے ہیں اس کے دیکھنے کے لئے ٹکٹ کی ایک رقم مقرر ہے۔ لیکن سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ فرانس کا ایک مشہور متمول شخص اس ڈاڑھی مونچھ والی عورت کا گرویدہ ہے۔

اس کی ایک لڑکی بھی ہے۔ لیکن ڈاڑھی اور مونچھ کی نعمت سے محروم ہے۔

زمین کی بہشت | فردوس کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ وہاں سوائے حسن و جمال کے قبیح کائنات نام بھی نہ ہوگا، اگر یہ صحیح ہے تو ماننا پڑے گا کہ اس خصوصیت کے لحاظ سے کرۂ ارض کی بہشت سرزمین سویڈن و ناروے ہے جہاں کی آبادی میں ایک شخص بھی کمزور صورت یا سقیم اعضاء کا نہیں ہے۔ اب سے دو سال قبل صرف ایک انسان وہاں ایسا پایا جاتا تھا جو لوگوں کی نگاہوں میں کھٹکنا تھا۔ آخر کار قدرت نے رُخِ زیبا پر خال کاہنا بھی گوارا نہ کیا اور اسے اٹھالیا۔ کہا جاتا ہے کہ جس وقت یہ شخص مرا سارا ملک خوشی سے اچھل پڑا اور بڑے بڑے جشنِ مسرت منائے گئے **خطرات تمدن** | یورپ و امریکہ نے حفظانِ صحت میں جس قدر ترقی کی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ گزشتہ ۵۰ سال کے

اندروہاں انسانی عمر کا اوسط دو چہند اور موت کا اوسط نصف سے کم ہو گیا ہے۔ امراض منقود ہوتے جا رہے ہیں اور صحت و توانائی بڑھتی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں نتیجہ یہی ہونے والا تھا کہ زمین ان کی آبادی کے لئے تنگ ہو جاتی لیکن قدرت نے جو اپنا ٹیکس کسی نہ کسی طرح وصول کر لیتی ہے، وہاں کے انسان کو مکانات کا ولدادہ بنا دیا اور ان سے موٹر ایجا و کرا دی، جس کا رین ہیلو ہر اس شخص کو زیادہ نمایاں طور پر نظر آتا ہے جو اس سے محروم ہوتا ہے لیکن اس کے تاریک پہلو کو اگر دیکھنا ہے تو امریکہ کے اعداد و شمار ملاحظہ فرمائیے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہاں بیماریوں سے اتنے آدمی نہیں مرتے جتنے موٹروں سے ہلاک ہوتے ہیں، چنانچہ سال گزشتہ وہاں صرف ایک صوبہ ایلینوس میں ۱۵۸۷ آدمی مختلف امراض سے ہلاک ہوئے اور ۱۶۴۷ موٹروں کے نذر ہوئے۔

۱۹۳۷ء مارچ ۱۹۳۷ء کو جو مردم شماری پیرس کی ہوئی تھی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہاں کی آبادی۔

پیرس میں قیامتوں کا ضا

۴۶۲۸۶۳۷ ہے اور شہر پیرس میں ۳۳۰۰۰۰ عورتیں، مردوں سے زیادہ پائی جاتی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ اگر عورتوں کی آبادی اس نسبت سے بڑھتی رہتی تو ایک وقت وہ آکے گا جب پیرس میں مرد کی جنس بالکل ناپید ہو جائیگی اور سارا ملک حوا کی بیٹیوں سے بھر جائیگا، پھر کیا ہو گا؟ اس سوال کا جواب مشکل ہے، کیونکہ جس سر زمین کی ایک ایک عورت اب بھی دنیا کو تباہی کا چیلنج دی سکتی ہے، وہاں اگر اتنی کثیر قیامتوں کا اضافہ ادا ہو گیا تو نتیجہ جتنا بھی ہونا کہ ہو کم ہے

چیونٹی کی زندگی

چیونٹی کی عقل مندی، محنت اور پیش بینی مشہور ہے، لیکن یہ انکشاف حال ہی میں ہوا ہے کہ اس کی عمر بھی بہت

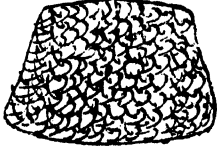
چیونٹی نہایت سخت جان ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر اس کے تمام اعضاء کو علیحدہ کر دیا جائے تو بھی اس کے سر کا حصہ زندہ رہے گا۔

ایک پروفیسر نے چیونٹی کو آٹھ دن تک برابر پانی نے اندر ڈبوئے رکھا لیکن جب باہر نکالا تو زندہ رہی، اسی طرح ایک اور پروفیسر نے چیونٹی کے سارے اعضاء علیحدہ کر دئے اور اس کا سر ہم دن تک زندہ رہا۔ دوسری چیونٹی کو اس نے ۹ مہینے تک بند رکھا اور پھر نکالا تو وہ زندہ رہی۔

ایک ڈاکٹر نے دو چیونٹیاں لیکر سر جدا کئے اور ایک کا سر دوسرے میں پیوست کر دیا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں اسی حال میں زندہ رہیں۔

اصلاح سخن۔ یعنی ملک مختلف اساتذہ کی اصلاحین ایک ہی کلام پر اپنی موضوع کے لحاظ سے اردو میں پہلی کتاب قیمت سے کلیات رعب۔ یعنی حکیم محمد حنیف علی صاحب رعب کے کلام نظم و نثر کا مجموعہ قیمت عا (منہجہ نگار لکھنؤ)

بہترین: علامہ سید علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگائیے



گران مال خرید کر اپنا روپیہ ضائع نہ کیجئے ہر قسم کی بہترین ٹوپیاں

مناسب قیمتوں پر



ممتاز کیپ ہاؤس دہلی نے دنیا کرنے کا خاص انتظام کیا ہے جو براہ راست ولایت سے آتا ہے اسی لئے مقابلہ ہم اپنے خریداروں کو اس قدر سستے دعوں پر فرمائشیں روانہ کرتے ہیں جس سے کہ آپ کو خود اپنے شہر و نیز دیگر مقامات سے بڑی کفایت اور اطمینان حاصل ہوگا۔ لہذا چھوٹی چھوٹی دوکانوں سے گراں مال خرید کر اپنا روپیہ ضائع نہ کیجئے۔ صرف اپنا سائز اور رنگ کی تفصیل لکھ کر ممتاز کیپ ہاؤس دہلی کو روانہ کریں۔

- (۱) ٹرکی طلم بانات عمدہ بہت دبیز اور نہایت طلم لعل
 - (۲) بانات افضل ترین نہایت طلم رواں باریک لعل
 - (۳) ٹرکی طلم بانات نہایت عمدہ طلم اوردوان باریک لعل
 - (۴) ٹرکی طلم شیرگولا نہایت دبیز اور طلم لعل
 - (۵) ٹرکی طلم بانات قدرے موٹی رواں باریک لعل
 - (۶) ٹرکی طلم مختلف قسموں کی موجود ہیں۔ سے رکار عجم عجم
- پچھنڈا ٹوپی ہر قسم - عمر - ۱۲ - ۱۰ - ۸ - ۶ - ۴ - ۲
دکانداروں کے ساتھ خاص رعایت جو بندہ یہ خط و کتابت طے ہو سکتی ہے۔

ٹرکی کپڑا - چمڑہ - استر - بانات دبیز لعل - سے رکار ۱۱ استر لعل
ٹرکی سلواٹ استر تیل سے محفوظ رکھنے والا - بانات عمدہ لعل
ٹرکی چمڑہ استر - بانات عمدہ لعل - سے رکار ۱۱ استر لعل
ٹرکی ایمن چمڑہ استر - بانات عمدہ لعل - سے رکار ۱۱ استر لعل
ٹرکی کپڑا استر - بانات عمدہ لعل - سے رکار ۱۱ استر لعل
صفدر کیپ - بالدار ہرننگ و سائز کی موجود ہیں - لعل - سے رکار ۱۱
امیر کیپ بالدار - سے رکار ۱۱ استر لعل
ان کے علاوہ بہت سی قسم کی ٹوپیاں موجود ہیں

ملنے کا پتہ ممتاز کیپ ہاؤس دہلی

معزز خواتین کے لئے پانچ نادرتخائف

حیرت انگیز ارزانی

بارہ روپے میں مندرجہ ذیل پانچ تحفے آپ کی نذر ہوں گے امید ہے کہ ”مکرم“ کی ناظران ان سے محروم نہ رہیں گی۔
بڑھیا ملل کا دوپٹہ - جن پر کامانی کا بہترین کام بنا ہوا ہوگا جلتے بچاؤں طرف خوشنما ہوں گی اس کے سوا ہر سستے سے صنف نادک کے صحن و لادیز میں ایک جگہ گاہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ دہلی کی صنعت کا بہترین نمونہ ہے۔
عطر خن یا حنا کی ایک شمشلی - جس کا صرف ایک قطرہ لگانے سے آپ کا گھر بھر معطر ہو جائے گا یہ کم از کم تین ماہ تک کام دیگی۔

یہ صاحب ہم نے حال ہی میں بیس سے ملگایا ہے اس کے استعمال سے چہرے کے تمام دروغ اور جھانیاں دور ہو جائیں گی رنگ کندہ کی مانند نہکتے لگیگا اور اس کی مست خوشبو سے آپ کا مدخل سارا دل منکنا رہیگا۔
خوشنما چوڑیوں کا ایک سٹ - جن کے پہننے سے جنس لطیف کی دلفریبی میں مزید اضافہ ہو جائے گا
چھس کے بنوں کا ایک سٹ - جن پر باکل سونے کا شبہ ہوتا ہے

نوٹ :- ہر پہلی سے دہلی اور سادہ کپڑوں کی کاہانی کے کام کی ساڈیاں اور دوپٹے طلب فرمائیے نصف قیمت پیشگی ارسال کیجئے بقیہ قیمت بذریعہ دی۔ بی وصول کیا جائیگی۔ ملنے کا پتہ :-

میجر و لکشن سٹور - دھلی

صاحبان محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے عطر منگانا چاہئے

جس کی اختراع پراکیس سال کے حصہ میں ہندوستان کے مختلف صوبوں کی نمائشوں سے بارہ طلائی و نقرئی تمغے مل چکے ہیں۔ ہندوستان کے ہر طبقہ کے لوگوں میں روز بروز زیادہ مقبول ہو رہا ہے۔

برقعہ نوابیجاد

خواب صورت۔ آرام دہ۔ زمانے کے حسب حال اور مکمل پردہ دار ہے۔ ہمارا ہی یہ خیال نہیں ہے بلکہ ہزار ہا خواتین جو اس کو زیب تن کرتی ہیں اور ہزار ہا مرد جو اس کا معائنہ کر چکے ہیں ہمارے ہم خیال ہیں۔

اس کی وضع عام پرانی وضع کے برقعوں سے بالکل مختلف ہے۔ یہ دو حصوں پر منقسم ہے بالائی حصہ سر سے شروع ہو کر ہاتھوں تک رہتا ہے۔ اس میں ہماری ایجاد کردہ کمافی دار ٹوپی لگی ہوئی ہے۔ زیرین کندھے سے شروع ہو کر پیر کے ٹخنوں تک رہتا ہے اس کی وضع بالکل ڈھیلے ڈھالے کافی گھیر دار کوٹ کی مانند ہے۔ سامنے کے رخ بٹن لگے ہوئے ہیں

وضع

ہر خاتون کو ہر جگہ اس کی ضرورت ہے

کندھے سے قد کی لمبائی۔ اور سر کے دور کی ناپ روانہ کریں اور بشرط واپسی منگو کر خود معائنہ کریں اور پردہ نشین خواتین کو پسند کرنے کا موقع دیں

آج ہی بشرط واپسی منگوائیں

قیمت سفید رنگین نرما رنگین بیڑا چینی ریشم
₹ ۵۲۔ ₹ ۵۴۔ ₹ ۵۵۔ ₹ ۵۶۔ ₹ ۵۷۔ ₹ ۵۸۔

ملنے کا پتہ

خاتون اینڈ بے بی۔ سٹورز نمبر۔ فتحپوری۔ دہلی

ہر قسم کا عطر صابن علی محمد علی تاج عطر لکھنؤ سے خرید لیتا

سربلایتیں اس مملکت کے کاج کر کے ان کو ہر مہینوں میں ملکر چھاننے کے نتائج پر دوپہر روشنی دلائی گئی ہے، دوستیں و دشمنی کا وقتہ فرودداشت نہیں کیا جو اصلاح فکر، بائیسویں قوالی کے ذریعہ سے مجاہدین ان کی مصروحت کی غرض سے وہ ایک دم ہی ان کے حالات کا عالم کھینچا گیا ہے محبت ۱۰۔

قاری محمد سرفراز حسین صاحب سلم شری کی دیگر مشہور و معروف تصانیف

اور وہ خطوط کو جو اصلاح امت کے لئے ان کو ہم وقت معیار کہتا ہے۔

اس رسالہ میں قاری صاحب نے سناہیت یعنی تجاویز پیش کی ہیں جن پر اگر عمل کیا جائے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سنت، سلاسیہ کی کایا پٹ ہو سکتی ہے مگر سوال یہ کہ ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کی کیا صورت ہے، ہمارا جواب ہمارے مختلف امداد ہے قومی تنزل سے بحر انا ہے پر دانی یہ ایسے امراض ہیں کہ پہلے ان کا علاج ہونا چاہئے۔

گو قاری صاحب کی پیش کردہ تجاویز نہایت قیمتی ہیں تاہم بعض تجاویز سے بیس اختلاف ہے۔ قاری صاحب نے یہ تجاویز بہ فیض غور فکر ملک کے سامنے پیش کی ہیں ضرورت ہے کہ جس قدر قاری صاحب کی تجاویز میں پرکونی اختلاف نہیں ہو سکتا ان کو کلی صورت میں لانے کی کوشش کی جائے اور جن پر کسی وجہ سے اختلاف ہو ان پر غور و خوض کر کے کسی فیصلہ پر پہنچا جائے قاری صاحب بعض ایسی تجاویز پیش کی ہیں جن سے کٹر فرم کے مولویوں کو سخت اختلاف ہو گا مگر ہمارے نزدیک حالات حاضرہ کو مد نظر رکھتے ہوئے ختم سے دل سے ہیں ان پر غور کرنا چاہئے قاری صاحب نے یہ دعا نہیں ہے کہ تجاویز انہوں نے لکھا ہے وہ ہے کہ مگر کد ستاد بیچک و تریم کے خوش عمل میں لیا جائے مگر ان کا مقصد یہ ہے کہ زور دینا کہ وہ دیکھو کہ وہ دیکھو کہ ان کے سامنے پر غور و فکر کیا جائے

اجازت کی کی رہ ہدایا کی جائے۔ ہمارے نزدیک یہ رسالہ قابل ہے کہ ہر ایک مسلمان اس کو غور سے پڑھے۔ محبت آٹھ آنے (۸۰) **قلب اسلام مضبوط ہونا چاہئے** اس کی تہ میرٹ یہ ہے و غریب مسلمانوں کو افلاس سے نجات دلائی جات۔

مسلمان مرتد کیوں ہوتے ہیں؟ افلاس کی وجہ ہے! مسلمان جبکہ کیوں مانگتے ہیں؟ افلاس کی وجہ ہے! جیلخانوں میں مسلمانوں کی تعداد کیوں زیادہ ہے؟ افلاس کی وجہ ہے! مسلمانوں کی موجودہ حالت کی ۹۰ فی صدی وجہ صرف افلاس ہے! اگر مسلمانوں کی ترقی مقصود ہو تو صرف افلاس کا علاج چکھے! قاری صاحب نے اس کلمہ کو سمجھ کر ”انیس انوار“ تعریف فرمائی ہے۔ یہ کتاب سلمان غریب کی ہیودہ اصلاح کی تجاویز کا معیہ مجموعہ ہے۔ اس میں مسلمانوں کے نفسی دور کرنے کی عملی تجاویز دی ہیں۔ محبت صرف ۸۰

تعلیم اسلام کے نتائج تعلیم اسلام اور مسلمانوں کی ہیودہ متعلق **فتاویٰ قاری** ”ہیں عجیب و غریب خیالات ظاہر کئے گئے ہیں۔ اور بتایا گیا ہے اسلام بذریعہ اسی سادہ اور عملی نمونہ کے انسان کو کس مرتبہ تک پہنچا دیتا ہے کتاب میں ایک نقشہ دیکر مندرجہ بالا لکھ کر کتابت کیا ہے۔

۱۔ (انگریزی میں)

اسلام قاری صاحب ان تصانیف میں سے ایک ہے جو ہر مہینہ کے ممتاز رسائل میں شائع ہوتے ہیں ان تصانیف میں کی قبولیت کو دیکھ کر انہیں انسانی سورت میں شائع کیا گیا ہے اور اسے سرتواریت میں لکھ کر ایک (دو پیر غرضت جلد)

(اردو میں) مذہبی - اخلاقی اور اصلاحی کتب **اسلام پرانا ہو گیا** یہ صدارت بنہنگام دیوبند میں شائع ہوئی ہے مگر یہ تعلیم مسلمانوں پر تعلیم اس مصیبت آمیز اور شرک جگے ہیں اس نے قاری صاحب کو ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ جدید احیاء اور بعض کی بددینی جو ”وفا علی اسلام“ پر ایک کتاب لکھیں چاہئے آئے اس کتاب میں نہایت قیمتی و قیمتی جدید علوم غلیہ اور جدید مسائل کی روشنی میں ہے کہ اسلام ہی ساری دنیا اور ہر وقت کے واسطے ضرور اہم و افادہ سے نجات دلاؤ اور اصلاح دیوبند کی تعلیم غرضت کے مطابق یہ وہ بہترین جو حضرات کتابوں کی شائع شدہ اور اسی ترین تمدن کا سرچشمہ ہے۔ غالباً کتب خانہ اس کتاب کے فرانسیسی کرتے وقت اس رسالہ کا نام

پندرہویں کیلین ہے ان کیلین میں ہے کتب انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کیلین ہے اور اس میں اس کے علم باطل کو کو توڑا گیا ہے اگر تعلیم یافتہ حضرات اس کتاب کو پڑھیں تو ان کا اعتقاد درست ہو جائیگا۔ یہ اردو زبان میں اپنے رنگ کی پہلی کتاب ہے۔ محبت آٹھ آنے (۸۰)

ہندوؤں میں جذب نہ ہو لیکن ہندی بنو یہ قاری صاحب کی اہم تصانیف ”انوار ملت“ کا مقصد۔ قاری صاحب کی یہ وہ کتاب ہے جس کے خیالات پر پختہ لغت کا ایک طوفان برپا ہوا ہے قاری صاحب اس کتاب میں علماء امت اسلامیہ کیلین، اجماعیہ، اجماعیہ اور اصلاحی تجاویز پیش کی ہیں جسے مسلمان ہندوستان کے شہر نشینی رسالہ و دین کی رو پر کھانا صرف نہیں ہے۔

قاری سرفراز حسین صاحب جو عرصہ پہلے ملک سلم شری سیاح جاپان ممالکستان کے نام سے علمی برادری دنیا و مشرق میں تھے آپ کے دل میں اصلاح وقت اسلام کی ایک ایسی ہیوجہ ہے جو کہ مسلمانوں میں بھی یہ دعوت ہے جو جس نے ان سے اس اہم موضوع پر چند فتاویٰ شائع کرائی ہیں، ایسا راستہ اس وقت ہمارے پیش نظر ہے اس سلسلہ کی ایک ایسی گروہی ہے جس میں اہم اور غور و فکر کے بعد جیسا کہ تجاویز منقول اجارہ اصلاح وقت پیش کی گئی ہیں جو اپنے رنگ میں بالکل نئی اور شدہ قاری صاحب کے علاوہ کسی دوسرے کو ان کی اشاعت کی جرات نہ پڑتی بالخصوص موجودہ عہد میں جبکہ ہندو مسلم مناقشات مملکت و ملک ترقی پذیر ہے پھر مگر ہر مہینہ کے قاری صاحب نے کھائی

جاسے کہ ان تجاویز کی پیش کرنے والی وجہ یہ ہے کہ قاری صاحب کا وہ

گا

مفتی
یا ز فقیہی

قواعد رسالہ نگار

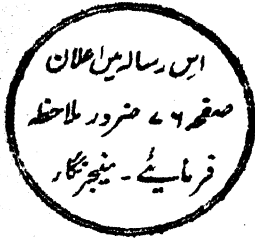
- ۱۔ رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شائع ہوتا ہے
- ۲۔ رسالہ نہ پونچنے کی صورت میں بیس تاریخ سے پہلے دفتر کو اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت روانہ کیا جائیگا
- ۳۔ خط و کتابت کے وقت اپنا پتہ فرمادی ضرور لکھئے جس پر پتہ فرمادی سنیں ہوتا ایسے خطوط صلح کر دیے جاتے ہیں
- ۴۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ایس کا ٹکٹ آنا ضروری ہے
- ۵۔ مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہئیں۔
- ۶۔ سالانہ قیمت پانچ روپیہ، ششماہی تین روپیہ۔ بیرون ہند مسات روپیہ سالانہ۔

نگار

تقدیر	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ	نرخہ ماہ اجرت اشتہارات	تقدیر	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
۱۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۲۰ روپیہ	۲۰ روپیہ	(۱) اجرت ہر ماہ میں پیشی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان	۱۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۲۰ روپیہ	۲۰ روپیہ
۲۵ روپیہ	۲۵ روپیہ	۲۵ روپیہ	۲۵ روپیہ	تین ماہ سے زائد اشتہار دین گے ان کو ہمیں فیصد کمیشن دیا جائیگا	۲۵ روپیہ	۲۵ روپیہ	۲۵ روپیہ	۲۵ روپیہ
۲۵ روپیہ	۲۵ روپیہ	۲۵ روپیہ	۲۵ روپیہ	(۳) سیادہ اشتہار کے اندر دو مہینے قبل اطلاع دینے پر ہمیں پوسٹل کار	۲۵ روپیہ	۲۵ روپیہ	۲۵ روپیہ	۲۵ روپیہ

جو تھائی قیمت پیشگی آئی لازم ہے نگار ایک سنہ کی لکھنؤ جو کاپیے ٹکٹ آنا ضروری ہے

مرزا غالب	نہایت نقش	مولانا شبلی	سفر نامہ ہر و شام	مواذدہ آئیں دیر سے	محمد خاتم النبیین
اردو سے پہلی	مرآۃ العروس	سیرۃ ابنی جلد اول	علم الکلام	مضامین عالمگیر	ضیائے سخن
عود ہندی	توبۃ النصوح	دوم	الکلام	آغا خان اسلام	مکاتیب امیر مینائی
دیوان میری	موجز حسنہ	سوم	رسائل شبلی	کلیات فارسی	رتن ناتھ سرشار
کمل دیوان	روایۃ صادقہ	شعر الہم جلد اول	مقالات شبلی	کلام شبلی اردو	فائدہ آزاد
مولانا نذیر احمد	ایامی	دوم	شعر الہم جلد اول	امیر مینائی	سیر کسار
حائل مترجم	فسانہ مبتلا	سیرۃ النعمان	دوم	امیر اللغات	خدائی فواد
احقوق والفرانض سے	ابن الوقت	الفرانی	سوم	معتادہ عشق	جام سرشار
	مصائب غدر	الماعون	چہارم	مرآۃ الغیب	اللیلی بطر زادل



نگار



کنو سے ہر ماہ کے پہلے ہفتے میں شائع ہوتا ہے چند سالانہ ہندوستان میں مشہور ہندوستان سے باہر مشہور

فہرست مضامین نومبر ۱۹۲۷ء

- | | | | |
|----------|---|----|--|
| ۷۳ | شادی کب کرنا چاہئے (اجتماعی)، جناب محمود علی خاں | ۲ | ملاحظات |
| ۷۷ | ہندوستان کی معاشیات (تقصادی)، سید ابوالمنصور حمید | ۵ | میر شمس علی افسوس (تاریخی)، جناب سید محمد قادری بی بی لے |
| ۸۲ | اعتزاق (نظم)، جناب روشن صدیقی | ۱۷ | حقیقت (نسانہ)، حضرت جنوں گورکھپوری |
| ۸۴ | غزلیات :- راز رامپوری - حافظ غازی پوری | ۳۷ | میر شکوہ آبادی (تقیدی)، جناب پوشش بلگرامی |
| ۸۵ | آزاد انصاری - جگر بریلوی | ۵۲ | داد کا مزار (نسانہ)، جناب تمکین کاظمی |
| ۸۶ | فرخ بلدی - غرور جنگوی | ۵۶ | لامڈرین کا عہد حکومت (سیاسی)، ض۔ ب۔ بی۔ لے |
| ۸۷ | ~~.....~~ | ۶۳ | علم فراست الید (علمی) |
| ۹۲ تا ۹۲ | ~~.....~~ | ۶۶ | کی ڈائری کا ایک متن (ادبی) |
| | | ۷۱ | ارتقا و حقیقت (تفہیم)، رگھوپ سائے قزاق بی بی لے |

نگار

ادیتور۔ نیاز فختوری

شمار (۵)

نومبر ۱۹۲۷ء

جلد (۱۲)

ملاحظات

عاصر خیابان نے اگست (اکتوبر ۱۹۲۷ء) کی اشاعت میں نقطہ نظر کے استعمال کے متعلق ایک دلچسپ تحقیقی نوٹ لکھا ہے خیابان کے فاضل مدیر کو نقطہ نظر کی صحت میں شک تھا اس لئے انھوں نے جناب طباطبائی کو حکم بنا کر اس کا فیصلہ چاہا اور صاحب موصوف نے پورے یقین کے ساتھ یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ

”نظر، انگریزی کے محاورہ میں نقطہ ہو تو ہوا، اردو کے محاورہ میں تار نظر اور منظر کی ترکیب اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ ہماری زبان میں نظر نقطہ نہیں ہے، خط ہے۔ یہ خیال زبان میں فلاسفہ قدما کے ایک مذہب کی رو سے پیدا ہوا کہ وہ لوگ اس کے قائل تھے کہ رویت کی حقیقت یہ ہے کہ آنکھ سے تار نظر نکل کر مریات پر پڑتا ہے، گو بعد میں یہ مذہب غلط ثابت ہوا مگر زبان پر جو اثر پڑ چکا تھا وہ زائل نہیں ہو سکتا..... غرض نقطہ نظر کہنے کی کوئی صورت ہمارے محاورہ میں نہیں ہے۔ ہاں نظر کی صفت نکتہ دان، نکتہ میں، نکتہ سنج آتی ہے اس اعتبار سے نکتہ نظر کہنا درست ہے“

مجھے اس باب میں جناب طباطبائی سے سخت اختلاف ہے۔ نقطہ نظر انگریزی کے پوائنٹ آف ویو (Point of View)

بہترین عطر صغریٰ علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے مل سکتا ہے ایک مرتبہ بھان کیجئے

کا ترجمہ ہے اور اس کا مفہوم وہی ہے جو ہدف نظر یا نہ تھا کے نگاہ کا ہو سکتا ہے۔ اس میں حقیقت رویت سے بحث کرنے کی ضرورت ہی نہیں اور نہ اس کا اثر اُس پر پڑ سکتا ہے۔

ہم جب کسی طرف دیکھتے ہیں تو ہماری نگاہ کسی مخصوص دستین چیز پر پڑتی ہے۔ اسی طرح جب ہم غور و فکر یا کوئی تئنا کرتے ہیں تو کوئی مخصوص امر سامنے ہوتا ہے جن کے سمجھنے یا حاصل کرنے کی خواہش ہوتی ہے اور اسی مخصوص دستین چیز یا امر کو نقطہ نظر خیال یا ہدف نظر خیال کہتے ہیں۔

جناب طباطبائی نے شاید اسپر غور نہیں کیا کہ نقطہ نظر میں نظر سے مراد نگاہ نہیں بلکہ خیال یا تئنا ہے اور اس صورت میں نظر کے نقطہ یا خط ہونے سے بحث کرنا یا خواہ مخواہ مناظر و مرائے کے اُن مسائل کو اس کی تحقیق میں داخل کرنا جن کی حقیقت کی طرف سے شاید جناب طباطبائی خود بھی مطمئن نہ ہوئے ہوں گے بالکل دور از کار بات ہے۔ اسی کے ساتھ نکتہ نظر کے استہان کو درست ظاہر کرتے ہوئے جو استدلال پیش کیا گیا ہے: وہ بھی محل نظر ہے۔ انا شاد ہوتا ہے کہ نظر کی صفت چونکہ نکتہ داں یا نکتہ سچ ہوتی ہے اس لئے نکتہ نظر کرنا چاہئے نکتہ جس زبان کا لفظ ہے اس میں اس کا مفہوم یہ ہے:-

(۱) النقطة السوداء في الابيض او النقطه في الاسود (۲) الاشتر لکھا اصل من نکتہ الارض (۳) المسئلة الدقیقة اخر حجت يدققة نظروا معات فکر۔ ظاہر ہے کہ جناب طباطبائی نے تیسرے مفہوم کو پیش نظر رکھ کر فیصلہ کیا ہے کیونکہ نکتہ سنجی وغیرہ اسی مفہوم سے پیدا ہے۔ لیکن ناضل حکم کی نگاہ اس طرف تئیں گئی کہ لفظ نکتہ اسم ہے اور جب تک کوئی لفظ مصدری معنے کا نظر کے ساتھ مضاف نہ ہو۔ نکتہ سنجی وغیرہ کا مفہوم پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر بجائے نکتہ نظر کے نکتہ سنجی نظر، وقت نظر کہیں تو بیشک درست ہو سکتا ہے۔

اب لفظ نقطہ کے مختلف محل استعمال پر غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ عربی میں اس کو انگریزی کے لفظ (Point) کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ (Point of difference) کا ترجمہ نقطہ الاختلاف اور (Point of Weak Knees) کا نقطہ الضعف زبان عربی میں رائج و متعارف ہے۔ حالانکہ جناب طباطبائی کی تحقیق کے مطابق اس کو بھی غلط ہونا چاہئے کیونکہ ضعف یا اختلاف میں حقیقتاً نہ کہیں نقطہ کا وجود پایا جاتا ہے نہ خط کا

میں نے خصوصیت کے ساتھ اس کا ذکر اس لئے کیا کہ مبادی انکار کے حلقہ میں غلطی یا غلط فہمی سے نکتہ نظر کا رواج ہو جائے

چونکہ جنوری ۱۹۲۵ء کے رسالہ میں نومین کے متعلق ایک سے زائد تنقیدی مقالات شائع ہوں گے اور اسی کے ساتھ دیگر مضامین بھی ہوں گے اس لئے اُس کی ضخامت کا بڑھ جانا یقیناً ہے اور یہ حجم غالباً ۵۰۰ سے کسی طرح کم نہ ہوگا۔

لیکن باوجود اس کے خریداران ان نگار سے خواہ وہ قدیم ہوں یا جدید کوئی زائد قیمت نہ لی جائیگی، البتہ وہ حضرات جو نگار

کے خریدار نہیں ہیں اور صرف یہی رسالہ چاہیں گے اُن کو علاوہ محصول ایک روپیہ دینا ہوگا۔

منیجر نکالنے یہ بھی اعلان کیا ہے کہ ستمبر ۱۹۲۷ء کے خریداروں کو جذبات بھاشا بھی بالکل مفت دیکھائے گی۔ وہ حضرات جن کا چندہ نومبر یا دسمبر میں ختم ہو رہا ہے اُن کو صفحہ ۷۶ کا اعلان دیکھ کر اس رعایت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنی چاہئے۔

اس مہینے کے رسالہ میں میر شیر علی افوس پر جناب سید محمد قادری بی لے نے اچھا مضمون لکھا ہے اس نوع کے مضامین اردو ادب کی بہترین خدمت شمار کئے جاتے ہیں۔ منیر شکوہ آبادی کی ایک مثنوی پر حضرت ہوش نے اپنے مخصوص انداز میں کافی در بیان دی ہے انھیں منیر کے دیگر اصناف سخن پر بھی توجہ کرنی چاہئے۔

”ہفتیا“ جناب مجنوں کا ایک ایسا افسانہ ہے جس پر اُن کو فخر کرتا چاہئے یہ فسانہ مضرب جذبات انداز بیان بلکہ تجزیہ سیرت، فلسفہ اثر و تاثر اور نظریہ فعل و انفعال کے لحاظ سے بھی ایک ایسی چیز ہے جو اردو فسانہ نگاری کی طرف سے بہترین نمونہ کی صورت میں پیش کی جاسکتی ہے۔ بلاٹ کے متعلق البتہ مجھے ایک جگہ کلام ہے، جو قحطی کی پیشین گوئی کے ”سر لا اپنے شوہر کو بھی قتل کرے گی“ جس انداز سے فسانہ میں پوری کر کے دکھائی گئی ہے وہ میرے نزدیک قابل اصلاح ہے۔ قتل کا وقوع اس طرح بھی ہو سکتا تھا کہ سر لا اس کا قصد و اہتمام نہ کرتی، یا پھر اس سے پہلے اس کی دماغی حالت میں مخصوص اضطراب و ہجیان دکھانا چاہئے تھا جو ہندوستان کی ایک دہقانہ عورت کی طرف سے اس حرکت کو ممکن التوقع بنا دیتا۔

شادی کا مضمون اجتماعی نقطہ نظر سے اور ہندوستان کی معاشیات، اقتصاد و زیادہ نگاہ سے قابل قدر مضامین ہیں۔ ارتقا حقیقت، ہارڈی کی ایک نظم کا نہایت کامیاب ترجمہ ہے گو لفظی نہیں ہے۔ تعین بحر اور تقسیم اوزان میں جناب فراق نے نہایت دلچسپ جدت سے کام لیا ہے۔

اعتراف کے عنوان سے جو نظم شائع ہوئی ہے وہ اسی قسم کی ہے جس میں شاعر نے اختیار نہ کیا لیکن کہیں کہیں نامناسب طور پر شعر کی حقیقت سے زیادہ اپنے آپ کو ظاہر کر جاتا ہے۔ جناب روش بہت زمین کہنے والے ہیں۔

غزلیں بڑی خوب ہیں لیکن جناب راز رام پوری کی غزل کا پانچواں، چھٹا اور آٹھواں شعر، جناب حافظ غازی پوری کا چوتھا، چھٹا شعر۔ جگر بریلوی کا پہلا، چوتھا، چھٹا اور آخری شعر، جناب فرخ بنارسی کا آٹھواں، بارہواں شعر اور محمد شکیوی کا چھٹا شعر خد و صیت کے ساتھ مجھے پسند آیا۔

نیاز فچٹوری

نورث ولیم کالج کے قیام کا مقصد کچھ زیادہ شاندار نہ تھا۔ اس کے بانی صرف یہ چاہتے تھے کہ جو انگریز ہندوستان میں مختلف عہدوں پر مقرر کر کے روانہ کئے جاتے ہیں ان کا ملکی زبان سے واقف ہونا ضروری ہے تاکہ مگرانی اچھی طرح ہو سکے اور ایسا نہ ہو کہ زبان یا دین ترکی دین ترکی ہی دائم انگریزی زبان کو جو حاکم قوم کی زبان تھی ہندوستان میں پھیلائے اور باشندگان ہند کو اس میں ماہر بنا کر اپنی اغراض ملازمت پوری کرانے کا کام اس زمانہ میں بدرجہا دشوار تھا۔ اس لئے یہی مناسب سمجھا گیا کہ کتنی بھر دو ایسی حاکم ملک کی خام زبان سے آشنا ہو جائیں تو کسی نہ کسی طرح کار براری ہو جائیگی۔ اس خیال سے ہندوستان کی زبانوں پر نظر ڈالی گئی تو کوئی زبان اردو کی کھج ملک کے طول عرض میں دیکر دوسرا نہ دکھائی دی گراں اس کے لڑکچہ کو کچھ تو بجز نظم کے اور کچھ نہ پایا اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے یہ طے کیا کہ ہندوستان کے علماء کو ایک جگہ جمع کر کے ان سے تہذیب و تالیف کا کام لیا جائے۔ نیز درس و تدریس انہیں کے ذریعہ کرائی جائے اس طرح اردو کو اختیار کی سرپرستی حاصل ہو گئی، درود اس کی اساکى تحریک کے بانی قرار پائے۔

اہل قلم اور مؤلفین کا انتظام کرنے کے بعد ایک اور سوال یہ درپیش ہوا کہ مستقل کتابیں لکھوائی جائیں فارسی و ہندی کی عام فہم اور مقبول کتابوں کا ترجمہ کرایا جائے؟ آسان کام اور سہل طریقہ ترجمہ کا تھا۔ چنانچہ فارسی و ہندی کی جدیدہ جدیدہ کتب کو اردو کے قالب میں ڈھال لایا اور جن مضامین پر جیسے قواعد زبان، لغت، اور نظم میں مستقل تصانیف یا تصنیف کی ضرورت تھی ابتدائی رسالے لکھوائے گئے اور قدیم اساتذہ کے وادین کا انتخاب و تصحیح عمل میں آئی۔ اس طرح نورث ولیم کالج کی طرف سے کئی ایک دیوان بھی تصحیح کے ساتھ شائع ہوئے ہیں۔

نورث ولیم کالج کے مشہور مصنفین میں میر شیر علی افسوس اپنے ترجمہ گلستان کی وجہ سے خاص طور پر ممتاز و معروف ہیں۔ افسوس سید علی مظفر خان کے بیٹے اور سید غلام مصطفیٰ خان کے پوتے تھے ان کے اجداد اوقات کے رہنے والے اور حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے اولاد سے تھے اور ان کے ایک جداد علی سید بدیع الدین اور ان کے بھائی سید عالم الدین حاجی خان ابتداً ہندوستان میں وارد ہوئے اور آگرہ کے قریب قصبہ نارنول میں توطن اختیار کیا۔ محمد شاہ بادشاہ کے عہد حکومت (۱۷۳۷ء تا ۱۷۶۰ء) میں افسوس کے وادانچہ دونوں بیٹوں سید علی مظفر خان اور سید غلام علی خان کو لیکر دہلی آئے اور مینوں نے نواب عہد الملک امیر خان کی ملازمت اختیار کر لی اس زمانہ میں شیر علی افسوس دہلی میں پیدا ہوئے ان کا سنہ ولادت معلوم نہیں مگر ان کی پیدائش ۱۷۳۷ء سے دو چار سال قبل کی ہوگی۔ کیونکہ جیسا کہ خود افسوس نے لکھا ہے نواب عہد الملک کی وفات کے تین چار سال بعد ان کے والد کے تلاش معاش کو نکلنے کے وقت ان کی عمر گیارہ برس کی تھی عہد الملک ۱۷۶۰ء میں انتقال کیا اور اس لحاظ سے افسوس کی ولادت ۱۷۳۷ء سے قبل کی ہونی چاہئے۔

۱۔ افسوس کے قدیم نسخہ خطوط ۱۷۳۷ء میں لکھے گئے ہیں۔ ان کا تعلق قلمی سواد میں ہی ملا ہے۔

۲۔ نواب میرزا عہد الملک افسوس کے بچپن میں فوت ہوئے اور محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں ان کی پیدائش ہوئی۔ بادشاہ کے مزاج پر اس قدر تسلط تھا کہ دوسرے ہر انسان کی عزت پریشان و جبر کمر بستہ تھے۔ اگر ملازم صاحب کی جلی کئی باتوں نے بادشاہ کا مزاج کھینچ کر دیا اور بھاری دینے لگی تو کوئی ہاتھ باؤشاہ کے دیانت میں نہیں ہوتا اور وہ خود کوئی بھی اچھی استعداد رکھتے تھے اور پہلی اور کئی کے کہیں میں تو استاد تھے۔ (مذکورہ کلمہ میں صحت ہے)۔

انوس کے والد اور چچا دونوں ایک عرصہ تک عہدۃ الملک کے ساتھ رہے۔ خصوصاً سید غلام علی خاں اپنی کارکردگی و معاملہ فہمی کی بدولت بہت جلد صاحب اقتدار ہو گئے اور جب سلسلہ میں عہدۃ الملک کے وفات پائی تو وہی منصوبہ طور پر آلہ آباد کے صوبہ دار بن گئے اور محمد شاہ کی سلطنت پر ہم ہوتی اور عہدۃ الملک کے بھی وفات پائی اور چند روز بعد ہی غلام علی خاں بھی وہی ملک عدم ہوئے نہ اگلا ساڑھا رہا اور نہ پہلے سے مرہی۔ علی مظفر خاں ترک ملازمت کر کے چند سال خانہ نشین رہے اس کے بعد تلاش معاش کے لئے میر قاسم علی خاں نواب بنگالہ کے بایہ تخت چٹہ کار رخ کیا اور یہاں پہنچ کر اس کے ہاں ملازمت کرنی اور توپ خانہ کے داروغہ مقرر ہوئے۔ میر قاسم علی خاں کے انتقال کے بعد اس کے جانشین جعفر علی خاں کی ماتحتی میں اس عہد کے علاوہ اور بھی کسی عہدہ پر فائز ہوئے اور سلسلہ عیس اس کے معزول ہونے تک یہی توسل ہے۔ جس وقت انوس کے والد نے چٹہ کار رخ کیا، انوس کی عمر گیارہ برس کی تھی اور گلستان پڑھتے تھے۔ وہ خود لکھتے ہیں۔ "سیر دیوان دہلی کی اکثر کرتا۔ طبیعت موزون ان ایام میں بھی تھی چنانچہ کئی شعرا وفات نہ کورہ میں یوضع قدامتے تھے۔ یہ مطلع انہی میں سے ہے۔ بیت

ارے پیارے ترے اس حسن رنگین کا خدا حافظ

ترہی اس زلف پر چین کا محمد مصطفیٰ حافظ

جعفر علی خاں کو معزولی کے بعد چٹہ سے نکل کر علی مظفر خاں نے نواب خان عالم بقا اور افشار خاں کی رسالت سے نواب شجاع الدولہ والی اودھ (۱۷۵۷ء تا ۱۷۷۷ء) کی سرکار میں تین سو روپیہ کا ملازم کر دیا لیکن تین چار سال لکھنؤ میں رہنے کے بعد جبلا زمست کچھ باپدار نظر نہ آئی تو کن کار رخ کیا اور حیدر آباد بجا پہنچے۔ کئی سال حیدر آباد میں رہ کر وہیں انتقال کیا۔

انوس اپنے والد کے لکھنؤ آنے سے دو سال قبل ہی لکھنؤ میں نواب شجاع الدولہ کے بھتیجے نواب سالار جنگ کے ہاں ملازم ہو چکے تھے۔ اور ان کے بیٹے میر نور بخش علی خاں المصائب بر سر فراز جنگ کی اتالیقی کی خدمت ان کے سپرد کی گئی تھی، انوس نے اپنا دیوان سالار کی سرپرستی میں ترتیب دیا تھا۔ سالار جنگ کی وفات کے بعد سر فراز جنگ نے اپنے حوصلہ کے موافق انکی قدردانی کی ان دنوں مرزا جواں نعت بہادر شاہ ولیم سلطنت مغلیہ لکھنؤ میں رونق افروز تھے۔ انھوں نے جب انوس کا کلام سنا تو ازراہ قدردانی طلب کر کے اپنی مصاحبوں میں شامل کر لیا۔ انوس نے اس بے فکر کے زمانہ میں عربی کی تحصیل کی اور کتب متداولہ پر کافی عبور حاصل کر لیا۔

لکھنؤ اس زمانہ میں شعرا، علما و فضلا کا مرجع و مرکز بنا ہوا تھا۔ میر تقی میر مرزا رفیع سودا، اجرات، انشا و غیرہ شعرا کی صحبتوں نے انوس کو بہت جلد متاثر و جذبہ پرہیز کیا۔ وہ اکثر ان اساتذہ کے مشاعروں میں غزلیں پڑھتے اور تحسین و آفرین کا حوصلہ حاصل کرتے تھے۔

۱۔ بارہ اردو مطبوعہ کلکتہ ۱۲۵۷ھ دیا ہے ص ۹

۲۔ مرزا جواں نعت بہادر شاہ، تخلص جہاندار، شاہ عالم کے دل حید تھے۔ ۱۷۵۷ھ میں لکھنؤ آئے آصف الدولہ نے بڑے اعزاز و کرامت رکھا اور بہت خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ شعرا کے بڑے قدردان گزرے ہیں اور خود بھی شعر گوئی کا چکارا لکھتے تھے۔ سالار بنگالہ میں انتقال کیا۔ تذکرہ گلشن ہند ص ۷۔

جعفر علی محمد علی تابہر عطر لکھنؤ کا بہت بڑا کارخانہ ہے

مرزا جہاں بخت کو بھی افسوس کا کلام بہت پسند کیا اور انہوں نے ان کو اپنی بزم کا شاعر بنالیا۔ افسوس کا یہ زمانہ نہایت فراغت اور لطف کیساتھ گزرا۔ جب شہزادہ جہاں بخت نے دہلی کا ارادہ کیا تو افسوس کو بھی ساتھ لے جانا چاہا مگر افسوس نے کھنوکھی پر لطف صحتن چھوڑ کر اجڑی ہوئی دلی میں جا کر رہنا پسند کیا اور معذرت کو کہہ بیٹھ رہے۔

شہزادہ جہاں بخت کے بعد نواب آصف الدولہ (۱۸۵۷ء تا ۱۸۵۸ء) کے نائب حسن رضا خان اٹھلے بہ سر فرازا الدولہ نے افسوس کی سرپرستی کی اور اپنی داد و دہش سے نگر معاش سے مستغنی کر دیا۔ یہ سر فرازا الدولہ وہی ہیں جن کی مرزا رفیع سودا نے مع سرائی کی ہے۔ کلیات سودا میں دو قصیدے ان کی مع میں موجود ہیں جن کے مطلعے حسب ذیل ہیں :-

صلح عید ہے اور یہ سخن ہر شہرہ عالم حلال و خسر زبے کھاج دروزہ حرام
عین عقل کو سودا کی تھی جدائی شاق سوا س کئے وہ پھر آباہو بیکہ تھاشاق

حسن رضا خان نے افسوس کو کوئی خاص خدمت سپرد نہیں کی تھی بلکہ ایک قابل فرو کی تربیت کے خیال سے انہی سرپرستی کرتے تھے۔ افسوس نے شہزادہ جہاں بخت کے دہلی چلے جانے اور لکھنؤ کے اساتذہ کے اٹھ جانے سے شاعری کا مشغلہ قریب قریب ترک کر دیا تھا اور ان دنوں ان کا کام درس و تدریس تھا۔

انہی ایام میں انگریزی حکام کو نورٹ ایم کالج کے لئے لائق فنیوں کی ضرورت داعی ہوئی اور وہ ان کی تلاش و انتخاب کرنے لگے اس سلسلے میں میر تقی میر سے ملازمت کی خواہش کی گئی مگر خود داڑ سر تاج شعرا نے اردوٹے انکار کر دیا۔ اس موقع پر حسن رضا خان نے اکتوبر ۱۸۵۷ء میں افسوس کا کرنل اسکاٹ سے تعارف کرایا اور انکی فضیلت علمی اور بلند پایہ کلام کی بے حد تعریف کی۔ کرنل اسکاٹ نے کلام سنا تو بے حد متحسنا ہوئے اور فی الفور انکا انتخاب کر کے گلستہ بیچ دیا۔

افسوس نے جیسا کہ خود ان کے بیان سے ظاہر ہے، قدیم ذکر کی شاعری سے تنگ آکر فکر سخن ترک کر دی تھی اور درس و تدریس کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ نیز لکھنؤ کے معاشرتی و اقتصادی حالات نے لکھنؤ سے ان کی وابستگی اٹھادی۔ اس لئے صاحبان عالی شان کی نوکری کو غنیمت سمجھا اور سید سے گلے کی راہ لی گلے میں ڈاکٹر گل کرائٹ نے جو خود کئی کتابوں کے مصنف اور مشہور اہل قلم تھے ان کی قابلیت کا اعتراف کر کے دو سو روپیہ ماہوار منشاہرہ پر تصنیف و تالیف کے لئے مقرر کیا۔ افسوس نے گلستہ میں کوئی آٹھ نو سال تصنیف و تالیف کا کام کر کے ۱۸۵۹ء میں وفات پائی۔ بیل نے اپنی کتاب میں افسوس کا سنہ وفات ۱۸۵۶ء بتایا ہے مگر گارساں دی تاسی اور تقریباً تمام تذکرہ نویسوں نے ۱۸۵۹ء لکھا ہے اور یہی زیادہ قرین قیاس ہے۔

مرزا علی لطف صاحب تذکرہ گلشن ہند افسوس کے نہ صرف محام بلکہ قدیمی دوست تھے انہوں نے اپنے تذکرہ میں افسوس کا سرسری سا

کلیات سودا مطبعہ نو لکھنؤ پریس ۱۳۱۷ء و ۱۳۲۷ء
سیر کرانیکل ڈکشنری از سر پرنسپل ۱۳۵۷ء طبع دوم

ہر قسم کا خطر صفر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگائے

حال کھلے ان کا بیان بلحاظ معصری تشدید یاد قابل سند ہے مگر تاریخ و لاوت ان کے ہاں بھی نہیں ہے اور چونکہ یہ تذکرہ سلسلہء کا کھلے ہوا ہے اور اسوقت انوسوس بقید حیات تھے اس لئے تاریخ وفات بھی اس میں نہیں مل سکتی انوسوس نے کلمتوں سے نکل کر پہلے مرشد آباد میں مرزا علی لطف کو ہاں چند روز قیام کیا اور ان سے بھی کلمتے آنے کا وعدہ کیا۔ اغلب ہے کہ مرزا علی لطف انہی کے ایسا سے کلمتے آئے اور ڈاکٹر گل کو اسٹ کی نگرانی میں اپنا تذکرہ مرتب کیا۔ لطف نے انوسوس کے حالات بیان کرنے کے بعد یہ رویارک کیا ہے جو ایک معاصر کے قلم کا ہونے کی وجہ سے نہایت معتبر و مستند ہے نئی الحقیقت کہ ذات ان کی زمانہ کے انتخاب سے ہے عجیب جوان خلیق اور اہل دل ہیں۔ فردوسی اور انکس میں فرد کمال ہیں منطق و دماغی کے بیان میں صاحب استدلال ہیں کلیات اور عجائبات فن طبابت کے بھی بخوبی ماہر ہیں۔ شعر عاشقانہ بہت مرے سے کہتے ہیں اقسام نظم میں (گلشن ہند ص ۶)

قیام کلکتہ کے زمانہ میں انوسوس نے دو کتابیں مرتب کی ہیں ایک ”باغ اردو“ اور دوسری آرائش محفل“ اس کے علاوہ تصنیح و نظریاتی کا بہت سا کام کیا جس کی تفصیل آگے آئیگی اب ہم بلحاظ تاریخ انکی مولفاتی کا ترتیب وار ذکر کرتے ہیں۔

دیوان انوسوس نے اپنا دیوان کلمتوں میں سالار جنگ کی سرپرستی میں ترتیب دیا تھا اس لحاظ سے وہ ان کا پہلا کارنامہ ہے۔ نساخ نے نکھایا کہ شاعری میں انوسوس کو میر حید علی جیران اور میر سوز سے ملز حاصل تھا۔ صاحب تذکرہ گلشن ہند جو انوسوس کے معاصر اور دوست تھے ان کے تلمذ کے متعلق کہتے ہیں ”اصلاح کا اتفاق ان کو میر حید علی جیران تخلص سے ہوا ہے اور علی ابراہیم خاں مرحوم نے شاکر دین کو میر حسن حسن تخلص کا لکھا ہے۔ اس کی صدا اپنے تئیں نہیں پہنچی اور یہ خبر اپنے گوش زد نہیں ہوئی“ انوسوس کا دیوان جملہ اصناف سخن پر مشتمل ہے اور عام دوا دین کی طرح حرفی تعجبی پر ترتیب دیا گیا ہے۔ سب سے پہلے قصاید کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے اکثر تصبیحے آنحضرت معلّم کی تعریف میں ہیں باقی نواب آصف الدولہ (۱۱۸۷ تا ۱۱۹۷) اور مارکوئیس دلیزی گورنر جنرل ہندوستان (۱۱۹۷ تا ۱۲۰۷) کی مدح میں ہیں۔ اس کے بعد چند سلام اور مرثیے دے ہوئے ہیں۔ دیوان کا دوسرا حصہ غزلیات کا ہے جس میں حرفی تعجبی کی ترتیب پر تمام غزلیں لکھی گئی ہیں۔ غزلیات کے بعد چند مخمسات رباعیات ایک ترکیب بند اور ایک واسوخت ہے۔ اور سب آخر میں گیارہ قطعات کا مجموعہ ہے جس سے پہلے تین نظمیں شہزادہ جوان بخش کی شادی، سفر شکار اور شہنشاہ عید کی تاریخ میں ہیں باقی آٹھ قطعوں میں مارکوئیس دلیزی اور فورٹ ولیم کالج کے بعض پروفیسروں کی مدح ہے ٹھیک طور پر نہیں بتایا جا سکتا کہ انوسوس کا دیوان کن مطالع سے شائع ہوا ہے مولوی سید حسین گلگرامی عماد الملک بہار نے ۱۲۰۷ء میں ”مختار اشارے“ کے نام انتخاب شعراے اردو کا ایک سلسلہ مدراس یونیورسٹی کے لئے قائم کیا تھا۔ اس سلسلہ میں قائم چاند پوری اور انوسوس وغیرہ کے دوا دین کے انتخابات شائع ہوئے ہیں۔ یہ انتخاب مولوی سید حسین گلگرامی کے لئے ہوئے ہیں۔ انوسوس کے دیوان کا انتخاب بھی مولوی صاحب

۱۵ تذکرہ سخن شعرا۔ از عبد الفتوحان نساخ ص ۶
۱۶ علی ابراہیم خاں عقیل ساکن پٹنہ مصنف تذکرہ گلزار ابراہیم ص ۱۱۸
۱۷ تذکرہ گلشن ہند از مرزا علی لطف مولف سلسلہء ص ۶

تفس سے چھوٹنے کی امید ہی نہیں تھی حصول کیا ہے جو مزدہ بہار کا پہنچا
 کیا لکھوں اسکیں احوال یہ کہنا مقاصد بے حواسی کے سبب طاقات تحریر نہیں
 دیکھتے ہی اسے حاضر ہو کر جانے کو دینی شخص جو یاں آئے تھے سمجھانے کو
 کیوں نہ ہوا سقد گھنٹا اس بت پر غور کو صبر کسی طرح نہیں اس دل ناصبور کو
 اُس کے اٹھنے ہی جی پہ آن جی نو دیکھے آگے آگے کیسا ہوئے
 صورت تجھے حق نے دی پری سی پر آدمیت نہ دی ذری سی
 کچھ بات تم سے کر نہیں سکتے ہزار حیف مدت میں تم نے بھی تو غیور دل گھر لے

باغ اردو

یہ انوس کا شاہکار اور مقبول و معروف کارنامہ ہے اور سچ پوچھو تو آج کل کا نام اسی سے زندہ ہے۔ یہ حضرت شیخ سعدیؒ (۱۱۸۳ھ تا ۱۲۹۱ھ) کی مقبول خاص و عام کتاب گلستان کا ترجمہ ہے اس کے ترجمہ کی تقریب خود انوس نے اس طرح لکھی ہے "ایک دن صاحب موصوف (ڈاکٹر گل کرائسٹ) نے میرانی سے فرمایا کہ گلستان سعدی شیرازی کا زبان اردو میں ترجمہ کریں گے وہیں کیا عبارت اسکی بظاہر صاف و باطن پیچیدہ ہے۔ علاوہ اس کے عبارت کا اختلاف بے شمار ہے اور البتہ اپنی قوت تالیف کا اور شیخ مرحوم کی تصنیف کا جو خیال کیا تو کسی طرح کی نسبت نہ پائی مہر ع چون نسبت خاک را با عالم پاک - ارادہ کیا کہ اس سے پہلو تہی کر دوں اور سر عجز آگے دہوں پھر سوچ آیا کہ مبادا حاشیہ خیال میں ان کے گزرے کہ اس نے ہمارا کہنا نہ مانا اور اس بات کو سہل بنا نا۔ تب قصد کیا کہ ایک حکمت طولانی کہ نظم و نثر اس میں کثرت سے ہو اسے ترجمہ کر دوں۔ اگر سنجی سر انجام ہوئی اور اہل محلی کو پسند پڑی تو فہما۔ والا صاحب ممدوح سے اس امر کی معافی چاہو گا چنانچہ قاضی ہمدان کی حکایت کا ترجمہ کیا اور وہ علما و عقلا و شعرا کہ یہاں تھے ان کے پسند پڑا۔ تب اس نے کمر ہمت بقوت باندھی اور سعی یلین کی۔" "باغ اردو" اس کا تاریخی نام ہے اور اس سے خود انوس نے لکھا ہے کہ تاریخ آغاز نکلتی ہے چنانچہ دیباچہ میں یہ قطعہ دیا ہوا ہے۔

میں تاریخ اسکی چوں چاہا مع نام کموں دیکھ پ یہ آئین نیسکو
 کہ اس میں ہاتھ غیبی یہ پو لائو ہے آغاز اردو سے "باغ اردو"

"باغ اردو" سے ۱۲۱۴ھ تک ہے۔ اسی دیباچہ میں انوس نے ایک جگہ اپنی تقریب ملازمت کا ذکر یوں کیا ہے "ستائیسویں تاریخ روز جمعہ کہ دی سترہویں ماہ اکتوبر کی تھی سن سبزی بارہ سے پندرہ تھی اور اٹھارہ سو ایک عیسوی کہ صاحب جلیل القدر کرنل اسکاٹ بہادر نے مجھے بلوایا اور کلام میرا سنا" جب انوس ۱۲۱۵ھ میں کلکتہ آئے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ انہوں نے ۱۲۱۴ھ میں ڈاکٹر گل کرائسٹ کے حکم سے یہ کام شروع کیا۔

۱۵ باغ اردو مطبوعہ کلکتہ ۱۲۱۵ھ دیباچہ ص ۱۲

۱۶ باغ اردو مطبوعہ کلکتہ ۱۲۱۵ھ دیباچہ ص ۱۲

روح گلاب صفر علی محمد علی تاجر عطر کنندہ سے منگا کر استعمال کیجئے

ماننا پڑتا ہے کہ انھوں نے اپنے طور پر کبھی ۱۲۱ھ میں اس خیال کی بنیاد ڈالی تھی اور چونکہ وہ شعر گوئی سے متغیر ہو کر درس تدریس کی طرف مائل ہو چکے تھے، ممکن ہے انھوں نے کچھ ترجمہ ۱۲۱ھ میں شروع کر دیا ہو اور پھر اُسے مشکل اور اپنے بس سے باہر کا کام سمجھ کر چھوڑ دیا۔ غرض اس کتاب کے ترجمہ کا سلسلہ آغاز ۱۲۱ھ سے ہے اور خود انوس نے اُس کو اپنے اہتمام سے ۱۲۱ھ تا ۱۲۲ھ میں پہلی مرتبہ شائع کیا۔ سیر المصنفین کے مولف نے باوجود اوپر کا قطعاً تاریخ اپنی کتاب میں نقل کرنے کے، ”باغ اردو“ کا سلسلہ تالیف ۱۲۱ھ بتایا ہے۔ نیز مولوی عبدالحی صاحب ممتدائجن ترقی اردو نے ایک جگہ یہی سنہ بتایا ہے۔ یہ سنہ کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا، کیونکہ انوس نے ۱۲۱ھ سے بہت قبل ”باغ اردو“ اور ”آرائش محفل“ کا کام ختم کر کے دوسری کتابوں کی تصحیح و نظرائی شروع کر دی تھی۔ علاوہ ازیں مائتہ الکتاب میں انوس نے صاف طور پر لکھ دیا ہے کہ اس ہجری بارہ سے سولہ اور عیسوی اٹھارہ سو دو میں یہ ترجمہ کہ کسی بہ باغ اردو سے تمام ہوا اور اس کے بعد یہ قطعاً تاریخ دیا ہے۔

عون تو ذوق رب سبحان سے ترجمہ یہ کیسا تمام میں نے جب
ختم کی اس کے پیر عقل سے کی ہیں نے تاریخ عیسوی جو طلب
ابتدا کے ہمارے سے یہ کہہ سکا باغ اردو ہوئی گلستان آفتاب

نیز اس وقت ہمارے پیش نظر جو نسخہ کلکتہ کا مطبوعہ ۱۲۵ھ کلکتہ اس میں ناشر نے لکھا ہے کہ یہ ترجمہ خود انوس نے ۱۲۱ھ تا ۱۲۲ھ میں طبع کرایا تھا۔ انوس کی یہ کتاب آج کل بالکل نایاب ہے اور سیر المصنفین کے مولف کو باوجود تماشائی سعی تبلیغ کے ایک نسخہ بھی حاصل نہ ہو سکا اور نہ کہیں اس کا پتہ چلا۔ ان کا بیان ہے کہ خواجہ غلام الثقلین مرحوم کے کتب خانہ میں انھوں نے اس کا ایک قلمی نسخہ دیکھا تھا۔ انوس کو وہ بھی انھیں دستیاب نہ ہوا۔ ہمارے پیش نظر اس وقت جو نسخہ ہے وہ ۱۲۵ھ میں کلکتہ کا چھپا ہوا ہے اور کلکتہ کی قدیم مطبوعہ کتابوں کی طرح ٹائپ کے حروف پر ہے یہ نسخہ بالکل مکمل اور اچھی حالت میں ہے صرف دیباچہ کے چار صفحاتوں کا کسی قدر حاشیہ کرم خوردہ ہے۔

باغ اردو کی ترتیب حسب ذیل ہے۔

۱۔ احوال رسم خط۔ اس عنوان سے انوس نے ڈاکٹر گل کرائسٹ کے رسالہ رسم خط و اعراب کا خلاصہ لکھا ہے۔

۲۔ پہلا دیباچہ ”تعریف میں لارڈ صاحب کی اور احوال مترجم کا اور بعض عذروں میں کتاب کے“ اس میں انوس نے اپنے عربی لارڈ ولزلی کی گوند جنرل ہند کی طرح کی ہے اور سرسری طور پر اپنے حالات لکھ کر ترجمہ کی مشکلات کا ذکر اور صاحبان فہم کے سامنے اپنی بے بضاعتی کا عذر کیا ہے۔

۳۔ ترجمہ۔ دیباچہ شیخ سعدی ج

۴۔ ترجمہ متن گلستان مشکل پر بہشت البواب

۵۔ سیر المصنفین از مائتہ

۶۔ مقدمہ تذکرہ گلشن ہند ص ۱

۷۔ ”باغ اردو“ مطبوعہ کلکتہ ۱۲۵ھ ص ۳۲۷

۸۔ سیر المصنفین از مائتہ

ترجمہ خاتمہ اصل کتاب

خاتمہ باغ اردو کا

”چند سطور بعض غدروں میں اور فایہ دں میں اس سلسلہ میں اپنے ترجمہ کے طریقہ پر بحث کی ہے۔

”چند سطریں شیخ مرحوم کے احوال میں اس میں شیخ سعدی کے حالات اور ان کے بعد حضرت امیر خسرو کا ذکر خیر اور شعرا کی قدروان کا بیان اور انہیں علی دین ملک کی تشریح لکھی ہے۔

فایہ د۔ اس میں اردو زبان میں تصنیف و تالیف کا کام کوئے کے لئے کن بیروں کی ضرورت ہے ان پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ مولف و مصنف کے لئے کھاگا انا بھی عربی قدرے سنسکرت اور ترکی کا جاننا ضروری ہے۔ غیر بلاغت اور اساتذہ کے کلام کے مطالعہ پر زور دیا ہے۔

اردو زبان میں گلستان کے ایک دو ترجمے اور کئی ہونے ہیں ان کے بیش نظر نہ ہونے کی وجہ سے ہم ٹھیک طور پر موازنہ کر کے نہیں کہہ سکتے کہ انیسوس کا ترجمہ بہترین ہے یا نہیں لیکن عرف ان کے ترجمہ کے مطالعہ سے یہ حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے کہ انیسوس نے گلستان کا نہایت عمدہ اور بے نظیر ترجمہ کیا ہے۔ انھوں نے زبردستی کو شش کی کہ نہ سلسلہ دھان ہو۔ اس کوشش میں وہ بلائی مذکور کامیاب ہوئے ہیں اور ان کا ترجمہ ان کے اپنے زمانہ کی اردو کا بہترین نمونہ ہے۔ گلستان میں جا بجا بر محل استعارہ بکثرت دے ہوئے ہیں ان اشعار کا اگر نثر میں ترجمہ کیا جائے تو ان کی اصلی خوبی بالکل غائب ہو جاتی ہے اور شیخ سعدی کے بعض مصرعے اور شعرا کیسے اچھے تھے، نفیس اور زباں زد و عام ہیں کہ وہ کسی طرح ترجمہ کے تحمل ہی نہیں۔ انیسوس نے ایسے مصرعوں کو اردو کے قالب میں ڈھال کر ان کے حسن و خوبی کو خراب نہیں کیا اور انھیں جوں کا توں نقل کر لیا ہے۔ انیسوس کا طرز بیان میرامن دہلوی سے زیادہ گنگنک ہے اس میں میرامن کے بیان کا سارا اوج اور بے ساختہ پن نہیں میرامن کی زبان بالکل محاورہ میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ جو بات کہتے ہیں روزمرہ اور محاورہ سے خالی نہیں ہوتی اس کے برخلاف انیسوس کی زبان میں سلاست و صفائی کیساتھ سنجیدگی و عظمت باقی جاتی ہے۔ وہ عربی و فارسی کے فقرے بکثرت استعمال کرتے ہیں اور اس خصوص میں سید حیدر بخش حیدری سے بھی بڑے ہوئے ہیں مثال کے طور پر ان کے ترجمہ کے بعض نمونے ملاحظہ ہوں۔

باغ اردو

گلستان

حکایت :- ایک دوست سے میں نے کہا کہ چپ رہنا میں نے اس سبب اختیار کیا ہے کہ بولنے میں اکثر اوقات نیک و بد کا اتفاق ہو جاتا ہے اور کچھ دشمن کی سوسے بدی کے کچھ نہیں دیکھتی۔ بولا کہ اے برادر دشمن وہی بہتر ہے کہ نیکی نہ دیکھے۔

حکایت :- یکی از دوستان را غتم متابع سخن غتم بعلت آن اختیار آدہ است کہ غالب اوقات دشمن نیک و بد اتفاق افتد ویدہ دشمنان جز بر بدی نمی آید گفت دشمن آن بر کہ نیکی نہ بیند۔

شعر: ہر چشمِ ندایت بزرگِ عجب سے محبتِ سدی دورِ نظرِ نمانِ عارست
 بیت: نو گیتی فردِ چشمِ ہور غم زشت باشد بر چشمِ بوشک کور
 شعر: دَاخُو اَقْدَاذَةُ لَامُزِ اَصَالِحِ اِلَّا دِلْمُزُہُ بِلْکَذَابِ اشیر
 حکایت: ایک بزرگانِ پارسائے راگفت کہ میر گوی در حق فلاں عابد
 کہ دیگران در حقِ ادبِ طعنہ سخننا گفتہ اند رگفت: بر ظاہرِ شعیب نمی
 بنیم دور باطنش عیب نمی دہم ہیں بروے طعنہ چگونہ کہم
 ہر کہے را کہ پارسائی پارساں و نیک مردانگار
 دزدانی کہ در نمانش حیثیت محسوب را در دین غایب کار
 حکایت: در دیشے راستیندم کہ در آتشِ خانہ می سوخت و
 خردہ بہ خردہ می دخت و نیکین خاطر خود اُمی گفت
 بنانِ خشکِ قناعت کینم و جامہ دلق

کہ رنجِ محبتِ خود بہ کہ بارِ منتِ خلق

کے گفتش چہ شبی کہ فلاں دریں شہر طبعِ کریم دارد و کرے عیم میاں بخد مت
 ازاں دکان بستہ و برد و لہا نشستہ اگر بر صورتِ حالت چنانکہ است و قوت
 یا بر پاسِ خاطر عریزاں داشتنِ منت دارد و غنیمت شمار و رگفت: خاموش
 کہ در پستیِ مردن بہ کہ حاجتِ بیش کسے برون قطعہ

ہم رفتہ و رفتن بہ و الزام کچھ صبر (۱) کہ ہر جامہ رفتہ بر خواجگانِ نشت
 خفا کہ با عورتِ دوزخ بر ابراست (۲) رفتن پیاسے مردی ہمایہ بہشت

محبوبہ صبر و صبر

شعور: ہر عجب ہر شمع کی آنکھوں میں بھول ہر سدی پر ہر آنکھ میں دشمن کی خار
 بہت: گوہماں روشن ہے سوچ سے سرا بہ چھو ندر کی نظر میں ہے ہر
 شعر: مدعی کا ہو کر مصالح کجا بنو اگر تو اشارہ یوں کر ہے ہر بھونا سریر
 حکایت: ایک بزرگ نے کسی پر ہیز کار سے پوچھا کہ فلاں نے عابد کے
 حق میں آپ کیا کہتے ہیں کہ اکثر اشخاص اس کے حق میں طعنہ آمیز باتیں
 کہتے ہیں کہنا اس کے بظاہر اس میں کچھ عیب نہیں لکھتا اور باطن کو آگاہ اندر ہے
 حکو ظاہر میں متقی دیکھے اس کے تقوی کا قوت نہ کر انکار
 کوچ مت کر کسی کو باطن کی محسوب را در دین غایب کار
 حکایت: ایک فقیر کو میں نے سنا ہے کہ فائدہ کی آگ میں جلتا بیوند
 پر بیوند گناہ تھا اور قسلی اپنی خاطر کی ان دو بیوں سے کرتا ہے
 باں نفوذِ نازِ خنک پر ہیں یہ لازم ہے کہ کر بیٹھوں قناعت
 ہر ایک کی خنوں کا برہم ٹھانا ہے بہتر تاکہ اپنا بارِ محنت

کسی نے کہا اس نے کیا بٹھا ہے تو لانا شخص اس شہر میں ایسا صاحب
 ہمت ہے کہ دستِ کرم اپنا اس نے کھول دیا ہے اور اپنی مکر کو آذادوں
 کی خدمت کیلئے باندھ لیا ہے اگر صورتِ حال پر تیری اطلاع پادے تو اپنے
 پرست رکھے اور تیری خدمت کی رغبت جلتے کہ اس نے چپ رہ کہ
 فقیری میں مڑنا چھا کہ حاجت کسی کے آگے بجا نا چنا چہ کہ گئے ہیں -
 بیوند گناہ صبر کا گونا کر اختیار (۱) پر اغیاسے کر نہیں جا مہ کی التجا
 مثل عذابِ نار ہے ہمایہ کہ سب (۲) جانا تو ارجو گلشنِ فردوس میں ہوا

شہدائے گلستانِ سعدی کے ترجمہ سے فارغ ہو کر انوس نے بجائے کسی اور تالیف یا ترجمہ کے دوسری کتابوں کی تصحیح و نظر ثانی کا کام
 شروع کیا اور آخر ۱۳۵۷ھ تک اسی میں مشغول رہے۔ پہلے میر بہادر علی حین کی کتاب ”نثر بنظر“ کی نظر ثانی کی۔ میر بہادر علی حین بھی نور ظہیر
 کالج کی مینوں میں تھے انھوں نے ”مفرح القلوب“ کا اردو ترجمہ ”اعلاقِ ہندی“ کے نام سے کیا ہے علاوہ ازیں دلی محمد کی ”تایخِ آسام“ بھی انہی
 کی ترجمہ کی ہوئی ہے اور انھوں نے ”ہی نحر البیان“ فتویٰ میر حسن کوڈا کر کل کر ایسٹ کے حکم سے اردو نثر میں لکھا تھا غالباً اردو خواں یورپیوں

کے لئے غنوی میر جن کے پڑھنے میں سہولت پیدا کرانے کی غرض سے گل کرائیٹ نے یہ خلاصہ بطور پیرافریز (Paraphrase) کے ان سے مرتب کرایا تھا۔

منال چند لاہوری بھی نورث ولیم کالج کے مولفین میں سے ہیں انھوں نے شیخ عزت اللہ بنگالی کی ایک فارسی کتاب ”گل بکاؤلی“ کا سہ ماہیہ میں ”مذہب عشق“ کے تاریخی نام سے اردو ترجمہ کیا تھا۔ انوس نے ان کے ترجمہ کی بھی نظر ثانی کی ہے مذہب عشق کے مضمون ہی کو پنڈت دیانند شکر نسیم لکھنوی نے نظم کا جامہ پہنا کر غنوی گلزار نسیم رکھا۔

نورث ولیم کالج کے لئے علاؤ الدین کی کتابوں کے نظم کی کتابوں کی بھی ضرورت تھی۔ اس کا اردو میں کافی ذخیرہ موجود تھا صرف نظر ثانی و انتخاب کی ضرورت تھی۔ چنانچہ مرزا رفیع سودا کا دیوان داغلی و خاوری دونوں قسم کی اعلیٰ شاعری کا مجموعہ ہونے کی وجہ سے نغراول میں چن لیا گیا اور اس کی تصحیح و انتخاب کا کام انوس کے سپرد کیا گیا۔ انوس نے اپنے حسن و مذاق سے کلیات سودا کا ایک ایسا انتخاب مرتب کیا، جنہیں صنف سخن کا بہترین نمونہ موجود ہے اور اس کو اپنے اہتمام سے کلمتہ سے شائع کرایا اس کے نسخے بھی کیا اب ہیں۔ حیدر آباد کے کتب خانہ آصفیہ، کتب خانہ کلیہ جامعہ عثمانیہ میں ایک ایک نسخہ موجود ہے اور ایک نسخہ میرے پاس ہے۔ یہ نسخہ کا مطبوعہ ہے اور اس میں سودا کے چند چوٹی کے قصائد، غزلیات کا بہترین انتخاب اور غنوی، مرثیہ اور قطعات کے عمدہ نمونے صحت کے ساتھ ذرا ج ہیں۔

انوس کا ایک اور یادگار کارنامہ آرایش محفل ہے۔ خلاصہ التواریخ کے مصنف فشی سبحان راے ساکن ٹپالہ ہیں۔ انھوں نے شاہد ہیں یہ کتاب بڑی محنت اور کاوش سے تیار کی تھی۔ سبحان راے نے اپنے جرمصادر و ماخذ بتائے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:-

عہد ہند (۱) مہابھارت، راماینا اور ہرہوئسا کے فارسی ترجمے جو شہنشاہ اکبر کے حکم سے ہوئے تھے۔ (۲) بھگت گیتا، یوگا اور سیستاجو شیخ احمد اور دیگر علمائے داراشکوہ کے لئے فارسی میں ترجمہ کئے تھے۔ (۳) گل افشاں یعنی سنگاسن تیبسی کا فارسی ترجمہ (۴) پدمات یعنی رتن سین مہارانا چتوری کی تاریخ وغیرہ عہد اسلام۔ (۵) تاریخ محمود غزنوی از مولانا عنصری (۶) تاریخ سلطان شہاب الدین غوری (۷) تاریخ علاؤ الدین خلجی (۸) تاریخ فیروز شاہی از مولانا عزیز الدین خالد خانی (۹) تاریخ افغانہ از حسین خان افغانی (۱۰) ظفر نامہ از شرف الدین یزدی (۱۱) تیمور نامہ تفسی (۱۲) تواریخ بابری (۱۳) اکبر نامہ ابوالفضل (۱۴) طبقات ناصری (۱۵) جہانگیر نامہ (۱۶) تاریخ شاہ جہاں از دواڑت خاں (۱۷) تاریخ عالمگیری از میر محمد کاظم وغیرہ۔

چونکہ مصنف کے پیش نظر ہر بادشاہ اور راجہ کے متعلق اس کے معاصرین کی تاریخیں تھیں، اس لئے اس نے ان سے استفادہ کر کے نہایت معتبر و صحیح تاریخ مرتب کی ہے۔ انوس نے مسطر ہے۔ ایچ۔ مارنگٹن کے ایساے ۱۲۱۹ھ میں اس کا اردو میں ترجمہ کرنا شروع کیا اور عہد ہند کا

۱۵ نرسن کتب خانہ آصفیہ جلد اول

پورا حصہ ۳۳۷ شمسہ میں ختم کر کے ”آرائش محفل“ اس کا نام رکھا۔ ”آرائش محفل“ پہلی مرتبہ شمسہ میں کلکتہ سے شائع ہوئی اور چند سال بعد ہی اردو دانی کے اعلیٰ امتحانات میں داخل نصاب ہو گئی۔ اس ضرورت کے سلسلہ میں ۳۳۸ شمسہ اور پھر ۳۳۹ شمسہ میں کلکتہ سے اس کے دوسرے اور تیسری ایڈیشن نکلے اس کے بعد لکھنؤ اور لاہور کے مطالعے سے کئی ایڈیشن شائع ہوئے

جان شکستپیر نے اس کے دس ابواب کا انگریزی میں ترجمہ بھی اپنی ”منتوبات ہندی“ مطبوعہ دہلی ۱۹۳۷ شمسہ میں شائع کیا۔ اس کے علاوہ مہاجر تہری کورٹ نے پوری کتاب کو انگریزی میں منتقل کر کے شمسہ ۷۷۷ میں ”آباد اور شمسہ ۷۷۸ میں شائع کیا۔ ”آرائش محفل“ میں ”ہندوستان اور اس کے مختلف صوبیات کا مفصل بیان“ وہاں کی پیداوار وغیرہ کے حالات، کھانہ دیاہ، اس کے بعد زمانہ قدیم سے لیکر فتوحات اسلامیہ تک کی جامع اور وسیع تاریخ بیان کی ہے۔ اس کتاب کا طرز بیان مضمون کتاب کی نوعیت کا محاذ کرتے بالکل سلیس اور صاف ہے اور اس کے ساتھ ادبیت چمکتی ہے۔ گو کہ اس میں زمانہ کی عام کتابوں کی طرح بڑھی ہوئی، مبالغہ آرائیاں نہیں ہیں، تاہم بعض نواقول پر ان کا قلم بے راہ ہو جاتا ہے اور تعریضیں دوچار فقرے زیادہ لکھ جاتا ہے۔ ذیل میں پہلے باب کا ایک اقتباس دیا جاتا ہے جس سے ان کے طرز بیان کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

”مملکت ہندوستان کی تعریف“

جب سے یہ مرکز خاکی آرام گاہ حیوانات ہوا، سیکڑوں لاکھوں شہر، قصبے ہیں اور بسے جاتے ہیں۔ کوئی ادنیٰ کوئی اعلیٰ لیکن ہندوستان کی سرزمین کا عالم سب سے نرالا ہے۔ کوئی ولایت اس کی وسعت کو نہیں پہنچتی اور کسی مملکت کی آبادی اس کو نہیں لگتی۔ یہاں کی ہر ایک بستی میں گھاگم جاجا ایک نئی طرح کا عالم ہر شہر و قصبہ میں سہری پاکیزہ، پختہ متعدد دسرا میں مسافر کے واسطے ہر موسم کے اور ہٹے بھونے اور اقسام کی غذائیں اکثر بیسیوں مسجدیں، خانقاہیں، در سے، باغات، غریبوں، بیکسوں، مہاذن کے لئے متعدد مکانات، قلعے، بڑے بڑے مضبوط، وسعت میں ایسے کہ سیکڑوں کلاں ان میں بسیں اور نعمت میں اس قدر کہ بادل ان کے نیچے برسیں۔ ندی، نالے، تالاب، کنوئیں، لطیف و پاکیزہ ہزار ہا پانی ان میں بٹھا، ٹھنڈا، تھرا بھرا ہوا، بڑے بڑے دریاؤں میں کشنیاں، نواڑے، بھرے وغیرہ بے شمار شاہراہ کے ندی نالوں پر پیشتر مقاموں میں پل بندھ تیار اکثر رستوں میں کوسوں تک سایہ دار درختوں کی دوطرفہ قطار۔ ایک ایک کوس کی مسافت پر ایک ایک مینار نمودار ہر ایک چوکی پر تمام چیزیں میاں سود و دلو کی دوکانیں جاجا، مسافر خوش و خرم، کھاتے پیتے، ٹھٹھے بیٹھے دن بھر چلے جاتے ہیں اور شام کو منزل پر بھی سب طرح کا آرام پاتے ہیں۔

جہاں دیکھے خیر ہی خیر ہے سفر یہ نہیں باغ کی سیر ہے

سو اسے اس کے راہ میں اگر سونا اچھلتے چلے جائیں کہیں خطرہ نہیں اور جگہ میں رات کو جہاں جا ہیں سو وہیں کچھ پروا نہیں چنانچہ ہمیشہ سوداگر بنجارے، مال و متاع، غلہ دور دور سے بھر لائے ہیں اور منزل مقصود پر سلامت جوں کا توں پہنچ جاتے ہیں۔“

سید محمد قادی (حیدر آبادی)

منیر شکوہ آبادی

شہنوی معراج انسانین

منشی سید جمیل حسین خیر سادات میں سے تھے۔ سیانہ قراکشی چہرہ، دھڑا ہم چہرہ کنویں رنگ، کشادہ پیشانی، پیوستہ ہر دو بڑی پانی ریشہ پر آنکھیں، بھرے ہوئے کال، سو تو ان رنگ، یار رنگ، دانست خوشی رہا ہی تو ہم سے نظر آجائے، متوسط اونچپن اور سلامت روی کی چٹائی، شہنہ یا لکھنؤ کی چلن کا کرتہ، لعل یا یار یک منزب کا انگور کھا، چو گوشتہ، ٹوپی اجالی کا گوشتہ، دار کین کار، مال اور ہے ہوئے گلبدان یا شہزاد کے خوش پانچ، کا پانچا، اور لکھنؤ کی ساخت کا زرد مخمل گرگانی پہنتے تھے۔ شکوہ آباد وطن تھا جس کے متعلق خود کہتے ہیں:۔

شکوہ آباد اک قصبہ ہے آباد
وہی ہے اسکن آباد اجداد
سنبھا لاہور سنس جاکر لکھنؤ میں
ہوا لکھنؤ ریاض گشتہ کو میں

اُن کے والد منشی سید احمد حسین شکوہ آباد کے ”روداد“ لوگوں میں سے تھے، ”منشی ان کا قصبہ تھی اتب تھا اور اہل غنیمت۔ ان کو ”منشی جی“ ”منشی جی“ کہل کر مخاطب کرتے تھے۔

منیر کی سند یہ دانش کا تہ پتہ نہیں چلا، ہاں، سینہ و تاریخ خود منیر نے اپنی شہنوی (معراج انسانین) میں اظہار کر دی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ سند پیدائش اُن کے بھی حافظہ سے محو ہو چکا تھا اور ”جنم پترا“ بھی کتب خانہ کے ساتھ تلخ ہو گیا تھا ورنہ وہ اس کو بھی نظم کرتے نہ رہ سکتے۔

نویں تاریخ ذالحجہ کی جو ہے
آہا یوں ماہ ہے روز سومری
اُسی دن مجھ کو دنیا میں اتارا
عجب وزعتا میں اتارا

شکوہ آباد میں زندگی کی پہلی آواز نکالی، لکھنؤ میں پروان چڑھے اور رام پور کے محلہ بھلواریں سنیل خیر جیٹل کے عقیدوں پر سپرد خاک ہوئے۔ یہ پائی مہینہ جہیں غائب مرنا پند نہیں کیا۔ نے اُن کی زندگی کا موسم شرم کر دیا پہلے ناخ کے گردہ تلاء میں داخل ہوئے، جب ناشکی شامی کا جنازہ اٹھ گیا تو رشک کا دروازہ کھٹکھٹایا اور اُن سے اصلاح لینے رہے، مرثیہ میں دیکھو استاد بنایا۔ خود اقرار کرتے ہیں:۔

دیا استادنا سخن سانشدناہ
کہ جسکا سکہ ہے لہی سے تاناہ
اُٹھا جب میرے سرے اکساہ
غائب رشک سے پھر فیض پایا
عطا کی مرثیہ میں اس کی اصلاح
کہ جس کی ہر مہر ہے نور شہر اصلاح

بید رشک، میر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ۔ سے منگانا چاہئے

میچائے سخن، اعجاز گستر دیر پاک دین مقبول دادور

ابتدائی درسی کتابیں جیسا کہ اس زمانہ کا دستور تھا پہلے اپنے والد سے پڑھیں پھر لکھنؤ کے مختلف استادوں سے۔ ”کلمے پانی“ میں تقریباً پانچ برس مولوی فضل حق خیر آبادی نے فلسفی سے عربی میں نہ فقط حصول اور تکملہ کے درس لئے کتابیں وہاں کہاں تھیں مگر قابل استاد کے علوم حکمیہ کے بزرگ دماغ سے ”منہ ربانی“ مستفید ہوئے۔ داستان سنتے سنتے ”داستان گوئی“ کا شوق ہو گیا تو میر قاسم علی دہلوی کے شاگرد نسیم خان کے سامنے مٹھائی رکھی اور راتوں کو جاگ جاگ اور جگا جگا کر اس ”شاہہ ہند“ فن میں بھی ہمارت حاصل کر لی۔ شرع کے پابند تھے، اشعار عشری گروہ سے نعلق تھا۔ (قیون لکھنؤ کا مذاق تھا) خیر کیوں نہ اس کے عادی ہوئے۔ اور سقہ تو اذیون کی گڑک ہے، اُس کو کیوں نہ منہ لگاتے۔ میر کی عربیت و فارسی تو اس سے ظاہر ہے کہ ”کلمے پانی“ میں بھی مولانا نسیم دہلوی کے حافظہ کا جائزہ لے ڈالا اور دے کے تو گوارا اس میں نشوونما پائی تھی۔ مذہبی (معراج المصفا میں) در مناجات کے تحت میں اپنے کچھ خاندانی حالات اور حوادث روزگار کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو شعرا کی عام سنت ہے، شاعری نام ہے ”توکل“ پر زندگی بسر کرنے کا وہ زمانہ لکھا۔ جب ایک ایک شعر کی قیمت میں شاہی خزانہ کی محلی تھیلیوں کے منہ کھول دے جاتے تھے، ایک ایک قصیدہ پر سلاطین زندگیاں کو مطمئن کر دیا کرتے تھے، شعراء کے منہ موتیوں سے بھر دے جاتے تھے، اور جو اہرات سے ان کے سمیت، ان کی شاعری کا وزن کیا جاتا تھا۔ اردن دامور کے شاعرانہ درباروں کا بصرہ تصور کر کے رہ جائے، شاہ نامہ کی قدرو قیمت محمود کی گور سے پوچھ لیجئے۔ جہاں آکر کی شاعر نوایاں کوئی صیدی طہرانی سے پوچھنا۔ خانخانان کی شاعرانہ فیاضیاں کوئی نظری سے دریافت کرتا۔ میر یا ہمارے زمانہ کے شعراء اُس وقت پیدا ہوئے تھے جب شاعری کے قدردان بیوند زمین ہو چکے تھے۔ ہندوستان مغربی کروٹیں بدل رہا تھا اور ملائی و انقرئی سکے صرف بازاروں کے چلن کے لئے ڈھالے جاتے تھے۔ آخر میر کی مغلوں کی انخالی پر نواب علی بہادر ملیں باندہ کوئٹہ آیا، انھوں نے بلایا، ملازم رکھا اور شاعری میں استاد بھی بنایا۔ یہ غدر سے پہلے کے واقعات ہیں۔ غدر کا فتنہ میر کی آنکھوں کے سامنے اٹھا، غدر کے ہنگامے نے ان کے بنے بنائے گھر کو اجڑا کتب خانہ کو تلف ہوتے ہوئے دیکھا۔ عسرت نے دعوت دیدی، غدر کی ہنگامہ خیزیاں ایسی تھیں کہ ایک شاعر متاثر نہ ہوتا، اسی تاثیر نے جزیرہ انڈیا کی سیاحت اس مصرع کے بدولت کر لی کہ:۔۔۔ گوروں کے پاؤں اٹھ گئے کالوں کے سامنے۔

تقریباً پانچ برس اس کالے کوسوں والے جزیرہ میں رہے اور علوم حکمیہ کی تحصیل میں وقت گزارا، اعزہ و احباب کی طویل مفارقت کو تعلیمی اشغال میں محو کرنے کی کوشش کی۔ فردوس مکان نواب سید یوسف علی خان بہادر فرمانروائے رام پور کی سعی و سفارش سے جب رہائی کی نوید ملی تو اس مسرت میں وہیں یہ اشعار کہے:۔

بارے آئی نجات کی باری کھل گیا عقدہ گرفتاری
ہمسکو منصب ملا رہائی کا قید کو جائد ابے کاری
پاؤں کو چھوڑ بھاگے مار دوسر سر کو پشتارہ گرا انباری

رفن کیڑہ صغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منکاکر استعمال کیجئے

کلمے بانی سے ہوتے ہیں جنہیں اب وطن چلنے کی ہے تیاری
 دانیج اے کتابت قید گان، میم، اے حساب سرکاری
 پھیلوں سے کہو کہ ہٹ کے سڑیں بانی میں ڈوبے یہ نمک کھاری
 غدر کے حالات اور اپنی مصیبتوں کا ذکر ”معراج المصائب“ میں کچھ کیا ہے۔

ہو جس وقت برافتنہ عام ہوے برہم رعیت سے یہ حکام
 کہ بہو لاقصدہ دہلی و نا در ہوے احکام قتل عام صادر
 سلاطین و رئیسان فلک شان چڑھے بھانسی ہوے مجبوں نڈل
 بچادی تو نے میری جان یارب ترے اسان کے قربان یارب
 بلا سے ہو گیا اسباب تاراج بلا سے میں ہوا بیکار و محتاج
 کتابوں کے تلف ہونے کا کیا غم بچادی جان یہ نعمت ہو کیا کم
 پھنسا جسوقت زندان بلا میں ہو اتیدی نئی دشت سرا میں
 بچایا تو نے طوفان بلا سے رہا حافظہ سمندر کی ہوا سے
 اسیری میں بھی کینیت سے رکھا مشقت کی جگہ راحت سے رکھا
 فرنگستان کے زنداں سے چھڑایا موئے ہندوستان پھر تو ہی لایا
 نہ بانی جب یہاں جس نکوئی نہ دیکھا ہند میں غمخوار کوئی
 نہ چھوڑا ساتھ اس پر کیسی نے نہ چھوچھا لکھنؤ میں بھی کسی نے

تو اب سید کلب علی خان بہادر فرمانروائے رامپور نے طلب فرمایا اور پچاس روپیہ ماہوار مقرر کر دیئے۔ تیسرے بڑے پرگوتھے وہ تو نظر میں
 باتیں کر لیتے تھے، متعدد مرثیے لکھے، انہ کی شان میں قصیدے لکھے، غزلوں کا انبار لگایا اور دوسرے اصناف سخن کا بھی ڈھیر کر دیا
 ضخیم کلیات ان کی پرگوتھی کا شاہد، ۱۷ ہزار شعر کی شتوئی (معراج المصائب) انکی شاعری کے ثبوت میں زندہ ادب یہ غنوی تو اس حالت
 میں کوئی ہے جبکہ انکار زندگی نے ان کے دل و دماغ کو اگر بیکار نہیں تو پریشان کر ہی رکھا تھا مگر طبیعت کی فطری موزونی ہر حالت میں کھلتی
 رہی، ”انتخاب یادگار“ (مذکرہ شعرائے رامپور مصنفہ حضرت امیر مینائی) کے سوا سب تذکرے ان کی شاعرانہ زندگی سے خاموش ہیں۔
 اتنا تیز کہنے والا جو تاج و در شک اور دیر کے تلامذہ میں رہ چکا ہو جس نے اپنی شاعری کی پیداوار فر دوسے سے بھی بڑھا دی ہو جو ممالک کا
 معاصر، تسلیم کا سموزن، امیر و داغ کا ہم عہد و اداسیر کی آنکھیں اور تھرکی روانی دیکھ چکا ہو اس کا تذکرہ اس سے خالی ہونا ایک پرگوشام

پر ظلم کرنا ہے اور شاعری کی اس افراط پیداوار کی قیمت گھٹانا ہے۔

نیر کی مثنوی (معراج المصنوعین) غالباً اردو کی دنیائے شاعری میں اسوجہ سے شہرت نہ پاسکی کہ اس کے مضامین مذہب کا آئینہ دکھا رہے ہیں، عادیث کا عکس پیش کر رہے ہیں۔ سرور کائنات سے لیکر ہمدی آخر الزماں تک کے معجزات اور ان مقدس ہستیوں کے زندگی کے تابناک واقعات و حادثات سے لیکر شہادت تک سب شئیر نے شرح و بسط سے نظم کر دیئے ہیں۔ نیر نے مثنوی کا میدان ہی ایسا تلاش کیا کہ جس میں بے لگان دور میں لگائی جاسکتی ہیں۔ یورپ کا ہومر۔ ایران کا رودکی اور ولی کا جرات باوجود ماوراء اندھ سے ہونے کے اس میدان میں ”انکھیا رے“ ہیں، اس میں جہرہ سینگ سائے چلے پھرے، نہ اس میں قافیہ کی پگڈنڈی ہے اور نہ اس میں ردیف کا ”سد سکندری“ حامل ہے، جتنا چاہئے دوڑے، جتنا چاہئے پھیلے اور اس ”صفاحٹ“ میدان کو اپنی شاعرانہ کلیلوں سے روند ڈالے، اس میں سب کچھ ہے۔ کیونکہ اس میدان کا ہر ذرہ (شعر) اپنی مستقل حیثیت رکھتا ہے، نہ اس میں اشعار کی کسی تعداد کا تعین ہے اور نہ اس میں مضامین کی کوئی تفصیل۔ اس میدان میں رزم کی تلواروں کو چمکائیے، بزم کی چیل چیل کھلائیے، احسن و عشق کے دار و احوال کا نقشہ کھینچے، تصوف کے فلک فرسان کے ماریے فلسفہ کی انجمنوں میں پڑیے اور واقعات کھری کھری باتیں بھی سنا دیجیے، تلاش سے اگر دماغ تکتا نہیں ہے تو مضامین سے مضامین پیدا کرتے چلے جائیے، اجمال کی تفصیل اور اشارات سے مافی الضمیر تک رسائی حاصل کر لیجیے۔ غزل میں یہ وسعت کہاں، جب تک قافیہ و ردیف اس کے ہم جلیس نہ ہوں گے۔ وہ اپنے وجود کو ثابت ہی نہیں کر سکتی۔ اصناف سخن میں مثنوی ہی ایک ایسی صنف ہے جو انسانی جذبات کا بھی خیر مقدم کرتی ہے اور مناظر قدرت کا بھی، اس کا ورہ اذن عام کا اعلان کرتا رہتا ہے۔ پھر اسی میں قافیوں والی غزل کو بھی نکال لیجیے اور اسی میں قصیدہ کی ہی شان و شوکت دیکھ لیجیے، اس میں عشق و محبت، ایخ و مسرت، غیظ و غضب، کینہ و انتقام اور شجاعت و بہادری، غرض تمام انسانی جذبات کو اس کے دسترخوان عام پر مدعو کر لیجیے۔ بہار و خزان کا بھی اس کے بیان پھر لگتا رہتا ہے اور گرمی و سردی کے بھی موسم اس کے یہاں آتے رہتے ہیں، برسات کا ابر بہت ہی اپنے فیضان سے غافل نہیں رہتا، صبح و شام کا اندھیرا اور اجالا ہی اس کی رہنمائی کرتا رہتا ہے، جنگل و بیابان کا سناٹا ہی اس میدان میں محو خواب رہتا ہے۔ کوہ و صحرائی آواز گشت بھی اسی میدان سے ٹکراتی رہتی ہے اور بیک و سبزہ کی چمک و دمک بھی آنکھوں میں گھومتی رہتی ہے۔ تاریخی واقعات ہی اس میدان میں کمانیوں کی طرح سننے جاتے ہیں۔ غرض کہ انسانی جذبات ہوں یا مناظر قدرت، ملکی و قومی انقلابات ہوں یا مرنے جینے کے حوادث، سب اس میدان میں ٹخن کھینچے چلے جاتے ہیں۔

مثنوی کی تخلیق اُس بارستان میں ہوئی جہاں دارا کی دارائی و فن ہے، جہاں کیکاؤس کا شاہانہ جام چشم سرنگون، عرب کے اصیل گھوڑے اس کی خوش سوادی میں گام زنی نہ کر سکے، یہ خلیل ہند و ماغوں کی جدت طرازیوں کی شگفتگی تھی۔ عرب کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے رجز مثنوی کی صورت رکھتے ہیں کیونکہ بنی امیہ کے زمانہ میں رجز نے اس قدر ترقی کرنی تھی کہ سوسو شعر کے بھی رجز بنائے جاتے تھے۔

جن کو غنوی کہنا مشکل ہے، بسیط غنوی کا وجود عرب میں کہاں! اس کا تو ایران ہی باغبان ہے، اسی نے اس درخت کو لگایا اور اُنسی کی آبیاریوں نے اُس کو سرسبز رکھا اور اُنسی نے فارسی شاعری کے باوا آدم، رودکی کو اس کی گلچینی کے لئے جھوڑ دیا، عصری کو دامن دعاؤں کی داستانِ عشقِ نظم کرنے کے لئے تیار کر دیا۔ فردوسی نے قوشا نامہ لکھ کر ایران کی تاریخ کو زندہ کر دیا اور واقعہ نگاری کا خاتمہ۔ نظامی نے خمسہ نظامی لکھ کر پانچ کے عدد کو اپنے نام کا جزو بنالیا اور محبوب الہی کے تو خوشگوار مرید (خسرو) نے ایک ایک سانس میں نہ معلوم کتنی غنویان ہندوستان کی نضایں جھوم جھوم کر کھٹ ڈالیں۔ اسدی طوسی نے تو اپنے نعت میں ابوشکور و طبیان اور لیبی کے ہی نام غنوی گویوں میں گنا ڈالے۔

ہندوستان جب مغلیہ بادشاہوں کی بدولت ”اردو“ میں باتیں کرنے لگا اور انسانی فطرت کے لحاظ سے جب یہ لشکر ہی موزوں طبع ہو گئے تو جو اصنافِ سخن فارسی میں جاری و ساری تھے وہ وہیں بھی لڑکچڑکچڑ ہو کر فارسی اسوقت شاہی زبان تھی، ہر مذہب و ملت کے اطہار و حیالات کا یہی واحد ذریعہ تھی، ہندو بھی اس کو شوق و رغبت سے لکھتے تھے اور صاحبِ استعداد ہو جاتے تھے راجہ ٹوڈر مل اور سیر مل تو غیر فنی و فیاضی کے ہمنشینوں میں تھے لیکن تمام فارسی فارسی کی بدولت اب تک ”غنی“ کے لقب سے پکارے جاتے ہیں۔ غرض کہ اردو بولنے والے ہی ایران کی تقلید میں شعر کہنے لگے ہیں نے شاہ کہ ایمان کی بنیاد تقلید پر رکھی جاتی ہے، حیا تک کلمہ گو کسی کے ”دست حق پرست“ پر بیعت نہ کرے اور کسی کا مقلد نہ ہو جائے اسوقت تک اسکے عبادات بارگاہِ قدسیت میں مقبولیت کا درجہ حاصل نہیں کر سکتی۔ یہی کورانہ تقلید تھی کہ اردو بولنے والوں نے بیعت کے لئے حضرت رودکی کی طرہ معتقدانہ ہاتھ بڑھائیے۔ بیعت لینے والا تو بھوکا ہوتا ہے اس نے جلدی سے ہاتھ پھیلادئیے۔ ان بجاہیوں نے جو ماچانا اور شاعر بن گئے۔ پیر طریقت تو ہر قسم کی ریاضتوں کی عادت ڈالتا ہے اس نے غزلیں بھی لکھوائیں اور قصیدے بھی، رباعیان بھی اور سدس بھی، مرثیے لکھوا کر رونے کا جو گر بنایا اور غنویاں لکھوا کر واقعہ نگاری کی مشق کرائی۔ سب سے پہلے دارالحکومت دہلی سے انرجن کی آوازیں بلند ہوئیں تو گو متی میں سجان کیوں نہ پیدا ہوتا، لکھنؤ نے آتش کے پردہ میں نسیم کو اکسایا اور پھر آفتاب الدولہ قلق کو، رنگین مزاج شوق زہر کا پیالہ پی ہی چکا تھا، ”آپ بیتی“ کیوں نہ نظم کرتا۔ تیر و ستودا کی اُستادانہ شان سے یہ بعید تھا کہ وہ اس صنف کو ہاتھ نہ لگاتے، غالب کیوں چُپ رہتے، مصحفی کیوں نہ ”بحرِ المحبت“ میں غوطے لگاتے، تو من اس میدان میں کیسے نہ دکھائی دیتے۔ غنوی شعرا کی آشفقہ دماغی پرستوں کی ہو گئی، گھر گھر اس کی خوشبو پھیل گئی، گلیوں گلیوں اس کا چہرہ چاہو گیا۔ ہمارے زمانہ کی اسیر کی آخری یاد کا رشوق قدوائی اٹھ بیٹھے انہوں نے غنوی کیا لکھی محاورات کا ایک لغت تیار کر دیا ضرب الامثال کا ایک ذخیرہ جمع کر دیا اور ابوحسن طرہ حشرات الارض کی طرح غزل گو پیدا ہو گئے ہیں اسی طرح غنوی گو بھی شتار و فردوس تر ہو گئے۔ ایرانی شعرا ایک صنف کو یہ تھے اور اسی میں عمرین صرف کر کے بیگانہ روزگار ہو جاتے تھے، یورپ کو جاکر دیکھ لو اگر ایک فلسفی ہے تو منطق کے صغریٰ بکری ہے، نا آشنا، اگر ایک سائنسٹ ہے تو ادب کی شلف گلیوں سے بیگانہ، مگر جس سبک کو لیا اُسے

کارخانہ: صغریٰ علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کی ایک شاخ گلزار حوض حیدر آباد دکن میں ہے۔

اپنا کر کے دم لیا۔ عمار الملک بگرامی کا یہ قول مجھے کبھی نہ بھولے گا جو وہ اپنے چھوٹے بھائی ڈاکٹر سید علی بگرامی کے متعلق فرمایا کرتے تھے:-

”سید علی زبانوں کے سیکھنے میں بہت حریص ہے اور گوہر زبان کو کچھ نہ کچھ

جمل کر لیتا ہے مگر ادھر رہنے کا نقص رہ جاتا ہے۔ ایک چیز میں انسان

جو بچنگلی جمل کر سکتا ہے وہ متعدد چیزوں میں نامکن ہے۔“

فردوسی کے لئے یہ بس ہے کہ اُس نے شاہ نامہ لکھ دیا، نظامی کو زندہ رکھنے کے لئے خمسہ نظامی کافی ہے، حافظ کی یہ کراست ہی تو ہے کہ اُن کے مضامین رندی و سستی سے بھی کمزور عقیدے والے قال دیکھ لیتے ہیں، سعدی کو دنیائے اخلاق و موعظت کا دیوتا مان لیا ہے، شکسپیر کے ڈراموں نے دنیائے اسٹیج پر قبضہ کر ہی لیا ہے، گرے کو صرف اسکی ”ایلیچی“ یاد دلاتی ہی رہ سکی، مگر ہمارا ہندون اپنی آب و ہوا کے لحاظ سے فطرتاً حریص ہے، جس نے اُس کو سرگرداں ہی رکھا اور خوشہ چینی میں کچھ نہ کچھ شاق کر دی دیا۔

بد زبیر کے بعد نہ معلوم کتنی نثونیاں اب تک عالم وجود میں آئیں مگر نقشِ اول کے مرتبہ کو کہاں پہنچ سکتی تھیں۔ یہ تو دلی دکنش کی معاصرانہ چٹنگن ہیں کہ وہ کبھی نسیم کی سرگرم چھیڑ دیتے ہیں اور کبھی قلع کی زبان دانی پیش کر دیتے ہیں۔ لکھنؤ کے لئے یہ کچھ کم نہیں ہے کہ شوق کی ”زہر عشق“ کے دنیائے اردو میں بکثرت حافظ موجود ہیں۔ گو اُس کے جذبات بے چینی کا درس دینے والے ہیں اور مخدرات کی نظر سے دور رہنے کے قابل مگر کوئی نوجوان سے پوچھے اور ان کا ازکار رفتہ بوڑھوں سے جنھوں نے مصرعہ۔ پان کل کے لئے لگاتے جاکیں۔ پرسر و ہنسا ہے اور اپنی زندگیوں میں خشکی محسوس کی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ نوجوہی جمہرات کو لکھنؤ کی درگاہ پر ہمارا ہی جانے کو جی چاہتا ہے۔

اردو کی غنویوں میں زیادہ تر دیو پری کی بحیرہ العقول داستانیں ہیں، کیر کر کر کی تصویر کشی جو غنوی کا پہلا منصب ہے۔ اس کا ہمارے ہاں فقدان ہے۔ ہمارے غنوی گو اس کو سچ سے ناواقف اور اس راستہ سے نااہل ہیں۔ ادبی عیب ہم کو ان غنویوں میں آنکھ کے شہیر کی طرح نظر آتا ہے۔ صرف ”زہر عشق“ ہی ایک ایسی غنوی ہے جس میں شوق کی ”آپ بیتی“، یعنی مشاہدہ معلوم ہوتی ہے۔ واقعات کے نظم کرنے میں اگر شوق لکھنوی تکلف کو دخل دیتے اور عشق و محبت کے معصومانہ جذبات میں تصنع کی آمیزش کر دیتے تو شوق کا شاعرانہ و ماغ مصوری کا کمال نہ دکھلا سکتا اور واقعات کو حیثیت نہ بنا سکتا۔

منیر نے اچھا کیا کہ فرضی انسانوں کی طرف رخ نہیں کیا ورنہ وہ بھی اپنے پیشرووں کی طرح ”قلا بازی“ لکھا جاتے۔ منیر نے مضمون ہی ایسا لکھا کہ اس آئینہ میں اصلی ہی خط و حال نظر آ سکتے ہیں یعنی بخونجہ احادیث کو قلم کا جامہ پہنا یا جس میں وہ کامیاب ہوئی۔ منیر نے ۱۹۲۶ء میں ”معارضہ فیاضین“ کو ختم کیا اور اس کا دعویٰ کیا ہے کہ اس میں احادیث صحیحہ نظم کی گئی ہے۔ مگر ہمیں تو منیر کو شاعر کی حیثیت سے پیش کرنا ہے۔ منیر واقعہ نگاری میں تو مشاق معلوم ہوتے ہیں اور مضامین کو پھیلا نا بھی خوب جانتے ہیں۔ مگر غیر فصیح اور نا آشنا الفاظ اکثر مقامات کو پھینکا کر دیا ہے اور جنھوں نے میرے مذاق پر تو نا سخی تازیانے لگائے ہیں۔ میں تو فصاحت اس کو سمجھتا ہوں کہ معمولی لفظ بھی جہاں بے تکلفی سے

رکھ دیا جائے وہ جڑا ہوا خوبصورت نگینہ معلوم ہو۔ لفظوں کی ثقالت اور روکھاپن فصاحت کہاں برداشت کر سکتی ہے یہ تو اس کے مرتبہ کی اہانت ہے۔ منیر نے جہاں رنگ ناختین سے دور رہنے کی کوشش کی ہے وہاں انداز بیان کی سادگی بلائیں لے رہی ہے۔ مگر منیر آخر کہاں تک اس پردہ میں انیس کی مدارات کرتے جبکہ ناسخ و دبیر کے گھروں میں ان کی شاعری نے آنکھیں کھولی ہوں، جہاں الفاظ کی شاکستگی اور مطالب میں سادگی کا گزرنہیں اور پھر منیر خود منطق کے پیچیدار راستوں میں جھٹک چکے ہیں، فلسفہ کی بھول بھلیوں میں پھنس چکے ہیں جن کو سادگی ادا سے سیر ہے۔ منطق کے مذہب میں تو دوزنی لفظوں کے پتھر لڑھکانا اپنی منطقیت کی شانِ شوکت دکھلانا ہے، فلسفہ انجمنیں پیدا کر کے اپنی فلسفیت کا سکہ بھاتا ہے۔ مگر چیثیت مجموعی منیر نے جو کچھ کہا ہے اُس میں شعریت بھی ہے اور شاعری کے لوازمات بھی اور بعض بعض مقامات تو جن کو میری نظروں نے انتخاب کئے ہیں منیر کی شاعرانہ حیثیت کو منوالے بغیر نہیں سکتے۔

”معراج المصناین“ کا سبب تصنیف سنئے، ایک روز الہ آباد میں احباب جمع تھے اور منیر کے ”خصوصاً راز و بجوئی کے محرم“ دوست الطاف حسین صاحب غازی پوری نے منیر سے کہا کہ آپ کے آئٹم کی طرح میں قسیدے بھی دیکھے اور زندگی دوسری کی غزلیں بھی مگر :-

مناسب آپ کو ہے اب یہ تدبیر کہ کچا ہوں ضائل سب کے تحریر

کچھ اعجاز آئمہ بھی ہوں موزوں مناسب معنی والے الفاظ مضمون

کرد اب غنوی میں صرف بہت کہ ہیں مشاق ارباب متانت

پند آیا مجھے اُن کا اشارہ قدم اس راہ میں یہ کئے ڈالا

دل اب تو عشق کے دریا میں ڈالا تو کلت علی اللہ تعالیٰ

تمہید میں مناجات کی لپیٹ میں منیر نے اپنے کچھ سوانح بھی بیان کر دیے ہیں، لغت میں شب معراج کے مشہور واقعات کو نظم کر کے براق کی سرعت پر دراز کو اس شعر پر ختم کیا ہے :-

بی اولے تو حیدر بھی ہوا دلے یہی ہیں منیٰ من کنت مولے

کیا قبضہ دوعالم پر علی نے خدا نے تیغ دی دختر نبی نے

بی بی کی شانِ عصمت میں بھی یہ دوچار شعر سن لیجئے :-

اسی کے جہاں شادوں میں ہے عصمت اسی کے پردہ داروں میں ہے عصمت

زمانے بھر میں جو آب و نمک ہے انہیں کے ہر میں وہ مشترک ہے

یہاں تک جی خطا پوشی میں کاہل کہ نہاں دل میں رکھا نام قاتل

ہوئی الماس کے صدمہ سے بچاں زمر و گوں ہوا یا قوت ایماں

اصلی زعفران صغریٰ علی محمد علی تاجر عطر لکنؤ سے خرید کیجئے۔

پھر دس آئمہ کے فضائل پانچ پانچ دس دس شعر میں بیان کرتے ہوئے بارہویں امام پر اس تمہید کو ان شعروں پر ختم کیا ہے۔

پناہ دیں ہے ان کا آستانہ	انہیں کے دم سے ہے قائم زمانہ
خداے پاک کے اسمائے اعظم	صحیفے اترے تھے جو بحر آدم
زبور، انجیل، توریت اصل قرآن	علوم مایکون و علم ماکاں
رسولوں کے تبرک کا خسرینہ	علوم غیب، تابوت سکینہ
پیغمبر کا جو تھا متر و کہ پاک	شب معراج جو بھینچی تھی پوشاک
جناب سیدہ کی خاص چادر	علی کی ذوالفقار برق پسکر
کتاب جامعہ جعفر مجلد	ستامی مصحف زہرائے امجد
طبیحہ نعمت خلد برین کا	تبرک شہسپر روح الامین کا
معظم جب قدر نعمائے رب ہیں	امام عصر کے قبضہ میں سب ہیں
نہیں اعجاز سے یہ بات خالی	خدا نے کی مطول عریٰ عالی
ہویدا ہے حساب عمر کا حال	ہو اب ایک ہزار انیسواں سال

یہ عمر ۱۲۷۷ھ تک ہوئی تھی اس میں ساٹھ گز ہیں اور لگا دیجئے تو ۱۲۷۸ھ میں امام عصر کی عمر ۱۰۷۹ سال کی ہو جاتی ہے۔ 'معراج المصطفیٰ' ۳۰ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے ہر صفحہ میں ۲۲-۲۲ شعر ہیں، جہاں سرخیاں قائم ہو گئی ہیں وہاں اشعار کی تعداد میں کچھ کمی ہو گئی ہے ۱۹ صفحہ تمہید نے لے لیے ہیں، ۲۰ دین صفحہ سے اصل ثمنوی شروع ہوتی ہے جس میں میلاد سرور کائنات کو اس طرح شروع کیا ہے، چند شعرا و ہر ادھر کے انتخاب کر کے لکھنا ہوں :-

پلا ساقی شراب علم تاریخ	کہ ہوقاج باب علم تاریخ
حقیقت کیا مرسی، کیا میری ہستی	کہ ہاتھ آئے مے گو شرکی مستی
کہ عام الغیل ہے سال ولادت	ربیع الاولین شمر ولادت (قافیہ ندارد)
معبود مجتہد ستر ہویں تھی اسروز	کہ چمکا آفتاب عالم افروز
جراغ آتش پرستی کا ہو اگل ہو	پڑا ایوان کسرے میں تزنزل
دواؤں میں اٹھا کر شور و محشر	گرے جو وہ کلس روئے زمین پر
وہ آتش خانے جو تھے شعلہ انگن	ہزاروں سال سے دنیا میں روشن

خالص افشانی توام کارخانہ صہفر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے خرید کیجئے

ہوے یکبارگی اس شب کو خاموشی
دہوئیں کی طرح ہر موبد سہ پوش
چل سالہ ہوسے جب شاہ لولاک
ہو انازل کلام ایزد پاک
عقل جب سے نبوت کا ہوا دور
زمانہ نہیں ہوتیں سال اور
ہوا ترسٹھ برس کا جب بن پاک
زمانہ سے سد ہارے شاہ لولاک
یہی کہتے ہیں جو ہیں واقف احوال
کہ ہجرت کو ہوا تھا گیارہواں سال
صفر کی بہت دھڑکن ہوئی
کہا حضرت نے باغ خلد میں چین

اس کے بعد ہجرات نبوی حضرت علی کی زبان سے گنوائے ہیں، پہلے شعر میں حسب عادت ”اپنے ساتی“ کو پکارا ہے اور جبرعہ شراب کیلئے
اُسکی خوشامدیں کی ہیں اور اسی نشہ صہبائے گریز پیدا کیا ہے :-

کماں ہے ساتی زہرہ شنائل
دکھا دے آج کیف محمد بابل
حضرت علی فرماتے ہیں کہ :-
میں جتنا حال حضرت سوہوں عارف
دوشنبہ کو ہوئی تھی دجی نازل
سجھوں سے ہے قدیم اسلام میرا
لکھا ہے سابقوں میں نام میرا
رہا تا ہفت سال آخر ہی طور
نہ تھا اسلام میں میرے سوا اور
پڑھی حضرت کے پیچھے فاغ البال
سماز حق فقط میں نے کئی سال
پھر حضرت علی نے فرمایا کہ ایک روز مرد کا سنناٹ و عطف فرما رہے تھے، میں بھی اس محفل و عطا میں حاضر تھا کہ :-

کہ آئے چار فرستے کافروں کے
جو تھے سردار سارے منکروں کے
کہا سب نے کہ سن لے اے محمد
نبوت کا ہے دعویٰ تجھ کو تجید
ہمیشہ لاف تو کرتا ہے اکثر
کہ میں سارے رسولوں ہوں بڑے
جو اس دعویٰ میں تو راست گفتار
ابھی بھگو دکھا دے معجزے چار
نمایاں نوح کا طوفان کر دے
دکھا بھگو عیسیٰ کے آثار
تو خشک زمین پانی سے بھر دے
دکھا بھگو غلبل حق کے آثار
بنادے آتش سوزان کو گلزار
کوفی کوہ گران رکھ دے ہوا پر
یکدم اشد کی پابند اٹھا کر

۱۵۔ انصاف کی یہ تاریخ و فائز بھی شیعہ روایات کی بنا پر ہے۔

عق کلاب صفر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے خرید فرمایا ہے

بنادے صورت عیسیٰ و مریم ذخیرہ اپنے گھر رکھتے ہیں جو ہم

سرور کائنات نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ قرآن مجید خود اسلام کی حقانیت کا سب سے بڑا معجزہ ہے، ایک آیت بھی تو آج تک اس کے مانند نصیبانِ عرب نہ لاسکے۔ یہ ارشاد نبوی ابھی ختم ہی نہ ہوا تھا کہ جبریل نازل ہوئے اور فرمانِ خداوندی سنایا کہ:-

کرد تم قوم پر اتمامِ محبت ہوئے یہ معجزے چاروں عتات

پھر یہ چاروں معجزے متیر نے نہایت تفصیل سے نظم کئے ہیں جو اسلامی تاریخ کے جانے والوں کے حافظہ میں تازہ ہوں گے فرق اتنا ہے کہ یہ نظم کے قالب میں ہیں۔

اس ذکر اولین کے بعد جناب امیر کے سوانح کی طرف متیر اپنی عقیدت کی شاعرانہ نگاہ سے بھرتے ہیں اور حضرت علیؑ کی ولادت گاہ کی خصوصیتیں، معجزات، غزوات، شجاعت و بطالت، تقویٰ، نو پرہیز گاری، علم و فضل اور سلام پر جانِ ناری وغیرہ کو نظم کیا ہے۔ اور سلسلہٴ امامت کی بقیہ کرہوں کو بھی اسی خوش عقیدتی سے باہمی اسلام کی زنجیر سے جوڑتے چلتے ہیں، میدانِ کربلا کے روح فرسا مصائب بھی تڑپ تڑپ کر بیان کئے ہیں، اگر ہر ایک کے منتخب اشعار بھی نقل کئے جائیں تو مضمون کی عمر طولانی ہو جائیگی اس لئے میں ان مضامین کو نہایت افسوس کے ساتھ ترک کرتے ہوئے ادھر متوجہ ہوتا ہوں جہاں منیر نے امامِ ہشتمؑ کے ایک معجزے کے سلسلہ میں دریا کا منظر دکھلایا ہے:-

ہوے گوہر نشانِ جہدم لبِ پاک	ہوا اک بارگی شوقِ پردہٴ خاک
نظر آیا وہاں اک بحرِ موج	صفا میں جس کا پانی لہوئے علاج
دہاں پانی بھری نہر آبرو کی	نظر آنے لگی نیت و ضو کی
وہ دیا تھا کہ قدرت کا مرقع	ہر اک موج اس کی زنجیرِ صرصر
خرام موج پر نظارے بے خود	دم عیسیٰ کی جیسے آمد و شد
دست اپنے چلن میں مٹی نہ چاہک	روان جس طرح منہض دستِ نازک
وصال یار سے بھر آتا تھا دل	کھلی تھی شوق میں آغوشِ ساحل
کتابِ عمدہ تھا وہ بحرِ مقصود	مگر آغاز و انجام اس کا مفقود
نمایاں پھیلیاں خوش وضع ہر سو	جبین صاف پر جس طرح ابرو
چمک فلسوں کی ان کی زیرِ رویا	چرخِ آئینہٴ خسانہ میں گویا
محیطِ چرخ و آب زندگانی	اسی کے گھاٹ کا پیتھ تھے پانی

صفر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا اصلی روغن استعمال کیجئے

جہاں دریا ہے وہاں کشتی لازم ہے — منیر کے اس دریا میں لب معجز نما سے کشتی رواں ہوتی ہے، حوادث طوفانی میں پھنستی ہے اور ساحل ہند پر ٹھہر جاتی ہے۔ آپ بھی ان لفظی تصویروں کو دیکھئے :-

غرض کشتی کو حسرت نے دیا حکم	رواں ہونے کا دریا میں کیا حکم
نہ کشتیاں کوئی اس میں نہ ملے	جلی کشتی پر تک مرد سیاح نہ
کوں دریا کی کیونکر شورہ پستی	کہ موجیں لڑتی تھیں کشتی سے کشتی
شعلہ مرجب موجوں سے اُبھے	سحرے شام تک ہر گونہ سلجھے
فلک کا اس کے دامن میں بھٹکتا	کہ جیسے طشت میں ڈبیا کا ڈھکنا
بھاڑ اٹھتے تھے پانی کے برابر	جو کہ قاف سے لیتے تھے ٹکڑے
اگر مینڈھا کوئی اس کا اچھلتا	تو نیل چرخ کا ہیجا بھٹکتا
غرض ماہی سے لیکر تانبہ مہتاب	نظر آتا نہ تھا جز عالم آب
غم طوفان و باد ناموافق	ہزاروں طرح کے انگارے لاق
کیا موجوں نے یوں کشتی کو پامال	ہوا سے جیسے برگ خشک کا حال
سفینہ گاہ تھا پشت سک پر	کبھی بالافین بام فلک پر
نظر آتا نہ تھا کوئی جزیرا	کہ جس کی سیر ہو دل کو پذیرا
چلے جاتے تھے سب خوف و جہاں	نہ تھا دھیان آشنا کا آشناں
ہر اک جانب کو کشتی مرط رہی تھی	بط جو میں ہوا پر اڑ رہی تھی
سفر کا ہو گیا باجزم انجم	ہوے سب ہند میں دار و سرنام

تورات اسی کشتی میں مسافروں نے گزاری اور :-

سحر آفاق میں آئی، گئی رات	اٹھی آپ بقا سے قید ظلمات
غرض خشکی میں اترے سب جہازی	کرین تا اپنی اپنی کار سازی
دیار ہند میں اُترا جوراہب	نظر آئی طلسماتِ عجائب

منیر نے راہب کی اجنبی آنکھوں کو ساحل ہند پر جو خوبصورت و دلکش مناظر دکھلائے اور ہندوؤں کے اشران کی حالت کو گھٹ والیا کا انہوہ ہندو رسم و رواج کے عجائبات کی جو تصویر کشی ہے اور اس میں شاعرانہ شیخیوں کا جو تلاطم برپا کیا ہے وہ بے پناہ ہے اور

مثنوی کی جان۔ منیر سمجھتے تھے کہ نہ پہلے کا دریا اب کہاں بہتا ہے اور اس کی فطری موجوں سے اب کہاں لطف اٹھایا جاتا ہے جیسی منیر نے اس خشکی میں تروتازگی پیدا کرنے کے لئے اپنی طوفانی نشئی کو ایسے ساحل پر پہنچا ہی دیا جہاں کی دنیا ہی نرالی ہے اور جہاں کے عجائبات ہر پسیموں کے لئے قاصر و حیران کر دینے والے ہیں۔ گو موضوع مثنوی سے اس حصہ کو کوئی واسطہ نہیں ہے مگر منیر کی شاعری کا سیلاب کیونکر رک سکتا تھا؟ آپ ہی اپنے گھر کی باتیں سنئے اور منیر کی شاعر (موصوفی) اور دوست نظری واویلیے اور دیکھے کہ منیر کی قوت تخیل نے کیسے کیسے گل بوٹے کھلائے ہیں۔ اور خصوصاً ہندوستان کی دیہیوں کے معشوقانہ ناز و غمرے اور فطری شوقیوں کو جن اچھوتی تشبیہوں سے نیکلام کیا ہے اور جن استعاروں سے ”جیا پروردہ“ اور ”میں کو خوش صورت بنایا ہے وہ منیر کا حصہ اور ادائے بیان کا اعجاز ہے راہب کیا دیکھتا ہوں۔“

کھار آب انجودہ سیناں	ہر اک جانب ہجوم مہ جبیناں
سنہری تھالیوں چمکے روشن	بتا سے دوب، تلمسی دہو پ جندل
سٹھائی ناریں بھول اور چانول	گلوری کائے تل سیندور گونگل
چڑھاتی ہیں نہانے میں لب آب	جہاں دیکھو دہاں پوجا کے بہاب
فلک پر ڈوبتے دیکھے ستارے	لب دریا چمکتے چسپاں تارے
لگن بقی شمعوں کی جلوہ سے گرداب	تجلی سے چراغان تھا آ آب
عیان بانی میں یوں جن جہانگیر	نمایاں آئینہ میں جیسے تصویر
بہار نور و جانب سے نمودار	کنارے پر چین بانی میں گلزار
کوئی گوری ہے کوئی سانولی ہے	کسین جہنا کہیں گنگا جلی ہے
پڑی مانگوں میں سیندور اور صندل	گلابی مدبھری آنکھوں میں کاجل
گندہ زلفین بند ہے جوڑ کھلے بال	کہیں سمٹا کہیں پھیلا ہوا بال
بھنوں جٹی بڑی آنکھیں بھر گال	یہ ریشم کے لچے سنہلی بال
نگہ سے سرمہ ساں دل میں ٹالیں	بتا دین ہنس کو چلنا چسپالیں
کلائی دست باز دکات گردن	ہنسی تو یہ شکن بے چین چتون
ادا سے بوٹی بوٹی کا پھر نکستا	بگڑنا خود بخود رکنا جھکنا
لہنسی میں آپ ہی وہ لوٹ جانا	پھر آپ ہی شرم سے گردن جھکانا
دم صبح اس غضب کا رنگ دروغن	نہ دیکھا باسی پھولوں پر یہ جوین

طراوت تھی پسینے سے بدن کی چلی آتی تھی خوشبو بھیجنے کی نہ
اُدا اسی جاگنے کی چتونیں مست کبھی سینہ کبھی چہرہ تہ دست
دبانیں خشک نیندیں چھا رہی تھیں لبوں کی سرخیاں پڑا رہی تھیں
نشاں گورے بدن میں سرخ نیلے سراسر چوٹیوں کے بیچ ڈھیلے
جما ہی لینے میں منہ کا یہ معمول کبھی کبھی کلی تھی گمہ کھلا بھول نہ
کوئی انگوٹائی لیس کر ٹالتی تھی نہ کوئی سُستی کسی پر ڈالتی تھی نہ
کوئی پھولوں کو پانی میں بھاتی سمٹ کر کوئی دریا میں نہاتی
کسی کو نیند سے کوئی جگاتی نہ کوئی پھیلا ہوا کاجل چھڑاتی
کوئی دیتی تھی ہیکار عفرانی چسٹہ ہاتی تھی کوئی سوچ کو بانی
نہ لاتا تھا جو ان کے حسن کی تاب تو سورج پر چھڑاک دیتی تھیں تاب
جسے دیکھو شفق پوش و زری پوش ملکف سارپوں کا آفت ہو مش
لطافت میں پرند چین و دوپٹے شفق گوں چنریاں رنگین دوپٹے
عیان کنو اب کے لنگوں وہ طور کہ جیسے شعاعِ بوالہ کا دور
قدم جب گھران کے چو متا تھا سرگردوں گرداں گھومتا تھا
پچے کس طرح اس جگر سے دانا اسی جگہ میں بستا ہے زمانہ
اوا سے دیتی ہیں جب کوئی بھٹو کر تو اٹھ کر گرد بھر جاتا ہے جگر
سیا کا حکم ہے گھونٹ نہ ہو دور نالش حسن کو ہر دم ہے منظور
اشارہ بوسہ لینے کا وہاں ہے دبانہ ہونٹ دانتوں میں یہاں ہے
وہ کہتا ہے بہانے سے چلی آؤ انگوٹھا اٹھکے کہتا ہے ہوا کھاؤ

آخر تیر بھی تو عربی النسل تھے، کہاں تک سنہلے دانتہ نگاری کی ٹھوکریں کہیں کہیں اس حصہ میں کہانی ہی پڑیں، راہب کو یہ مظاہر پرستی عجب کے زمانہ جاہلیت کی یاد دلاتی تھی اور اس عیاں مناظر سے شرما تا تھا، حیرت کی اُچھلی دانتوں میں دبا دیتا اور ان توہات پر بیچ و تاب کھاتا تھا۔ دیا سے ہٹتا ہے اور شہر کی طرف روانہ ہوتا ہے، راستہ میں ایک کنوئیں پر "پنجاہ یوں" کا ایک ہو شر باجمل گھٹ نظر آتا ہے۔ یہاں بھی راہب ایسے صحرا نور کو جیسی بیتی پکار رہی تھیں، اچھتی نظریں ڈالتا ہوا ایک باغ کے حدود میں جب داخل ہوتا ہے

تو باغ کو اسی حالت میں پاتا ہے :-

خزان نے اس طرح گلشن کو ٹوٹا
رہایوں فرش سبزہ نا مکمل
خزان کے ڈر سے نخل داغ بیل
غرض اس باغ میں آیا جو راہب
شب غربت گلستاں میں بسر کی
برنگ شبنم گریاں سحر کی

تو راہب آنکھیں مٹے ہوا اٹھا اور وضو کر کے نماز سحر کا فریضہ ادا کیا اور یہ ارادہ کر کے پہلے والا ہی تھا کہ کوئے منزل مقصد کا رستہ بتانے والا مل جائے کہ یکایک :-

نظر آیا چین سے تھوڑی ہی دور
سماں دیوار دور سے آشکارا
ہو راہب نہایت حیرت اندیش
بچھے تھے تختہ چوہ میں سراپا
کیس باہم جوان و پیر کو دک
کوئی پڑھتا ہے پیش چشم استاد
کیس ہے بھاگوت گیتا کا چرچا
کیس ہے شاستر کا غل کیس سید
کوئی اشلوک پڑھ کر پوچتا ہے
کبشکر طرف گرم بیاں ہیں
کیس پڑت ہیں گرم بید خوانی
کیس بیدانت ہے میاں سا ہے
پُرانوں کی کہیں ہوتی ہر تجدید
زبان اُن کی نہ سمجھا راہب نیک
نہ سمجھا بندتوں میں اسکی بات ایک

جب راہب ایس دبستان کے حالات دیکھ کر سبیرا ہو گیا تو اس کو وہاں سے بھاگنے کے سوا کوئی صورت نظر نہ آئی تو منیر کو بھی راہب ایسے

ہمان کی خاطر یہ کہنا پڑا کہ:-

منیر اب ترک کر دینے تکلف
ہمان تک شاعر نہ تھا تعریف
عیان ہوں صنموں پر تالیات
دکھادی غنوی گوئی کی طاقت
اگر چہ ہے فضائل کا یہ دفتر
حدیثیں آیتیں ہیں نظم اکثر
نہ تھا زیبا کہ آتا اس میں یہ رنگ
لگا یا ناحق اس آئینہ میں رنگ
ہوئی مستوجب شرم نہایت
غنود اپنی جوانوں کی رعایت
ادھر اہل قناعت ہوں گو کرم
اُدھر خوفِ خدا دندو عالم
یہ تھا اس غنوی کے شان و دور
ہوا رنگین مزاجوں سے میں مجبور

جب منیر خاموش ہو گئے تو میں بھی اسی حصد پر اپنے قلم کے مسافر کو روکتا ہوں اور منیر کی روح شاعری پر فائز پڑھتا ہوں یہ حقیقت ہے کہ منیر نے ہر واقعہ کے جزئیات اور باریک تار یک خط و خال کو بھی اپنے مصورانہ دماغ میں سمیٹا ہے اور صفحہ قوطاس پر تصویر بنا کر دکھلا دیا ہے جو اقدار نگاری کا کمال اور وسعت نظر کی آخری حد ہے۔

دیکھئے اگر میری پریشان زندگی نے اس کی کسی وقت اجازت دیدی تو آپ کو منیر کے کلیات کی بھی سیر کراؤں گا۔ اس قسم کے نغلوں کے لئے دماغی سکون کی ضرورت ہے جس کا میری زندگی میں قحط ہے۔

ہوش بنگرامی

تصویر قصا

بنگال کے مشہور مصور مزدار کے قلم کی بہترین صناعی تصویریں بھی رنگین آرٹ پیپر پر طبع کرائی گئی ہے اور یہ تصویر نگار ماہ باج ستمبر ۱۹۲۷ء میں شائع ہو چکی ہے۔ آپ دیکھیں گے تو یقیناً خوش ہوں گے۔ قیمت فی کاپی علاوہ محصول ار

منیر بھار نظیر آباد لکھنؤ

تصویر زیب النساء بکیم

یہ تصویر صنعت و نقاشی کا ایک نادر نمونہ ہے رنگین آرٹ پیپر پر طیار کرائی گئی ہے۔ یہ دہی تصویر ہے جس کو حکومت ہند نے نہایت گراں قیمت پر خرید کر کے برٹش میوزیم کو دیا ہے نہایت عجیب چیز ہے قیمت مع محصول ار

منیر بھار نظیر آباد لکھنؤ

داد اکامرار

(ایک سچا واقعہ)

کریم خان صرف خاص کا ایک سوار تھا جس نے کبھی اس کے بیوی بچے ہوں مگر اب وہ تنہا رہتا تھا ہمارا چندوہل بہادر کی ڈوڑھی پر متعین تھا اور وہیں رہتا بھی تھا، انہوں اور ملک کا عادی تھا اور اپنی آمدنی کا ایک بڑا حصہ انہیں چیزوں کے نذر کر دیتا تھا، اس کا سالانہ غریب گھوڑا ہمیشہ تھان پر بندیا ہنسا یا کرتا تھا سو کھی گھاس تول جاتی تھی مگر نہ تو اس غریب نے کبھی ہری گھاس کی صورت دیکھی تھی اور نہ بچوں کا ذائقہ اسے یاد تھا، سواری کا اتفاق سال میں ایک آدھ مرتبہ ہوتا تھا اور وہ بھی میل دو میل کے لئے کوسوں تک چلنے کی نوبت شاید جراتی میں آئی ہو تو آئی ہو مگر اب تو زمانہ سے وہ بیکار سا ہو رہا تھا۔

بعض وقت لوگوں کا مذاق یہی غریبوں کا جان لیوا ہوتا ہے اسی طرح غریب کریم خان کے گھوڑے کی جان بھی گئی راجہ راجہ جندھما راجہ چندوہل بہادر دیوان کے متصدی تھے، ایک مدت سے کریم خان کو "بیڑے" میں پڑا ہوا اور اس کے گھوڑے کو تھال پر بندھا ہوا دیکھ رہے تھے دل لگی جو سوچھی تو ایک دفعہ ایک ضروری مراسلہ کریم خان کو بلوا کر دیا کہ سید رہے جاؤ اور فوراً جواب لیکر واپس آؤ۔ کریم خان نے لاکھ لاکھ کہا کہ سیر گھوڑا بوڑھا ہے، میں خود بیمار ہوں چالیس کوس کا راستہ مجھ سے طے نہ ہو گا مگر راجہ راجہ جندھما نے ایک بات نہ مانی۔ مجبوراً کریم خان کو تیار ہونا پڑا، رات بھر بیٹھ کر اپنی نشہ کی چیزیں تیار کر لیں صبح نماز فجر کے وقت نامست کر کے روانہ ہو گئے، اور چھ دن کی شبانہ روز کی رادو کا کے بعد قلعہ بید رہو پچھے اور جواب لیکر دوسرے ہی دن واپس لوٹے، مدت سے بیٹھے بیٹھے گھوڑے کی رگیں بھی اڑ گئی تھیں، بیچارہ پہلے ہی سے لنگڑا تھا ہوا جلتا تھا بید رہو پچھو پچھو تو بالکل مفلوج ہو گیا مگر وہاں ہی آرام نہ ملا، حیدر آباد کو واپس ہونے لگا تو چلانہ جاتا تھا، ہزار خرابی آٹھویں روز آدھا راستہ ختم کیا اور مغرب کے وقت ایک درخت کے نیچے نہایت ہی عزم و استقلال کے ساتھ کھڑا ہو گیا، کریم خان مار مار کر تھک گیا گا لیا کہتے کہتے منہ خشک ہو گیا، مگر اس نے ایک قدم آگے نہ بڑھایا، خان صاحب اتر پڑے اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر نشہ بانی کیں مصروف ہو گئے اور یہ مصروفیت ایسی تھی کہ رات کے بارہ بجے کچھ ہوش آیا تو گھوڑا نہ تھا، خان صاحب نے کمال سراپگی درخت کے نیچے آکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ کھا رفیق سفر شدید کی تاب نہ لا کر ان کو جواب دے چکا ہے پتلے تو خاں صاحب نے خیال کیا کہ گھوڑا سو گیا ہو گا مگر دیر تک جگانے کے باوجود بھی وہ نہ جاگا تو اپنے معاملہ کی نزاکت کو محسوس کر لیا اور نشہ کے قریب بیٹھ کر مراقبہ کرنے لگے، خان صاحب کی تنخواہ عرصہ اور گھوڑے کی ماہوار مسدود تھی مگر عرصہ ہی خاں صاحب کے اشغال کی تکمیل کے لئے کافی نہ تھے اب جو گھوڑے نے عین وقت پر وغا دیں تو مسدود بھی گئے صرف عرصہ رہ گئے جو کسی طرح خاں صاحب کے لئے کافی نہ تھے، دوسرا گھوڑا اکیس سے مل نہیں سکتا تھا اور وہ بیہ بھی نہ تھا جو خرید لیتے، ہلال دیر تک خاں صاحب نے مراقبہ کرنے کے بعد ایک بہترین ترکیب سوچی اور کھڑے ہو کر گرد و پیش کے میدان پر ایک تفصیلی نظر ڈالی گھوڑے

گھوڑے کی نقش سے بیس قدم کے فاصلہ پر ایک بڑا گرد با تھا۔ بین گھوڑے کی نقش سہا سکتی تھی مگر شکل یہ تھی کہ نہ تو گھوڑے نے وہاں پہونچ کر مرنے کی کوشش کی اور نہ خاں صاحب اس کی نقش کو کھینچ کر وہاں پہونچا سکتے تھے اُس کے لئے یہی دیر تک مراقبہ کرنا پڑا آخر دو بجے رات کو خاں صاحب نے کرتا، پاجامہ، انگڑیا سب اتار کر رکھ دیا، زمین پوش کو تھار کی طرح لپیٹ کر میان سے زندگ آلودہ تلوار نکالی اور لگے اپنے رفیق سفر پر تیج آرمائی کرنے ایک گھنٹہ کی محنت میں انھوں نے گھوڑے کے مختلف حصے مختلف صورتوں میں علیحدہ کر لئے اور ایک ایک ٹکڑا گردہ میں ڈال کر ساری نقش منتقل کر دی جس قدر زمین اس میں مصوم گھوڑے کے خون سے بھیگی تھی وہاں کی مٹی بھی خنجر سے گھود کر اُسی گڑھے میں ڈال دی گئی اور پھر ادھر ادھر سے مٹی پتھر لکڑی جو کچھ ہی ملا ڈال کر گڑھا بھر دیا، صبح کو قریب کے قصبہ سے ایک کدال پہاڑ پر مانگ لائے اور گھوڑے کی ایک نہایت ہی شاندار قبر پر جو حوڑہ تیار کر دی اور سُرخ مٹی سے لپیٹ کر اسے بائبل قبر کی طرح بنا دیا اعلیٰ کے درخت کی کچھ شاخیں جہاک کر قریب آگئی تھیں ان میں سُرخ دہانگے کے ”ناٹے“ باندھ دیئے اور ایک عود دان لاکر سرہانے رکھ دیا اور خود قبر کے بائیں میں درخت سے ٹیکا لگا کر اطمینان سے بیٹھ گئے۔ موضع کے پٹیل پٹواری نے اگر جب ایک نیا مزار دیکھا اور اس کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے نہایت متانت اور سنجیدگی سے قبر کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: حضرت کو یہاں دفن ہوئے مدت ہوئی آپ حضرت خواجہ بندہ نواز کے خاندان سے ہیں، قبر کا نشان مٹ گیا تو لوگوں نے یہاں اگر ٹیٹھا شروع کیا پر سبوں حضرت نے خواب میں تشریف لاکر فرمایا کہ اٹھ میرے مزار کو بے حرمتی سے بچا چنانچہ میں نے اُسے قبر جو ترہ اور مزار از سر نو بنا دیا ہے۔ اس واقعہ کی شہرت اس قدر ہوئی کہ لوگ دور دور سے دیکھنے کے لئے آنے لگے اور نذر و نیاز بھی خوب ہونے لگی نذر کار و پیہ فاتحہ خوانی کے پانچ پیسے خاں صاحب نے لیا کرتے تھے، جواب خاں نہیں بلکہ شاہ تھے اور کریم شاہ صاحب کے نام سے مشہور تھے، خوش اعتقادوں نے اس قدر دیا کہ کریم شاہ صاحب ایک بھر اپنے رہنے کے لئے اور ایک تیکہ فقرا کے ٹھہرنے کے لئے بنالیا، وہی تین بیٹے میں خاصی غمერთ ہو گئی اور بیدار اور حیدر آباد تک سے لوگ مرا دیں لیکر آنے لگے۔

ہمارا چند دجل بہادر فقیر دوست تھے انھیں جب اطلاع ملی تو اسی موضع کی دس بیگہ زمین حرار کے لئے داگراشت کر دی اور ایک ہزار روپیہ سالانہ عس کے لئے مقرر کر دیا اور سجادہ درگاہ یعنی کریم شاہ صاحب کے نام دو روپیہ یومیہ مقرر فرما دیا، اب کریم خان سوار تھے بلکہ حضرت سید شاہ گھوڑے سوار حسینی قدس سرہ کے سجادہ نشین اور کریم شاہ حسینی یومیہ دار تھے۔ مدت تک یہی عمل درآمد رہا درگاہ کی معاش سے کریم شاہ صاحب فائدہ اٹھاتے رہے اور نہایت ہی عرصے سے زندگی کے دن گزرے تقریباً دس سال تک کسی نے اس طرف توجہ نہیں کی مگر ”فضلنا بعضکم علی بعض“ دنیا میں کریم شاہ صاحب سے زیادہ ہوشیار لوگ ہی موجود ہیں ایک صاحب جو سید اور حسینی مشہور تھے اور انھیں یومیہ دعا گوئی کی تنخواہ بھی ملا کرتی تھی اتفاق سے حضرت گھوڑے سوار حسینی کے عس شریف میں تشریف لائے، سجادہ درگاہ حضرت کریم شاہ نے ان کی خوب خاطر داری کی مگر یہ صاحب کو کریم شاہ صاحب کے

ہر قسم کا عطر صہر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے خرید کر ناچا ہے

حکومت و سکنت میں مشائخیت نظر نہ آئی، در انھوں نے حضرت کے خاندان وغیرہ کے متعلق دریافت فرمایا، شاہ صاحب رکنے والے ٹھوڑے ہی تھے انھوں نے ایک طویل داستان سنا دی اور اپنا اور صاحب مزار کا شجرہ نسب حضرت غنیب نواز تک پہنچا دیا۔ سید صاحب کو یقین ہو گیا کہ آٹا مگر انھوں نے چند باتیں غور کرنے کے قابل پائیں اور عرس شریف سے واپس ہو کر ہمارا جہ چند و لعل بہادر کے پاس ایک درخواست پیش کر دی کہ ”حضرت سید شاہ گھوڑے سوار حسینی میرے دادا تھے کریم شاہ کوئی غیر شخص ہے جو سجادہ بنا ہوا بیٹھا ہے۔ سید صاحب نے ایک گرم خورہ اور پوسیدہ شجرہ اور گھوڑے سوار حسینی کے چند ملفوظات وغیرہ بیروت میں پیش کر دئے اور بعض مشائخ کی گواہی بھی دلوادی اور نہایت ہی محنت و کوشش کے ساتھ اپنے نام عاش بجال کر دیا کہ غریب کریم شاہ کو بے دخل کر دیا اور خود اس کے یومیہ اور ترمیم اور مزار وغیرہ پر قابض ہو گئے۔

کریم شاہ نے حیدر آباد کرہت کوشش کی ہزار ہزار ترمیمیں کیں کہ کچھ نہ کچھ ملے مگر ایک پیش نہ گئی اور ہر درخواست نامنظر ہوئی۔ مثل مشہور ہے کہ تو کو نہ مو کو چلے میں جھونکو“ جب انسان کسی چیز کو اپنے قبضہ سے نکل کر دوسرے کے قبضہ میں جاتی ہوئی دیکھتا ہے تو پہلے اُسے دنیا ہی نہیں چاہتا اور اگر جہن جاتی ہے تو واپس لینے کی فکر کرتا ہے جب یہ ہی ممکن نہیں ہوتا تو یہ کوشش کرتا ہے کہ مایہ النزع چیز با تو باقی ہی نہ رہے یا کسی تیسرے شخص کے قبضہ میں آجائے، مگر اُسکو یہ گوارا نہیں ہوتا کہ اس کا مد مقابل اس سے متمتع ہو۔

یہ خیال آخر میں کریم شاہ کو بھی پیدا ہو گیا اور انھوں نے نامید ہو کر ہمارا جہ بہادر کے پاس ایک درخواست پیش کی کہ مگر خود ہمارا جہ بہادر گاہ شریف تک تشریف لے چلیں تو اس کا تصفیہ بہ احسن الوجوہ ہو سکتا ہے کہ وارث حقیقی کون ہے؟ راجہ صاحب سلطنت کے کاروبار کی وجہ سے خود تشریف نہ لجا سکے مگر اپنے مقصدی راجہ راجندر پرشاہ بہادر کو حکم دیا کہ وہ مزار پر جا کر تحقیقات کر لیں، اتفاقاً عرس ہی کے زمانہ میں یہ واقعہ ہوا اور جہراغوں کے دن کریم شاہ راجہ راجندر پرشاہ کو لیکر مزار پر پہنچے وہاں پہنچ کر پہلے تو شاہ صاحب سید صاحب کا شجرہ نسب دیکھنے کی تمنا کی اور پھر ان سے حلف لیا کہ انہیں گھوڑے سوار کے خاندان سے ہیں جن کا مدار ہے جب سید صاحب نے بہ کمال اطمینان قسم بھی کھائی تو کریم شاہ نے قبر کھودا نہ کی درخواست کی اس پر سب لوگ بگڑ گئے اور قریب تھا کہ پیر پرست اصحاب کریم شاہ صاحب سے بے ادبی کر گزریں مگر کریم شاہ نے سب کو مخاطب کر کے اپنی سرگردشت سانی مفرغ کی اور اپنی مفلسی تنگدستی گھوڑے کی لاغری اور بیدرجانے کے حکم اور ایسی میں اس کے انتقال پر ملال وغیرہ کی تفصیل سنا دی راجہ راجندر نے غور کرنے کے بعد بھان لیا کہ کریم شاہ ہی کریم خان جو ان کی دیوڑھی پر سواروں کے زمرے میں ملازم تھا اور جید روانہ کیا گیا تھا مگر واپس نہیں آیا۔ کریم شاہ کے اصرار پر قبر کھودنے کی اجازت دی گئی اور جب قبر کھودی گئی تو پہلے پتھر وغیرہ برآمد ہوئے اور پھر رکاب اور چند تسمے کے ٹکڑے وغیرہ نکلے اور پھر گھوڑے کی ہڈیاں نکلیں جن کو جوڑ کر دیکھا گیا تو پورا ڈھانچہ موجود تھا، قبر کھودنے سے پیشتر سید صاحب فرار ہو چکے تھے، ان کے دادا کی ہڈیاں دکھانے کے لئے انہیں ڈھونڈنا بھی مگر تہ نہ چلا، زائرین اور خوش اعتقاد لوگ جس قدر جوش و خروش سے آئے تھے اسی قدر متعص اور شرمندہ ہو کر واپس ہو گئے۔

”حبسوت راجہ راجندر بہادر نے یہ قصہ ہمارا جب چند و لعل بہادر کو سنایا اور کریم شاہ کی سواروں میں ملازمت وغیرہ کی تصدیق کی تو وہ باوجود متانت و سنجیدگی کے دیر تک ہنستے رہے اور کریم خاں کو مصطلب خاص سے ایک گھوڑا دیکر مسخدار کر دیا۔“

سید صاحب قبلہ دادا کی مزار سے فرار ہو کر حیدر آباد آئے تو لوگوں نے چھپرنا شروع کیا اور ہر ایک شخص ان کے دادا کے ڈانچہ کا تذکرہ کرنے لگا، الغرض غریب سید صاحب کو بچوں اور لوگوں نے اس قدر ستایا کہ وہ حیدر آباد چھوڑ کر ہجرت کر گئے۔

تمکین کاظمی (از بنگلہ)

لسان الغیب۔ حافظ شیرازی کی سوانح عمری اور ان دیوانگی بہتوں
شرح جلد اول سے جلد دوم تک

کلیات نظم حالی۔ شمس العلماء حالی کے تمام منظوم کلام ۱۲
نقش از رنگ۔ جلال الدین صاحب الکر کی غزلوں کا مجموعہ ۱۲
الفاروق مکمل ہر دو حصہ مع نقشہ دنیا کے اسلام علامہ شبلی کی میراث

حضرت عمرؓ پر مشہور کتاب ہے قیمت
ابو مسلم خراسانی۔ جرجی زیدان مصری کے مشہور ناول کا ترجمہ جارج
شہباز کی سرگزشت مولانا نیاز کا پیش نشاندہ۔ عمر

تاریخ الدولتین۔ جرجی زیان کے تاریخ تمدن اسلامی کا ترجمہ ۱۲
صحیبات۔ عہد سعادت کی ۵۵ خواتین کے مستند حالات ۱۲
جذبات بھاشا۔ از مولانا نیاز شہدی شامی کے پیش نمونے ۱۲

اصلاح سخن۔ مختلف استاد کے اصلاحی کتبے کا مجموعہ ۱۲
دیوان ولی بھٹی۔ ۱۰۰ دہائی کے ابوالقاسم کا مجموعہ کلام ۱۲
کلیات وفارامیوری۔ اس عہد کے تین رنگ گلاب جاکا اردو فارسی کلام ۱۲

شاہد معنی۔ مجموعہ نظم باسط بسوانی ۱۲
مینجر بھکار۔ نظیر آباد بکھنو

باوہ نواب۔ مجموعہ رباعیات فارسی میر ولی اللہ صاحب بی لے ۱۲
مطالعہ فطرت۔ جلد اتحاد فلسفہ اسلام پر ایک بحث تصنیف ۱۲

عروس ادب۔ حضرت ہوش بگرامی کے مضامین کا مجموعہ۔ عمر
سالومی۔ اسلام آباد کا نہایت مشہور ڈراما مترجمہ جنون گورکھ پوری ۱۲
نکد ان نصاحت۔ عربی فارسی اردو کے بہترین علمی ادبی تاریخی نفاذ ۱۲

تذکرہ بلجے شاہ پنجاب کے نہایت مشہور بزرگ کے تاریخی حالات۔ قیمت ۸
جہاں آرا بیگم۔ شاہزادی جہان آرا بنت شاہجہاں کی تہا متنت تاریخ قیمت ۸
بندگی۔ امام ابن تیمیہ کی مشہور کتاب ”بعبودیت“ کا پیش ترجمہ خاتون دینی و

تصوف کی بے نظیر کتاب قیمت ۱۰
کاس الکرام۔ عمر خیام کے مفصل حالات زندگی اور مکمل شرح اس
موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے قیمت ۱۰

تملق عظیم۔ یعنی اخلاقی مضامین پر احادیث نبوی کا ایک مکمل مجموعہ جلد ۱۲
فتنہ خلق قرآن۔ نام عبد العزیز بن عجمی کی کتاب الحمیدہ کا ترجمہ ۱۲
قرآن کے ایک بے نظیر محاکمہ قیمت ۱۰

یادگار غالب۔ مرتبہ شمس العلماء نوابہ الطاف حسین علی بانی تہی ۱۲
مینجر بھکار۔ نظیر آباد بکھنو

لارڈ پین کا عہد حکومت

(گزشتہ سے پیوستہ)

قومی منافرت

اوصاف طور پر ایک بات کو سمجھ لیتا ہے اور سیر خیال یہ ہے کہ وہ قانونی واقعہ ہو اور کلکتہ کی بعض تقریروں میں اگرچہ فصاحت و بلاغت اور صنائع و بدائع کا زیادہ استعمال ہوا تھا تاہم کوئی بات ایسی نہیں بیان کی گئی تھی جو لاکھ خالی ہوا اور میرے دل میں بار بار یہ جذبہ پیدا ہوتا تھا کہ جس اوجہ میں مقرر بالعموم تقریر کرنے کے عادی ہیں اس سے زیادہ ملت اوجہ اختیار کیا جائے مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کچھ ایسی کو قربان کئے بغیر زیادہ سخت زبان استعمال کیا جاسکتی ہے کہ باوقاوت برائیوں کو کم کرنے کی کوشش کی جاتی تھی، فوائدِ مبالغہ کے ساتھ بیان کئے جاتے تھے اور عام طور سے بحث و مباحثہ میں مبالغہ کرنے کے بجائے معاملہ کو کم بتانے کی سعی ہوتی تھی اور ان گفتگو میں مجھے کئی مرتبہ اس قدر ترقی و اعتدال کے خلاف صدا کے انداز میں بلند کرنے کی ضرورت پیش آئی جو ہندوستانی کسی انگریزی سیاسی کارروائی کی نیک نیتی پر ہم رکھنے کے عادی ہیں۔ نیز اس یقین کے خلاف کہ جب وہ اپنی شکایات کو حق بجانب ثابت کر چکے ہیں تو انہیں خود بخود رفع کر دیا جائیگا۔ ہندوستان کے متعلق انگلستان کی مختلف پارٹیوں کی خود غرضی اور بے اعتنائی کو ارادۂ نظر سے کرتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سیاسی فریب کاریوں کا تجربہ رکھنے کے بعد بھی وہ مزید روباہ بازیوں کا شکار ہونا پسند کرتے ہیں۔

یہ دیکھنا حیرت انگیز ہے کہ باوجود اس کے کہ موجودہ صورتِ حالات کے خلاف حقیقی شکایات موجود ہیں اور روزانہ ایسے پلاڑیاں واقعات ہوتے رہتے ہیں جو جنبی حکومت کی یاد کو تازہ کرتے چلتے ہیں اور باوجود اس کے کہ فوری تبدیلی کے آثار بھی نہیں

اگر وہ اجماعی تباہی ہندوستان میں انقلاب کا باسب قرار دیا گیا تو شہر و نیس سیاسی تعلیم کی نشوونما اس کا کثر سبب ضرور قرار دیا جائیگا یعنی ایسی سیاسی تعلیم جس میں سیاسی اختیارات کی نشوونما شامل نہیں ہے۔ اگرچہ ایشیائیوں کی ترقی کے بارے میں مجھے کال یقین ہے تاہم میں اقرار کرتا ہوں کہ ہندوستان آنے سے پہلے میں یہ دیکھنے کے لئے تیار نہ تھا کہ ہندوستانی باغیہ سیاست میں اس قدر ترقی پانچکے ہیں جس نے اس کا اندازہ اخبارات کی ان آراء سے کیا تھا جنہیں اکثر انگریزی اخبارات مخالفانہ انداز میں پیش کرتے ہیں اور میں اُن کی بنا پر غلط رائے قائم کر چکا تھا۔ ہندوستان کے اخبارات کم سے کم وہ جو انگریزی میں شائع ہوتے ہیں، ہماری اخباروں سے زیادہ ترقی یافتہ نہیں ہیں اور نہ ان شخصوں کے ذہنی قوی سے، انہیں مساویانہ نسبت ہے جبکہ وہ نیابت کرتے ہیں میرا مطلب یہ ہے کہ انگلستان میں انگریزوں کی اعلیٰ درجہ کے رسالہ میں جب کبھی کسی مسئلہ پر کوئی مضمون شائع ہوتا ہے تو ذہنی اعتبار سے وہ دیروں کی تقریروں سے زیادہ پایہ کا ہوا کرتا ہے، حالانکہ ہندوستان میں زبانی دلائل ہمیشہ بہترین ہوتے ہیں اور نہ یہ کہنا مبالغہ میں داخل ہو گا کہ دنیا میں بہت کم تو قین ایسی ہیں جو سیاسی تقریروں میں ہندوستانیوں کا مقابلہ کر سکیں حتیٰ کہ ہمارے دارالعلوم میں سے کسی ایسے آدمی کا انتخاب کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے جو کسی دلچسپ مضمون پر بہترین تعلیمی ہندوستانیوں کے ساتھ بحث و مباحثہ کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ دورانِ حیات میں میرے دل پر ہمیشہ اس بات کا اثر پڑا ہے۔ ہندوستانی دماغ بہت جلد

پائے جاتے، پھر ہندوستانی آرا کی نیابت کرنے والوں میں چند ہی شورش پندھیا۔
ایسے ہوں گے جو انگلستان سے رشتہ تعلق کرنے کے حامی ہوں۔ مجھے تمام
سیاحت میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں ملا جو بنجیدگی کے ساتھ اس قسم کا خیال
رکھتا ہو۔ وہ اپنی گزشتہ تاریخ کی برائیوں سے کما حقہ واقف تھے اور اپنی لنگھو اور
افعال میں بہت احتیاط سے کام لیتے تھے مجھے یہ خصوصیت بہت امید افزا معلوم
ہوئی کیونکہ میں ہندوستانیوں میں خود اختیاری حکومت کی اہلیت کا مطالعہ کرنے
کے لیے آیا تھا۔ بھد، بھاجوش اور سخت سٹ کلمات ہندوستان میں ناپید ہیں
منطقی دلائل میں نے ہر جگہ سے جنکی بنیاد و اوقات پر ہوا کرتی ہے اور یہی
بہترین استدلال ہے +

اگرچہ میں ذمہ دار امیدوں کے غیر معمولی اعتدال کی تصدیق کرنے کے لئے
تیار ہوں تاہم تعلیم یافتہ طبقوں سے ملاقات کرتے وقت میں نے ہمیشہ منافرت
کی اس وسیع سطح کا مشاہدہ کیا جو انفرادی طور سے حاکم و محکوم کے جدا کئے ہوئے ہے
ہندوستان میں قومی منافرت کے مسئلہ پر بحث کرنا نہایت نادر کام ہے اور جب
میں اسے پر بحث کرنے کی جرأت کرتا ہوں تو میں اسکی ذمہ داری سے بھی ناواقف
نہیں ہوں اور اگر میں نے اس پر اظہار خیالات کرنے کا ارادہ کیا ہے تو محض اس سبب
کہ میں اس محض تصنع اور بناوٹ خیال کرتا ہوں کہ موجودہ ہندوستانی سوسائٹی
کے اہم اور نمایاں پہلو کو نظر انداز کرچکاؤں اور یہ کہ بعض ایسے ایسے پیش آجاتے
ہیں جیکہ خواہ کتنا ہی خطرہ کیوں نہ ہو سچائی کا میاکی کے ساتھ اظہار کر دینا
چاہئے اسلئے کہ یہ بہتر ہے کہ تکلیف دہ اور ذلت آفرین واقعات کو اس وقت
بیان کر دیا جائے جبکہ دماغ قابو سے باہر نہ ہو گیا ہو بجائے اس کے کہ انہیں
اس وقت پیش کیا جائے جبکہ جوش کے باعث صحیح رائے قائم کرنا ناممکن ہو جائے
یہ میری قطعی رائے ہے کہ جو منافرت انگریزوں اور ہندوستانی اقوام میں
اس وقت موجود ہے اگر اسے زیادہ فیاضانہ سلوک کے ذریعہ سے مٹانے کی

کوشش نہ کی جائے گی تو چند سال کے اندر اندر انگلستان اور ہندوستان کا
باہمی تعلق رکھنا بالکل ناممکن ہو جائیگا اور دونوں کے دوستانہ تعلقات
کا خاتمہ ہو جائیگا جو دونوں کے لئے یقیناً بہت بڑی مصیبت کے مترادف ہوگا
اور ممکن ہے کہ بد اسنی اور فسادات ایسے پیدا نہ ہوں جو مثال باضی نے
نہ دیکھی ہو۔ ہم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں کہ آئرلینڈ میں خوشگوار جزائے
کا کس طرح سے خاتمہ کیا گیا اس کی ابتدا انسانی سے شروع ہوئی اور بد میں
ہندو دی کا عنصر کم ہو گیا۔ یہی صورت حالات ہم مصر میں دیکھ رہے ہیں اور
ممکن ہے کہ ہم کل ہندوستان کی حالت سے بھی ناامید ہو جائیں۔ مجھے یقین
ہے کہ ابھی اس کی حالت امید افزا ہے لیکن یہاں تو ناامنی کی بجائے
اور لوگ بیدار ہو گئے ہیں اور ان شخص کی حماقت پر اظہار ناراضگی کر رہے ہیں
جو ہندوستان میں انگلستان کی نیابت کرتے ہوئے دیدہ و دانستہ انہیں ناراض
کرتے ہیں اور تا وقتیکہ انگریزی پبلک جس سے ابھی تک ہندوستانی اقوام
کسی قسم کا تنازعہ نہیں رکھتی اپنی بے اعتنائی کے خطرہ سے واقف نہ ہو جائیگی
اس وقت تک عام قومی منافرت کم نہ ہوگی جسکے نتائج کی تکافی ناممکن ہوگی صرف
اس قدر یاد رکھنا چاہئے کہ آئرلینڈ اور مصر آبادی اور وسعت کے اعتبار
مقابلہ بالکل معمولی ملک ہیں اور اس وجہ سے طاقت سے جلد مرعوب
ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان ایک وسیع براعظم ہے جہاں ہم سے دس گنی
آبادی رہتی ہے اور جب کبھی وہاں انقلاب ہوا تو وہ اتنے وسیع پیمانہ پر
ہوگا کہ ہم نے آج تک اس کا تجربہ نہ کیا ہوگا اور اسی بنا پر زیادہ خوفناک
ہوگا۔ ایک مرتبہ ہندوستان کو آئرلینڈ و مصر کی طرح قومی منافرت کے جذبات
میں متحدہ متفق ہونے دو، پھر دیکھو گے کہ وہاں ہماری حکومت کا خود بخود خاتمہ
ہو جائیگا اسے ایک مرتبہ انگریزی انصاف سے ناامید ہونے دو، پھر انگریز
افواج اسے اپنے ماتحت نہ رکھ سکیں گی۔ ہندوستانی مابقی مزاح کا نام ہوا اور

ایک بچہ بھی اسپر سو رہ سکتا ہے۔ وہ کچھ دار ہے اور آسانی سے بے تاب ہوتا ہے۔ لیکن وہ ہمیشہ کے لئے بدسلوکی کو کبھی برداشت نہیں کر گا اور جب اس کو سچ پر غصہ اچھا لگے تو وہ اپنی دیسے قہر کے باعث خطرناک بن جاتا ہے اور پھر طاقتور سے طاقتور شخص بھی نہ تو اس کی رہنمائی کر سکتا ہے اور نہ اپنے قابو میں رہ سکتا ہے +

میرے ہندوستانی دوستوں میں سے بعض بڑے اور باخبر شخص نے (میں بنگالیوں کا ذکر نہیں کرتا بلکہ ان اشخاص کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو میرے بڑے سرکاری عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں اور جن پر "گورنمنٹ کو اعتماد" ہے) بتایا ہے کہ ہندوستانیوں اور انگریزوں کے مابین کس طرح سے بد اعتمادی کے جذبات پیدا ہوئے اور یہ مجھے خود سبق آموز ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تیس چالیس سال پیش جب کہ ہم جوان تھے ہندو سولیں افسروں کا ادب و احترام کرتے تھے اور ان سے محبت رکھتے تھے اگرچہ کمپنی کے افسروں میں سے بعض ایسے بھی تھے جو اپنے اعتقادات کا ناجائز استعمال کرنے کی وجہ سے بری نظر سے دیکھے جاتے تھے اور جن سے بعض اوقات ہندوستانی خائف رہتے تھے۔ ہندوستانی کیرکٹ میں محبت جوش اور ادب و احترام کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اور ابتدائیں انگریز اپنی اعلیٰ قابلیت اور کیرکٹ کی مضبوطی کے باعث ہندوستانیوں پر نہایت فخر و غرور کرتے تھے۔ تقریباً تمام بڑے اشخاص ان کا ذکر نہایت ادب کے ساتھ کرتے ہیں جس سے انھوں نے ابتدائی ایام میں تعلیم پائی تھی اور وہ کمرہ کے ساتھ اس اثر کو تسلیم کرتے ہیں جو انفرادی مثالوں کے ذریعہ ان پر اور انکی اولاد پر پڑا۔ وہ کہتے ہیں کہ اس زمانہ کا انگریز آج کل کے مقابلہ میں زیادہ اختیارات کا مالک تھا لیکن وہ انہیں زیادہ ذمہ داری کے ساتھ سنبھال کر رکھتا تھا اور اپنی عزت کا خیال رکھتا تھا۔ وہ باشندوں کی ضروریات سے واقف

ہونے کی کوشش کرتا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ وہ ان سے ابھی طرح واقف تھا۔ اگر وہ بہت ہی اعلیٰ عہدہ پر فائز نہ ہو تو خیر وہ ان کی آسانی کے ساتھ پہنچ سکتی تھی وہ زیادہ تر لوگوں کے درمیان رہتا تھا اور انہی کی عادات و رسوم کے مطابق زندگی بسر کرتا تھا۔ وہ اچھے آدمیوں کے ساتھ دوستانہ روابط رکھنے میں عار نہیں سمجھتا تھا اور بعض اوقات وہ انہی میں شادی کر لیتا تھا۔ لیکن ہے کہ بعض اعتبار سے اس کے نتائج خراب ہوں لیکن اس نے مشرق و مغرب کے تعصبات و ذاتی کی دیوار کو تو مڑوڑ سار کر دیا تھا اور افسر کے دل میں باشندوں کی طرف سے ذاتی دیکھ بھلی پیدا کر دی تھی جو محض احساس فرض شناسی سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس زمانہ کا انگریز بسا اوقات ہندوستان کو اپنا دوسرا گھر سمجھتا تھا۔ انگلستان جانے کا راستہ افریقہ کے گرداگرد ہو کر جاتا تھا سفر تکلیف دہ اور گران پڑتا تھا اور خط و کتابت کم اور دیر سے ہوتی تھی اور نیشن لینے کے بعد بہت سے افسر اپنے اس دوسرے وطن کے اس قدر گرویدہ ہو جاتے تھے کہ وہ طویل طویل سفر کی تکلیف برداشت کرنے کے بجائے زندگی کے باقی ماندہ دن اسی سرزمین میں بسر کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ اس سے آسانی سمجھ میں آ سکتا ہے کہ کمپنی کے افسران ہندوستان سے اپنی محبت رکھتے تھے کہ ملک معظم کے افسران نہیں رکھتے۔ اور چونکہ انہیں محبت ہوئی تھی اس لئے وہ آج کل کے مقابلہ میں زیادہ اچھا کام کر رہے تھے اور اس کا عوض انہیں یوں ملتا تھا کہ ان سے بھی لوگوں کو گرویدگی ہو جاتی تھی +

مگر وہ اپنی آدوریت اور مخلصانہ سے تعلقات رکھنے کی سہولتوں کمپنی کی موت سے کچھ دن پہلے افسروں کی زندگی میں انقلاب پیدا کرنا شروع کر دیا تھا جنہیں ۱۸۵۷ء کے واقعہ نے اور سرعت پیدا کر دی تھی اور بالآخر اس کو پایا کیل تک پہنچا دیا۔ رفتہ رفتہ جب انگلستان جانے میں زیادہ سہولتیں پیدا ہو گئیں رخصت کی درخواستیں بھی زیادہ ہونے لگیں تو ہر افسر جب اپنی طویل خدمت

کھدے طریقت پنہاں رہینگے میں نے ایک سے زیادہ مرتبہ ایسے مجمعوں کو ترمیم دیکھیں مددی ہے اور عہدہ اس کا نتیجہ تکلیف دہ رہا ہے ہندوستان کی انگریز عورتیں انہی بلاؤں کے مقام کو قید خانہ سمجھتی ہیں اور وہاں کے باشندوں کو دائرہ انسانیت سے خارج سمجھتی ہیں اور اپنی روٹگی کے دین کو اپنے اہل خیال پر امید کا ستارہ قرار دیتی ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ احساس قدرتی ہوا ہو کہ یہ اغلب ہے کہ مردوں کے مقابلہ میں عورتوں میں نسلی تعصبات زیادہ گہرے اور پائیدار ہوتے ہیں لیکن میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ حالت نہایت ناخوشگوار ہے اور جس حالت میں کہ ملک میں تعلیم (دن بدن بڑھتی جاتی ہے) اسے ایک بہت بڑا خطرہ سمجھنا چاہئے +

اینگلو انڈین بالعموم یہ غرض پیش کیا کرتے ہیں کہ کم میں اور صاحب حیثیت ہندوستان میں مراسم اس بنا پر ترقی نہیں پاسکتے کہ موخر الذکر ذات بات کو قیود میں جکڑے رہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ ایسے شخص سے جو تو تمہارے ساتھ کھائے اور نہ پئے اور انہی چوٹی سے تمہیں ملائے، یقیناً تمہارے تعلقات گہرے نہیں ہو سکتے لیکن مجھے انفسوس کے ساتھ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ یہ دلیل قابل سماعت نہیں ہے جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، ہندوستانیوں سے خوشگوار تعلقات قائم کرنے کی راہ میں ذات بات کے تعصبات بالکل حائل نہیں ہوتے۔ ان میں ہمیں مسلمان پارسی اور دیسی عیسائی سب شامل تھے اور نہ مجھے کوئی شخص ایسا ملا جو سادی طریقہ سے ملے کا خواہشمند نہ ہو۔ میرے اور ان کے خیالات میں ایسا گہرا اختلاف نہ تھا جو دور نہ کیا جاسکے، حالانکہ اگر وہ اٹا بوی یا ہسپا بوی ہوتے تو اختلافات کبھی دور نہ ہو سکے محض یہ وجہ کہ وہ میری روٹی میں سے ٹکڑا توڑ کر نہیں کھاتے تھے، دوستانہ تعلقات کی نشوونما میں مانع نہیں آ سکتی۔

برخلاف اس کے یہ بدیہی ہے کہ کم سے کم دیسی عیسائیوں پر یہ بات عائد نہیں ہو سکتی۔ وہ ذات بات کی قیود سے آزاد ہیں لیکن باوجود اس کے انگریز سوسائٹی کے دائرہ سے خارج ہیں +

سے واپس آتا تھا تو مغربی تعصبات کا نیا ذخیرہ اپنے ساتھ لاتا تھا وہ اپنے تئیں انگریز ملک کی سیاسی زندگی سے منقطع نہیں سمجھتا تھا یا کلیتہً ہندوستان کی سیاسیات سے متعلق نہیں سمجھتا تھا اور اس لئے وہ ہندوستان میں رہ کر نام پیدا کرنے کے بجائے اور اندازہ کی جانب اپنی توجہ مبذول کرنے میں مصروف ہونے لگا سب سے آخر میں غدر نے (جسکے بعد بھی اس کی تلخ یاد باقی رہ گئی) اس بات کا خاتمہ کر دیا کہ انگریز ہندوستانی عادات سیکھیں اور ہندوستانیوں سے روابط و مراسم پیدا کریں۔ ریڈے ڈاک کے جلد جلد آنے اور تاریقی کے پیغامات سننے بگڑے عورت کے دل میں یہ دشت نکال دی کہ صرف ہندوستان ہی اسکی شادی کا میدان ثابت ہو سکتا ہے۔ اور اب ہر انگریز جن مقام پر بھی اسکا تفرقہ ہو، انگریزی گھر کے خواب دکھا کر ہے۔ اس طریقہ سے ہر سال اسکی پچاسیاں انگریزی خروں اور انگریزی واقعات کے باعث بڑھتی جاتی ہیں اور ہندوستان سے اسکی پچاسیاں ہندوستان سے کم ہوتی جاتی ہیں +

بلاشبہ لوگ مجھ سے ناراض ہو جائیں گے اگر میں یہ بات کہوں (اور یہ امر واقعہ ہی) کہ گزشتہ بیس سال کے عرصہ میں نسلی غیرت اور تلخ احساسات کا وہ حساب منہ لگتا میں انگریز عورت ہے کہ انہیں اور لکھنؤ میں اسی کی موجودگی کا نتیجہ تھا کہ غدر کے بعد انتقام کی تلوار نکلا گئی اور اب بھی اسی کے روز افزوں رسوخ کا اثر ہے۔ کہ مسافرت کی خلیج دن بدن وسیع ہوتی جاتی ہے اور باہمی ارتباط کو ناممکن بنا چکا میں نے بار بار اس کا مشاہدہ کیا ہے کہ انگریز کلکٹر باجج یا انگریز ڈاکٹر اپنے ہندوستانی ہمسایوں سے یا ماتحتوں سے سادی طریقہ سے ملنا پند کرتے ہیں مگر ان کی بیویاں اسے ہرگز ہرگز گوارا نہیں کرتیں اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جانبین سے بے معنی سوسہری کا برتاؤ ظہور میں آیا ہے۔

دنیا میں اس امر سے ہلکر اور کوئی نظر فریب نہیں ہو سکتا کہ ہندوستانی اور اینگلو انڈین مریض ایک ساتھ مجمعوں اور مجالس میں شریک ہوں کیونکہ کہ پھر وہاں کوئی چیز اصلی حالت میں نظر نہ آئیگی اور اہل دُشرب کی چیزوں کے سوا ہر جگہ تصنع ہی تصنع ہوگا اور دونوں میں باہمی بے اعتمادی کے جذبات

عطر حنا اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے دستیاب ہو سکتا ہے

ارتقاء حقیقت

(نظم)

ماس ہارڈی کی ایک نظم جس کی نقل پہچ رہا ہوں مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ اس کے بحر و قوافی کی ترتیب مجھے بہت پسند آئی تھی۔ یوں تو پہلے سے اس نظم کو اردو میں ترجمہ کرنے کا خیال مجھے تھا۔ لیکن جب کالج میں طلبہ کو انگریزی عروض (وحدہ حصہ) پڑھانے کا موقع آیا تو یہ خیال دل نشین ہو گیا کہ ہر زبان میں بحر میں پیشا ہو سکتی ہیں اور ان کی جو ترتیب انگریزی میں یا کسی زبان میں موزوں - (metrical) ہے وہ اردو میں بھی موزوں ہوگی۔ چنانچہ ہارڈی کی اس نظم پر جب اس ارادے سے پھر غور کیا تو ایک دلچسپ بات یہ نظر آئی کہ اصل نظم میں ہر بند کا آخری مصرع میر کی مشہور غزل "دل الٹی ہو گئیں سب تدبیریں" کے بعد نہ دوانے کا کام کیا "کئی بحر میں ہے انگریزی نظموں کے ترجمے" اردو نظم میں اگر ہوسے ہیں لیکن غالباً یہ امر پہلی بار اسی ترجمے میں ملحوظ رکھا گیا ہے کہ ترجمہ کا ہر مصرع اسی بحر میں ہو جس بحر میں اصل مصرع ہے اور قوافی کی ترتیب بھی وہی ہے جو اصل میں ہے۔ اصل کے ایک مصرع کا ترجمہ کر کے مصرع سے بغور تقابل کرنے سے یہ واضح ہو جائے گا۔

(رنگھت سہلے فراق بی لے)

(غیر ماہ و سال)

(۱)

Last, as first, the question sings
of the will'o'long travellings.

آب تک کھل نہ سکا یہ راز
کیوں ہے یہ عالم سوز و گداز

Why the All-mover

کیوں قدرت نے

Why the All-prover

کیوں فطرت نے

Ever urges on & measures out the dawning line
of things

ہر اک شے سے چھپر دیا ہے درد و بھرا یہ نغمہ ساز

(2)

(۲)

Hearing dumbly

بے حس و بیجاں

As we deem

کچھ تئیس

Moulding dumbly

خواب پریشان

As in dream

کی تصویر

Apprehending not how far the sentient
creatures of its Scheme

بہتر اُس سے کہ ہر کائنات میں ذی احساس ہر اک گیر

(3)

(۳)

(غیر ترجمہ)

Nay, shall not its blindness break

کیا ہوگی نہ یہ غفلت دور

Aye, shall not its heart awake

کیا ہوگی نہ یہ غفلت دور

Gently tending To its ending In a genial, germinating purpose & for loving Kindness' sake (4)	رفتہ رفتہ درجہ بدرجہ کیا نہ دل فطرت بدے گا ہونے محبت سے مجبور (۴)
Should it never Mend or Cease Aught- whatever Those endure Whom it quickens, let them darkle to Extinction Swift & Sure. (5)	جو یہ حالت یونہی رہی جو یہ اذیت کٹ نہ سکی مٹ کے فنا ہو جائے تو اچھا ہر چلتی پھرتی ہستی (۵) (آخری قرآنہ)
But a stirring thrills the air Like to sounds of joyance there That the rages Of the ages Shall be cancelled & deliverance offered from the dark that were Consciousness the will informing till it fashion all things fair (Thomas Hardy)	لیکن کچھ ہے فضا لرزاں جوش توجس کو ہر عیاں ساری بلائیں غم کی صدائیں مٹ جائیں گی اور نہ جلیں گے دھکتے دلوں پر پھر پیکان فطرت کو ہوش آئیگا۔ دنیا ہو جائیگی رشک جنان فراق گود بھپووری

حب بلو اسیر۔ پہلی دن سے فائدہ معلوم ہونے لگتا ہے۔ بو اسیر غنی ہو یا بادی دونوں کے لئے اسیر ہے بارہ دن استعمال کجائی ہے قیمت عام
روغن سوزناک و۔ پندرہ دن کے استعمال سے کیسا ہی پرا نا مرض ہو دور ہو جاتا ہے اور پہلی خوراک سے ساری تکلیفیں مٹ جاتی ہیں قیمت صر
نمک ہنسم۔ کیسا ہی درد شکم ہو، پیٹھی ہو، تحمہ ہو ذرا سی چکی جا دو کا کام کرتی ہے چند دن کے متواتر استعمال سے معدے کے تمام امراض
دور ہو جاتے ہیں۔ قیمت ۱۲ ر۔ صلنے کا پتر دو اخطانہ شفاغنی نظیر آباد لکھنؤ

شادی کب کرنا چاہئے

علم اجتماع بشری کے ماہرین اس مسئلہ میں مختلف ہیں کہ آیا انسان کو حد بلوغ تک پہنچ کر معرکہ حیات میں قدم رکھتے ہی اپنے لئے ایک شریک زندگی کی تلاش کر لینی چاہئے جو رہا و بیم، کامیابی و ناکامی، عزت و ذلت، عافیت حیات کے ہر روشن اور تاریک پہلو میں اسکے ساتھ رہے یا اس انتخاب کو اس وقت تک ملتوی رکھنا چاہئے جب تک کہ ہئیت اجتماعی (سوسائٹی) میں اپنے لئے ایک ایسا مرکز نہ بنے جس پر اس کی اور اس کی شریک حیات کی آئندہ زندگی کا دار ہو۔

اجتماعیوں کی ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ شہری زندگی میں ہلکے جو اخلاقی فساد، اور خرابیاں نظر آتی ہیں اس کا، اساسی سبب صرف یہ ہے کہ انسان کی شادی اسی زمانہ میں نہیں ہوتی جو قدرت نے میلان جنسی کے لئے مقرر کیا ہے، عام طور پر بیس سال کی عمر میں انسان کے دماغی اور جسمانی قویٰ نشوونما پاکر اس قابل ہو جاتے ہیں کہ وہ بخوبی ازدواجی زندگی کی ذمہ داریاں برداشت کر سکے لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بیشکل کسی نوجوان کی شادی تیس سال سے کم عمر میں ہوتی ہے، حد طبعی سے یہ مجاز جو کبھی دس سال بھی زیادہ ہو جاتا ہے نظام اجتماعی میں شدید ترین مفاسد اور برائیوں کا سبب ہے جس کے نتائج آج ہم تمدن دنیا میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور اس کے برعکس قصبات، اور دیہات میں، یا ایسے ملکوں میں جہاں جوان ہوتے ہی شادی کر دی جاتی ہے یہ خرابیاں نہیں پائی جاتیں، اجتماعیوں کی اس رائے سے کہ جوان ہونے کے بعد فوراً شادی کر دینی چاہئے، مذہبی لوگ بھی اتفاق کرتے ہیں۔

ڈاکٹروں کی ایک بڑی جماعت، اور خاصکر مذہب () کی تائید کرنے والے (جو نوع انسانی کو حفظ صحت

اور دوسری قسم کی خاص تدبیر اختیار کرنے سے زیادہ خوبصورت اور مکمل بنانے کے قائل ہیں) اس عمر میں شادی کرنے کے شدت سے مخالف ہیں وہ کہتے ہیں کہ عمر بچتے ہوئے سے قبل شادی کر دینے سے جو خرابیاں اور غیر قابل تلافی نقصانات نوع بشری کو پہنچ رہی ہیں اور بطریق توارث ان کا سلسلہ آئندہ نسلوں میں منتقل ہوتا رہتا ہے، وہ ان مفاسد سے کہیں زیادہ مصیبت خیز ہیں جو یہ شادی کرنے سے پیدا ہوتے ہیں، چنانچہ اس کی مثال میں وہ قومیں پیش کی جا سکتی ہیں جن میں نوجوان ہوتے ہی یا اس سے بھی پہلے شادی کرنے کا رواج ہے، مثلاً جزائر بحر ہفک اور امریکہ کے قدیم باشندوں اور ہندوستان کے ہندوؤں میں جنوسلی اور دماغی کمزوریاں پائی جاتی ہیں اس کا تہا سبب بیکٹری سے قبل شادی کر دینے میں مضمر ہے۔ ایک شادی کرنے والا نوجوان ان دونوں متناقض مشوروں کو سن کر حیران رہ جاتا ہے کہ کونسی رائے قابل عمل ہے، اور اس کا یہ تردد بالکل بجلبہ کیونکہ اسے دونوں جانب عقلا اور اہل علم کی ایک بڑی جماعت نظر آتی ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک اس کے لئے ایسی صورت میں بہتر ہے کہ تعلیم کو جو ٹرکزداعات پر نظر ڈالے اور ختم خود افراد

جماعات اور اقوام کا مطالعہ کر کے ایک صحیح نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کرے۔

نیویارک کا ایک مشہور ڈاکٹر لکھتا ہے میں نے ایسی ماؤں کو دیکھا جن کی عمر پندرہ سال سے متجاوز نہیں تھی، لیکن ان کے چہرہ پر ضعف اور خون کی کمی کے آثار بالکل نمایاں تھے، ان کی صورتیں دیکھ کر ایک ڈاکٹر یہ آسانی اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ یہ عورتیں جسمانی کمزوریوں کا شکار اس وجہ سے ہوئی ہیں کہ انھوں نے اپنے نشوونما کے کمال تک پہنچنے سے پہلے اپنی قوت جسمانی ولادت اور دیگر کمزوریاں میں ضائع کر دی۔ الغرض اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بعض اوقات پندرہ سولہ سال کی لڑکیاں شادی کے قابل ہو جاتی ہیں لیکن ایسا شاذ و نادر ہوتا ہے۔ میرے نزدیک لڑکے کی شادی کسی حال میں بھی ۲۵ سال سے پہلے اور لڑکی کی ۲۲ سال سے پہلے نہ کرنا چاہئے۔

پچھلی سے قبل شادی کرنے میں کھلا ہوا نقصان یہ ہے کہ فردوں کی جسمانی قوت کمزور ہو جاتی ہے عورت کا خون کم ہو جاتا ہے اور اس ضعف کی وجہ سے وہ امراض عصبی کی وجہ سے دق اور سل وغیرہ کا شکار ہو جاتی ہے، جن ملکوں میں لڑکی کی شادی جلد کر دینے کا رواج ہے وہاں تم دیکھو گے کہ ۳۰ برس کی عمر میں عورتوں کے چہرے پر جھریاں پڑ جاتی ہیں۔ تین کمزور ہو جاتی ہیں اور شباب کا دور ختم ہو جاتا ہے بخلاف اس کے جن ملکوں میں ۲۰ سال کی عمر کے بعد شادی کرنے کا دستور ہے وہاں عورتیں بخیر و صحت اور باہمت ہوتی ہیں اور ان کا حسن و شباب بھی دیر پا ہوتا ہے۔

نوجوان ہوتے ہی شادی کرنے میں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ جو اولاد ایسے والدین سے پیدا ہوتی ہے ان کے جسمانی اور دماغی قوتیں بالکل کمزور ہوتے ہیں اور اگر اسی طرح کئی نسل تک شباب کامل سے قبل شادیوں کا سلسلہ جاری رہے تو ہر آنے والی نسل پچھلی سے ہر حیثیت سے کمزور ہوتی جائے گی

(یو جنسٹ) خیالات کے لوگوں کا دعویٰ ہے کہ ایسی قوم میں ہرگز کوئی بڑا آدمی پیدا نہیں ہو سکتا جن میں ایک صدی کے اندر چار نسلیں پیدا ہو جاتی ہیں اور بعض تو کہتے ہیں کہ تین نسلیں بھی ایک صدی میں نہونی چاہئے جس کا مطلب یہ ہوا کہ باپ کی عمر کسی حال میں بھی ۳۳ سال سے کم نہ ہو۔

بظاہر اس میں بہت زیادتی معلوم ہوتی ہے کیونکہ ایک صدی میں تین سے زیادہ نسلیں پیدا ہو جاتی ہیں لیکن مستثنیات کو چھوڑ کر اگر دقیق بحث کی جائے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ دنیا کے عظیم ترین لوگ اس وقت بھی امریکہ میں جو بڑے بڑے ارباب علم و حکمت ہیں ان کے باپ کی عمر بھی ان کی ولادت کے وقت ۴۰ سال سے کم نہیں تھی۔ اور ان میں اب کوئی نہیں ہے جسکی ولادت کے وقت اس کے باپ کی عمر پچیس سال یا اس سے کم ہو۔

آج کل علمائے نسلیات بیٹے کی ولادت کے وقت باپ کی عمر کو بڑی اہمیت دیتے ہیں، کیونکہ باپ کی عمر اس کی اولاد کی جسمانی اور

ذہنی حالت پر بہت کچھ اثر ڈالتی ہے، ایک ہی والدین کی مختلف اولاد میں لمبائے ان کی عمر کے بڑا فرق ہوتا ہے، ذیل میں ہم چند مشاہیر عالم کے ناموں کے ساتھ ان کے باپ کی عمر درج کرتے ہیں اور یہ عموماً وقت کی ہے جب ان مشاہیر کی ولادت ہوئی

۵۱ سال	فرنگین
۵۲ سال	اردنگ
۴۳ سال	دبیر
۳۸ سال	تیشتر
۳۸ سال	دشگلشن
۵۳ سال	گوکہ
۴۵ سال	ملن
۴۵ سال	کونشیوس
۴۴ سال	ببارک
۴۳ سال	ادین
۴۰ سال	شکسپیر

علماء انسانیات کو اس حقیقت پر اس درجہ یقین ہے کہ ان میں سے ایک عالم نے ہم پونڈ انعام اس شخص کے لئے مقرر کیا تھا جو یہ ثابت کرے کہ دنیا میں مشہور آدمی کے بچہ ادا اور پردا ادا ایک ہی صدی میں گزرے ہوں اس انعام کے مقرر کرنے پر چند کوشش کی گئی مگر ایسی کوئی مثال نہ مل سکی۔

اگر ہم انسان کی عمر کا یہ لحاظ اوسط مطالعہ کریں تو اس سے بھی ہماری مقصد کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ ایک ڈاکٹر نے ۱۱۰۵ شخص کے والدین کی عمر معلوم کر کے یہ نتیجہ نکالا کہ اگر والدین کی اوسط عمر ۲۵ سال ہوتی ہے تو ان کی اولاد کی اوسط عمر ۶۵ سال ہوتی ہے اور اگر والدین ۳۰ اور ۴۰ کے درمیان ہوتے ہیں تو ان کی اولاد کی اوسط عمر ۶۶ سال ہوتی ہے اور اگر وہ ۴۰ اور ۴۵ کے درمیان ہوتے ہیں تو اولاد کی اوسط عمر ۶۸ سال زندہ رہتی ہے اور پچاس یا اس سے زائد عمر ہونے کی صورت میں ولاد کی اوسط زندگی ۷۰ سال تک پائی گئی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب انسان کی عمر بڑھتی ہے تو امراض کے حملوں سے زیادہ محفوظ رہتا ہے اور دفع مرض کی قوت اس میں بدرجہ کمال پائی جاتی ہے، اور یہی صفت بطور وراثت نسلی اولاد میں منتقل ہوتی چلی جاتی ہے جو جس کی وجہ سے ان کی ناعی اور جسمانی قوتیں مضبوط اور عمریں طویل ہوتی ہیں۔

کس کی شادی میں جہاں اور ضرورتیں ہیں وہاں ایک زبردست خرابی یہ بھی ہے کہ زوجین بوجہ تاخیر بہ کاری، خانہ داری کی ذمہ داریاں اٹھانے کے اہل نہیں ہوتے اور ان کے درمیانی تعلقات ان کے ذاتی خیالات کا نتیجہ نہیں ہوتے، بلکہ دونوں کے خاندان صحیح یا فاسد مشہدوں پر

بنی ہوتے ہیں۔ اور اسی بنا پر اکثر خاکی فساد اور فتنے برپا ہوتے رہتے ہیں جن کا نقصان خاندان کے چند افراد تک محدود نہیں رہتا بلکہ بحیثیت مجموعی تمام قوم کے لئے باعث تباہی ہو رہا ہے کیونکہ قوم نام ہے انہی خاندانوں کے مجموعہ کا ہذا میں ہر ایسے نوجوان کو جو شادی کرنا چاہتا ہے یہی مشورہ دیا گیا کہ وہ اس مسئلہ میں غفلت نہ کرے جب تک کہ اس کی عمر پچاس تک نہ پہنچے، شادی کی عمر گرم ملکوں میں ۲۵ سال اور سرد ملکوں میں ۳۰ سال ہونا چاہئے تاکہ خود زوجین ادا کی اولاد و جہاد کی عمر دراز ہو اور لا صبح تندرست اور ہر قوت کے لحاظ سے مکمل پیدا ہو اور یہی جنس بشری کو اوج کمال، اور معراج ترقی پر پہنچانے کا واحد ذریعہ ہے،

ابو المحاسن محمود علی خان
(ماخوذ)

جنوری ۱۹۲۸ء کا "نگار"

(۱) ۱۵۰ صفحات پر شائع ہو گا یعنی بجائے ۶ جزو کے تقریباً ۱۰ جزو کے مضامین اس میں ہوں گے
(۲) کلام مومن پر ایسا بیحد و مکمل تبصرہ شائع ہو گا کہ اس سے قبل کبھی شائع نہیں ہوا مومن کے مفصل حالات ہونگے اور اسکی شاعری کے مختلف اصناف اور شاگردان مومن پر نہایت جامع و مکمل تنقید ہوگی اور اس کے کلام کا ایسا انتخاب ہو گا کہ اس کی کلیات سے آپ بے نیاز ہو جائیں گے۔ یہ مضمون یکائے خود ایک مستقل رسالہ ہے جو جنوری ۱۹۲۸ء کے نگار میں شائع کیا جائے گا اور جس پر کپاس روپیہ کا ہر یہ نگار کی طرف سے صاحب مضمون کو پیش کیا گیا ہے
(۳) "علم تنفس" پر ایک نہایت ہی پیش ہوا اور نادر مضمون ہو گا اور بہت سے ان سرسبز رازوں کا انکشاف کریگا جن سے دنیا اسوقت باطل نا آشنا ہے۔

(۴) مولانا نیاز فتحپوری کا ایک نہایت ہی بے مثل فرائض شائع ہو گا اور اسی کے ساتھ ان کی ڈائری کے دو ورق اور شائع ہونگے۔ (ایک ورق اس اشاعت میں بھی درج ہوا ہے صفحہ ۶۶ لغایت صفحہ ۷۰)

(۵) علاوہ ان کے اور بھی دلچسپ، انصاف اور علمی مضامین ہوں گے اور وہ تمام خصوصیات جو نگار کے لئے مخصوص ہیں زیادہ نمایاں طور پر اس اشاعت میں نظر آئیں گی۔

(۶) خریداران نگار سے کوئی قیمت زائد نہیں لی جائے گی، لیکن جو صاحب صرف اس بیکر کو حاصل کرنا چاہیں گے ان سے ستر علاوہ محصول لیا جائے گا۔
(۷) وہ قدیم خریدار جسکی خریداری نومبر یا دسمبر میں ختم ہوتی ہے اگر وہ اپنا چندہ یا بخر و بیہ ذریعہ معنی آرڈر میٹنگ بھیج دیتے تو انکو جذبات بھاشا کی بھی ایک جلد بالکل مفت ملیگی (جس کی قیمت مع محصول ڈاک ۷۰ ہے) گویا اس طرح ۱۹۲۸ء کے لئے نگار کا چندہ صرف ۷۰ روپے رہتا ہے اور جنوری کا ضخیم رسالہ بھی بغیر کسی اضافہ کے ہات آتا ہے۔

مینجر نگار۔ نظیر آباد۔ لکھنؤ

سچائی کا امتحان کیجئے اور کارخانہ صغریٰ علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے عطر خرید کیجئے

ہندوستان کی معاشیات پر یہاں کی معاشرت کا اثر

تمہید کسی ملک کی پیدائش دولت پر مختلف حالات کا اثر پڑتا ہے۔ اگر حالات اس قسم کے ہوں جو پیدائش کے مدد و معاون ہوں تو دولتیں دن دونی رات جگمگی ترقی ہوگی اور اگر حالات نامساعد ہوں تو ابتدائی حالت سے بھی ترقی مشکل ہے۔ بعض صورتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں انسانی کوششوں کو کچھ دخل نہیں اگر قدرت ان کے حال پر صبران ہے تو ملک مالامال ہے اور اگر نا صبران تو دیران اس سے ہماری مراد ہر ملک کے جداگانہ جغرافیہ سے مثلاً انگلستان کہ وہاں کوئلے اور لوہے کی کانیں بکثرت موجود ہیں جو آج کل صنعت و حرفت کی ترقی کا اہم جزو ہیں اس کے علاوہ تمام ملک سمندروں سے گھرا ہوا اور اس لئے قدرتی طور پر دشمنوں سے محفوظ ہے۔ آب و ہوا سرد جکی بدولت باشندے غنمتی اور جفاکش ہیں۔ اب کیا یہ حالات انسانی کوششوں سے پیدا ہو سکتے ہیں یا برخلاف اس کے ملک عرب ہے کہ ریگستانوں سے بھرا پڑا ہے۔ یہاں بارش کی قلت آب و ہوا گرم اور ذرائع معاش تنگ ہیں۔ یہ اسباب قدرتی طور پر ان کی زندگی کو سادہ بنائیں گے ایسی صورت میں دولت بڑھے تو کہاں سے۔ اس کے علاوہ ایک صورت اور ہے یعنی ملک کا جغرافیہ بھی پیدائش دولت کے موافق ہو یا نہیں اور ذخیرہ ہو اور قدرتی وسائل بھی موجود ہوں لیکن پھر بھی جو دولت پیدا ہونی چاہئے وہ نہیں ہوتی۔ ایسی صورت جہالت۔ لاعلمی۔ سہل انگاری۔ کاہلی اور سب سے بڑا ہر سیاسی دباؤ سے پیدا ہو جاتی ہے اور یہ حالت بے حد نفوس ناک ہے اس تیسری صورت کی مثال میں ہمارا ہندوستان پیش کیا جاسکتا ہے۔

بیشک قدرتی حالات کو انسان تبدیل کر کے اپنی حسب اختیار نہیں بنا سکتا اور نہ پیدائش دولت میں (قدرت کی ناموفقت کی صورت میں) زیادہ اضافہ کر سکتا ہے۔ لیکن بہت سی صورتیں ہماری اختیاری بھی ہیں جنہیں وہ حسب ضرورت ترمیم و تبدیل کر سکتا ہے اور جن پر عمل کرنے اور نہ کرنے سے پیدائش دولت میں زیادتی اور کمی ہو سکتی ہے ان اختیاری صورتوں میں سے سب سے اہم کس ملک کی طرز معاشرت ہے کیونکہ مختلف قسم کی طرز معاشرت سے ملک میں مختلف حالات پیدا ہو سکتے ہیں اور یہی بہت کچھ ملک کی ترقی و تزلزل کا باعث ہو سکتی ہے۔ ہر ملک کا طبعی رجحان۔ رسم و رواج اور طریق زندگی مختلف ہوتا ہے جبکہ لازمی نتیجہ وہاں کی پیدائش دولت پر پڑتا ہے۔ ہم یہاں ہندوستان کو پیش نظر رکھ کر نظم معاشرت پر غور کریں گے اور دیکھیں گے کہ اس طریق کا یہاں کی معاشیات پر کیا اثر پڑ رہا ہے۔ آیا وہ ملک کی فلاح و بہبود کے لئے مفید ہے یا مضر۔

سب سے پہلے یہاں کی طریق ذات بندی کو لیجئے اور دیکھئے کہ اس کا پیدائش دولت پر کیا اثر پڑ رہا ہے، اُس پر غور کرنے سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ یہاں ذات بندی کا طریقہ کس طرح رائج ہوا اور اس وقت کیا فوائد پیش نظر تھے۔

طریق ذات بندی کے اثرات

جب آریہ ہندوستان آئے تو انھوں نے اپنی قوم کو ہندوستان کے اصلی باشندوں سے بالکل الگ رکھا۔ جیسا کہ ہر فاتح کا دستور ہے (کسی نئے ملک اور غیر قوم پر فتح حاصل کرنے کے بعد حکومت کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ مغتوحین کو اپنے میں جذب کر لیا جائے کہ دونوں ایک ہو جائیں اور معلوم رعایا کو اپنا بنائے یا یہ کہ خود اُن میں جذب ہو جائے اور اپنی تمام خصوصیات کھو بیٹھے۔ اگر فاتح قوم مغتوحین کو اپنے میں جذب کرنے کے بجائے خود اُن میں جذب ہو گئی تو یہ فتح نہیں بلکہ حقیقی شکست ہے اور وہ قوم بجائے فاتح کے مغتوح ہو جائیگی۔ جس طرح ایرانیوں نے یونان پر فتح پائی لیکن ان کے تمدن اور علم سے مرعوب ہو کر خود ان میں ضم ہو گئے۔ بہتر صورت تو یہی ہے کہ مغتوحین کو اپنے میں ضم کرنے لیکن یہ صورت ناممکن ہو تو دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اپنے کو مغتوحین سے بالکل علیحدہ رکھے جس طرح حجاج ابن یوسف نے اس قدر فتوحات کے باوجود عربوں کو دوسری قوموں سے علیحدہ رکھا۔ دور کیوں جائیں ہمارے سامنے ہندوستان میں خود انگریزوں کی مثال موجود ہے انھوں نے اپنی قوم کو ہندوستانیوں سے بالکل الگ رکھا ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ انکی تحلیل قدامت بنیاد ہندوستانیوں کو اپنے میں جذب نہیں کر سکتی اور اس کوشش میں بہت ممکن ہو کہ وہ خود ہندوستانیوں میں جذب ہو ہو جائے۔ پس انھوں نے طریق حکمرانی کے دوسرے اصول پر عمل کیے کہ اپنی قوم کو علیحدہ رکھا۔ اکبر نے پہلے اصول پر عمل کرنے کی کوشش کی مگر وہ خود نامعلوم طریقہ پر ہندوؤں میں جذب ہوتا چلا جاتا تھا۔ اور نگ زیب نے بروقت اس خرابی کو محسوس کر لیا اور راجپوتوں کی قوت توڑنے کی کوشش کی اسی اصول کی بنا پر آریوں نے بھی اپنے کو قدیم باشندوں سے علیحدہ رکھنا چاہا۔

پہلے پہل جب یہ ہندوستان میں داخل ہوئے تو ان میں ذات بندی نہیں تھی بلکہ سب کے سب آریا کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ ان میں کوئی خاص کام کسی خاص فرقے یا جماعت کے سپرد نہیں تھا بلکہ سب کے سب ملکر کاشتکاری۔ لڑائی۔ اور مذہبی کام انجام دیتے تھے۔ مگر وہ دونوں بعد اس طریق کار میں وقت محسوس ہوئی (یعنی ایک ہی شخص مختلف اوقات میں مختلف کام انجام دے) اس طرح وہ نہ تو فتنہ پھری میں ماہر ہو سکتے تھے اور نہ زراعت و تجارت میں اس وقت کو محسوس کر کے تقسیم عمل کے اعلیٰ اصول کی بنا پر انھوں نے جو شخص جس کام کے لئے موزوں تھا وہ کام اس کے سپرد کیا اب ایک ایک گروہ کے ذمہ ایک ایک کام ہو گیا۔ جو مذہبی رسوم ادا کرتے اور درس و تدریس کا کام انجام دیتے وہ برہمن سپاہی پیشہ کھتری۔ تجارت پیشہ ویش اور اصلی باشندے (جسکا کام سوائے غلامی اور ادنیٰ درجہ کا کام انجام دینے کی کچھ نہ تھا) شند کھلانے لگے جب ہر فرقے کے ذمہ ایک ایک کام سپرد کر دیا گیا تو وہ بیفکر ہو کر اپنے فرائض کو سرگرمی سے انجام دینے لگے کام کی تقسیم ہو جانے سے آریوں نے پہلے پہل بہت ترقی کی۔ اس وقت اس ذات بندی کے یہ معنی نہیں تھے کہ کوئی برہمن یا کھتری (اگر وہ چاہے تو) زراعت یا تجارت نہیں کر سکتا لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا ذات پات کی سختی بڑھتی گئی اور ان فرقوں میں سے مختلف فرقے پیدا ہونے لگے اور جو پیشہ جس فرقے نے اختیار کیا کچھ دنوں بعد وہ رسما اور مذہباً اسکی ترک نہیں کر سکتا تھا۔ زمانہ گزشتہ میں تو ذاتوں کی تقسیم سے فائدہ پہونچا لیکن اب اسی ذات بندی کی رسم سے ہندوستان کو

نقصان پہنچ رہا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ معاشی جدوجہد آج کل روز بروز ترقی پذیر ہے دنیا جس قدر نئی نئی ایجادیں اور اہم معلومات حاصل کر رہی ہے اُس کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ اسوقت یہ کہنا کہ طریق ذات بندی مثل اس روٹے کے ہے جو چلتی گاڑی میں اٹک جائے غلطانہ ہوگا۔ ذات بندی کی قیود سے عموماً ایک پیشہ در دوسرا پیشہ اختیار نہیں کر سکتا اُس کے علاوہ نئی نئی ایجادوں سے مکمل فائدہ بھی نہیں اٹھا سکتا۔ ذات بندی میں کچھ نہ کچھ فوائد ضرور ہیں مثلاً لڑکے بچپن سے اپنے والدین کو ایک ہی کام کرتے ہوئے دیکھتے ہیں اور اسے اپنے والدین سے سیکھتے ہیں جو نہایت فن دہی اور شفقت سے اُن کو سکھاتے ہیں، لیکن وقت یہ ہے کہ لڑکے کا بزرگ جتنا خود جانتا ہے اسے زیادہ کٹر ملتا سکتا اور نئی نئی ایجادوں کا ساتھ دے سکتا ہے۔ خصوصاً آج کل جبکہ روز بروز مصنوعاً کو فروغ ہو رہا ہے اگر ذات بندی کا طریقہ نہ ہوتا تو ہر ایک پیشہ در اپنے لڑکے کو جس کام میں چاہتا شرک کر سکتا تھا گویا یہ طریقہ دن بدن کم ہوتا جا رہا ہے۔ اور لوگ ذات بندی کی قیود سے آزاد ہوتا شروع ہو گئے ہیں خصوصاً تعلیم یافتہ لوگوں اور پیشوں میں یہ قید باقی نہیں رہی لیکن پھر بھی بہت باقی ہے۔ اور مجموعی حیثیت سے ملک کی پیدائش دولت کو نقصان پہنچانے کے لئے کم نہیں ادنیٰ طبقوں میں اگر کسی پیشہ میں لوگوں کی کثرت ہو تو وہ فوراً اسکو چھوڑ کر کسی ایسے کام میں جہیں لوگوں کی ضرورت ہو نہیں جاتے۔ ایسی صورت میں ایک طرف تو لوگوں کی زیادتی کی وجہ سے پیشہ دردن کی آمدنی کم ہوتی ہے اور دوسری صورت میں آدمیوں کی قلت سے اس قدر کام نہیں ہو سکتا جتنے کی ضرورت ہے۔

ہندوستان کی آبادی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہاں کمانے والوں کے مقابل کھانے والے زیادہ ہیں۔ بعض اوقات ایک شخص کو پورے خاندان کا بار اٹھانا پڑتا ہے۔ یہاں کے عام لوگ اپنی ہمت اور تھوڑی عورتوں کی عدم شرکت آمدنی پر قناعت کرنے والے ہیں۔ یہاں بیکاروں۔ محتاجوں اور فقیروں کی کثرت ہے۔ اذل تو دولت پہلے سے کم ہے دوسرے اُن کی وجہ سے اور کمی ہو رہی ہے۔ یونان میں جو قوت شہری ملکیتیں تھیں اسوقت اسپارٹا میں یہ دستور تھا کہ اگر کوئی بچہ کمزور یا ناقص پیدا ہوتا تو اس کو حکومت کی طرف سے ضائع کر دیا جاتا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ حکومت کی آمدنی بیکاروں پر نہ صرف ہو۔ ہندوستان میں پیدائش دولت کی کمی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہاں کی عورتیں عموماً بلا واسطہ پیدائش دولت کی کمی کی باعث ہیں یا کمزور بشرخانہ دہری کے کام انجام دیتی ہیں۔ یہاں کی طرز معاشرت ہی اس قسم کی ہے کہ عورتیں ایسے کاموں میں بہت کم حصہ لے سکتی ہیں عام طور سے یہاں کے لڑکے بھی جری عمروں تک والدین کے سر رہتے ہیں (اس سے ہماری یہ مراد نہیں کہ بچوں کو کم عمر میں محنت و شقت کرنی چاہئے یا عورتوں کو بھروسہ خانہ دہری ترک کر دینی چاہئے بلکہ اس بیان سے ہمارا مقصد صرف عام واقعہ کا اظہار ہے)

ہندوستان کی آبادی بہت کچھ تو قدامت پسندی اور کچھ قدرتی اسباب کی بنا پر اس قدر غیر مساوی طور سے پھیلی ہوئی ہے جس کی نظر شاید ہی کہیں ملے۔ ہندوستان کی آبادی کا غیر مساوی ہونا اسی سے ثابت

غیر مساوی آبادی

ہوتا ہے کہ یہاں آبادی کا اوسط کچھ کم تین سو سے لیکر تقریباً ایک ہزار فی مربع میل نکلتا ہے۔ یورپ کے کسی ملک میں آبادی کی تقسیم اس قدر غیر مساوی نہیں جب تک ملک میں آبادی مساوی طور سے نہ ہو اس وقت تک دولت اتنی پیدا نہیں ہو سکتی۔ جتنی مساوی تقسیم کی صورت میں پیدا ہوتی ہے ہندوستان میں کمی دولت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ جہاں آدمی ہیں وہاں کام کم اور جہاں کام ہے وہاں آدمی نہیں۔ اب دولت بڑھے تو کس طرح۔ اگر آبادی مساوی طور سے پھیل جائے تو بیکار مزدور کام سے لگ جائیں اور بیکار نہ رہنے کے معنی دولت پیدا کرنا ہے ہندوستان کی آبادی کو مساوی کرنے کی صورت یہ ہے کہ لوگ تو وطن اختیار کریں۔ لیکن یہاں کے باشندے اُس کے خوگر نہیں۔ دوسرے یہاں نقل و محنت پر ذات اور مقام کا خاص اثر پڑتا نظر آتا ہے۔ یہاں کے باشندے قدامت پسند ہیں اور عموماً اپنے وطن اور احباب و اعزہ کو چھوڑ کر نہیں چاہتے۔ قدامت پسندی کا مادہ خصوصیت سے یہاں کے کاشتکاروں میں بہت زیادہ ہے۔ اپنی پرانی جگہ نگلی ترشی سے گور کر سکتے ہیں لیکن ترک وطن منظور نہیں کرتے۔

کمسنی کی شادی | ہندوستان کی بہت سی بری رسموں میں سے ایک یہاں کی کمسنی کی شادی بھی ہے کمسنی کی شادی سے قبل اسکے گھر تو اچھے طور سے نشوونما پائیں اولاد ہو جاتی ہے جس سے اول تو بچہ کمزور پیدا ہوتا ہے اور عموماً مائیں مختلف امراض میں مبتلا ہو کر چھوٹی سی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہو جاتی ہیں۔ اور جو زندہ رہتی ہیں وہ اس قابل نہیں ہوتیں کہ اولاد کی پرورش کے اہم کام کو خوش اسلوبی سے انجام دے سکیں۔ جس سے بہت سے بچے کم عمری میں ضائع ہو جاتے ہیں اور بقیہ جو بچ کر جوان ہوتے ہیں انکی جسمانی اور دماغی قوتیں بھی تشفی بخش ثابت نہیں ہوتیں۔ لہذا ایسی پیدا کش کا فائدہ ہی کیا جس سے سولے تکلیف اور نقصان کے کچھ ہاتھ نہ آئے۔ کم عمری کی شادی سے مردوں پر قبل اس کے کہ وہ کمائیں دھرا بوجھ پڑ جاتا ہے۔ یورپ میں حالت اس کے بالکل برعکس ہے وہاں کی عورتوں کی شادی عموماً بچپن سے لیکر پینتیس برس کی عمر تک ہوتی ہے۔ اولاد زیادہ پیدا ہونے اور زیادہ مرنے سے کہیں بہتر ہے کہ کم ہو مگر زندہ ہے اور ملک کے کام آئے۔ (کم عمری کی شادی کا رواج بھی روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے لیکن پھر بھی ہندوؤں اور خصوصاً پنج طبقے کے ہندوؤں میں یہ رسم بڑی حد تک باقی ہے)

زراعت پیشہ کی زیادتی | ہندوستان کی آبادی کا بڑا حصہ زراعت پیشہ ہے۔ یہ طبقہ سب سے زیادہ قدامت پسند ہے اور کوئی دوسرا کام کرنا نہیں چاہتا۔ ہر کاشتکار کسی نہ کسی طرح تھوڑی سی بھی زمین حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ زمین محدود ہے اور خواہشمند زیادہ اس لئے زمین کی قیمت روز بروز بڑھ رہی ہے۔ یہاں کا کاشتکار حتی المقدور زمین ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ بعض اوقات تحصیل میں اُس کو لگان سے بھی زیادہ ادا کرنا پڑتا ہے۔

دولت کو بطور اندوختہ رکھنا | ہندوستانیوں میں ایک عیب یہ بھی ہے کہ وہ دولت کو اصل بنانے کی بہت کم کوشش کرتے ہیں۔ انکی دولت زیادہ تر بیکار اندوختہ بڑی رہتی ہے دوسری طرف پیدا کش دولت کے جتنے شعبے ہیں ان میں اصل کم

ضرورت بڑھ رہی ہے۔ ان خصوصیات کے یکجا ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں جتنی دولت بیکار ماند و خوکو اصل بندنے سے پیدا ہو سکتی تھی وہ نہیں رہی ہے۔ ہم نے ہندوستان کی طرز معاشرت کے متعلق جو کچھ یہاں کیا اس سے معلوم ہوا کہ بطور مجموعی پیدائش دولت میں جس قدر کا وہیں پیدا ہو رہی ہیں اور اس طریق زندگی سے ملک کا کیا کچھ نقصان نہیں ہو رہا ہے۔ پھر لطف یہ کہ تمام نقصان ہلکے کسی ناقابل شکست مجبوری سے نہیں بلکہ اپنی ہی جہالت اور لاعلمی سے برواشت کرنا پڑ رہا ہے۔ اس لئے اگر قوم پرست ان امور کی طرف توجہ کریں اور ان رسوم اور خیالی نیوڈ کو شش کر کے دور کریں تو پیدائش دولت میں خاطر خواہ اضافہ ہو سکتا ہے۔ ہماری طرز معاشرت کچھ قانون قدرت نہیں کہ ہم ہم اس میں کچھ دخل ہی نہیں دے سکتے۔ یہ تو ہماری اختیاری چیزیں ہیں جنہیں ہم حسب ضرورت ترمیم و تبدیل کر سکتے ہیں

ابوالمنصور حمید

دواخانہ شفا کی بھرتی

بکس زینت پانچ روپیہ | اسیں جازد مائشی دو دائیں ہوگی جو اپنے اپنے نعل میں بے نظیر اور لاجواب نایت ہوئی ہیں کم سے کم ایک مرتبہ آزمائیے

(۱) پنڈت رحن جس کے چہرہ پر سنے سے تمام داغ و چہرہ جہریاں دور ہو کر اصلی شباب کا رنگ ایک مہلت میں واپس آئے گا۔

(۲) داؤدی۔ ایک قسم کی گولیاں جنکے استعمال سے سینے کے امراض دور ہو کر آواز بیدار ہو جاتی ہے۔

(۳) زرد شباب۔ چند روز دو دھین ڈال کر کھانے سے لاغری دور ہوگی۔ اور چہرہ کا رنگ کندی ہو کر جسم کو نہایت پھر تیلانہ دے گا۔

(۴) سرمہ نور نظر آنکھ کے تمام امراض کے لئے اکیرتی شیشی عمر (۵) سنون ایک قسم کا نجی جو دانتوں میں مٹی کی طرح چپک پیدا کر تے ہیں اور ان کے امراض ہمیشہ کے لئے کھودیتا ہے۔

خضاب خورونی | سفید بالوں کو سنہ سے سیاہ کرے گا یا کو اتھائی قوت دے گا۔ دل و دماغ و معدہ کے امراض اور دائمی نزلہ کو دور کر کے انسان کی

کایا پٹ دیکھا صرف چالیس روز کے استعمال سے آدمی بالکل نئی چیز ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد باقی سارے فکلت و استعداد موجود ہیں قیمت سہ

سفوفی شاہی | وہ لوگ جو جوانی کی تمام قوتوں کو اپنے ہاتھوں پر برباد کر چکے ہیں ان کے لئے بے مثل چیز ہے نہ صرف گئی ہوئی قوت واپس آئیگی بلکہ جذبات

جوانی کو روکنا محال ہو جائیگا دل و دماغ ہر وقت کام کریں گے مدد اپنی صحیح فراخ انجام دے گا۔ بے اولادی کا داغ دور ہوگا۔ عورتوں کے لئے پرسوت

اور خیم کے تمام امراض میں اکیرتی شیشی سے

طکال عجیب | بہت سے ظاہر نے دیکھے ہوں گے لیکن قوت مردی کی تمام خرابیوں کو جو غلہ کار یوں سے پیدا ہوئی ہوں دفع کرنے کے لئے سہیہ جوانی کی

تمام قوتوں کو حیرت انگیز طریقہ سے ابھار کر اس نامعلوم خصوصیت سے بچھلا پڑتا ہے نہ سوزش ہوتی ہے قیمت سہ (منیجر دواخانہ شفا کی نظیر آباد لکھنؤ)

روح پانزی صہری علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگا کر استعمال کیجیے

اعتراف

— 36 —

نہ خراب دید ہوں میں نہ مری نسلتیں تو ہے
 نہ ترے قریب ہوں میں نہ ہوا اے جستجو ہے
 نہ ضرورت قصور نہ خیال کی ہوس ہے
 نہ شکایت جدائی نہ "وصال" کی ہوس ہے
 نہ شباب کی بتنا نہ جمال کی ہوس ہے
 نہ سکوت آشنا ہوں نہ سوال کی ہوس ہے
 نہ شہید ذوق ہوں میں نہ ہلاک شوق ہوں میں
 مگر اے حسین دیوی
 مجھے تجھ سے کج محبت

-(۲):-

جو بوقت صبح زریں تو کُن از آب تیں ہو
تزی ہر اداے رنگین اگر شراب میں ہو
تربے پہ حجاب جلوے چو شایب گنہ بوہوں
توی شوخوں کو چھینے جو گلاب رنگ بوہوں
عری سیتیاں چھلک کر جو شراب رنگ دیہوں
تو کبھی مری نگاہیں نہ خراب رنگ دیہوں
تو نہ آنکھ اُٹھاؤں دیر تو قریب ہو یہ نظر

مگر اے حسین دیوی
بے جھگڑے ہے محبت

47

کسی جھیل کے کنارے جو تو بھول توڑتی ہو
کبھی تسلیوں کو بکراے کبھی ان کو چھوڑتی :-
وہ نیاز مند ہو میں تجھے کر رہی ہوں بھد
وہ تری حسین چڑیاں تو ہے ہوتی ہیں صدق
تری ظفروں زلفیں تیرے لے رہی ہوں بوسے
مجھے کیا کہیں گے تجھو یہ خربزہ پوش جلوے
نہ نظر اٹھا کے دیکھوں نہ کسی عجب سے عجباں کوں
لنگر اے حسین (دلی)

-:(۳):-

کبھی جھوم کر بواٹھیں
 دہ شراب پاشن بوندیں
 سے بلغنیں پڑا ہو
 تو لاڑگا رہی ہو
 ترے دھک بار گیسو
 سر کوہ سے گھٹ میں
 جو پیام کیف لائیں
 دہ ترا حسین چھو لا
 ہو تمار سا بیستا
 ہو جہان کو چکا سودا

مجھے پاس گر بلائیں تو میں چھڑ دوں رہتا
نہ پھر ایک لمحہ ٹھہروں نہ ترے پاس تک نہ آؤں
مگر اے حسین دیوی
مجھے تجھ سے ہے محبت
:- (۵) :-

وہ حبیبِ بہشتی جو بہار بن کے آئے
شجر و گل و شہر پر نشہ بہار چھائے
تو زمین، رنگ و بو پر ہر خرام و نشین میں
ہوں ہزار میکدوسیا تری سستی حسین میں
ہو پیامِ کفر و تکبر تری زلفِ بزمِ میں
تو خیالِ سجدہ آئے نہ کبھی رنجی میں
تجھے اس طرح جو دیکھوں تو جہنم میں بھی نہ ٹھہروں
مگر اے حسین دیوی
مجھے تجھ سے ہے محبت
:- (۶) :-

لب نہر تو اگر ہو تو شبِ ماہِ مہلی میں
ترے گیسوے پریشاں ہوں ادائے کاغذی میں

نشاۂ شبابِ سحوب ترا حسنِ جھوم جائے
تری خوشیوں کی تھی جو صبا کو لگد لگائے
تو رہا بیاہوج دریا تجھے زمزمے سنائے
مجھے عجب دکھ کر تو جو اداسے سرکائے
تو میں پھر لوں نظر کو نہ کبھی اٹھائوں سر کو
مگر اے حسین دیوی
مجھے تجھ سے ہے محبت
:- (۷) :-

جو کبھی تو آہی جائے مری خلوتِ حسین میں
مرا ہاتھ بھی گر آئے ترے دستِ نازنین میں
تو مجھے تری قسم ہے میں جیسا ہے سحرِ کالوں
میں جھٹکے انگلیوں کو ترے ہاتھ سے چھڑاؤں
تو ہر اوجھ سے بولے نہ زبان سے کچھ نکالوں
جو کچھ اور مدعا ہو تو معاً قدم ہٹاؤں
تو مجھے اگر بلائے مری گرد بھی نہ پائے
مگر اے حسین دیوی
مجھے تجھ سے ہے محبت

روشِ صدیقی

دواؤں کا حیرت انگیز عمل
اگر کوئی شخص کہے کہ صرف دوا آگ پر رکھنے سے جس کو چاہیں آپ سحر کر سکتے ہیں تو آپ کو یقین نہ آئے گا،
اور اگر ہم یہ کہیں کہ اس دوا کو جسے متعدد بار آزمایا گیا ہے اس میں صبح پایا تو آپ کو اور زیادہ حیرت ہوگی اچھا تو
ایک بار صرف آزمائش ہی کے طور پر آپ اس شخص کا نام لکھ کر بھیج دیجئے جس کو آپ سحر کرنا چاہتے ہیں ہم آپ کو ایک سفوف بھیج دیں گے
آپ اس کو جلا کر دوا کا معجزہ ملاحظہ کیجئے۔ اس سفوف کی قیمت صرف پچاس روپے لیکن آزمائش کے طور پر پہلی مرتبہ ہم آپ کو تین روپیہ میں دیں گے اس کے
بعد اصلی قیمت لیجائے گی۔
مینجر شفا کی دوا خانہ نظیر آباد کھنؤ

غزلیات

رازِ اپیلوی

اگر ساحد شوق مکانِ سہمی و جستجو ہوتا تری تصویر میں ہوتا میری تصویر تو ہوتا
 فزیب ہجر ہوتا یا فزیب گفتگو ہوتا بشر تھا۔ میں بہر صورت ہلاکِ آرزو ہوتا
 ذرا مفہومِ حست کی بھی تم تشریح کر دیتے گنگاری کو کچھ اندازہ لا تقصید ہوتا
 چھپے بیٹھے ہو جو چاہو کوعرضِ متناہر کرنے کا مردِ حجب تھا کہ میں بھی روبرو ہوتا
 جد ہرے آپ کی آواز آئی اُسٹوڈوڈا میں آخر اور کس پہلو سے مجھ جستجو ہوتا
 اگر میں عشق سے پہلے کچھ سنا اُنکے رتبہ کو نہ بچ جستجو ہوتا نہ خونِ آرزو ہوتا
 جن میں بھول یہ ہرگز نہ رہو میرے رنگ جو چھینوں کہ کچھ بھی امتیاز رنگِ دوبرہنا
 مصیبت اب جو جھیلوں کا کہ تم سے نشنِ چمکو نہ دنیا ہی نہیں ہوتی جو میں آرام جو ہوتا

جھکی پڑتی ہے دنیا راز اس بے برگِ دباہی پر

عقب ہوتا جو شاخِ عشق میں جوشِ منو ہوتا

حافظ غازی پوری

چشمِ غماز ہر اک ذرہ ہے ویرانہ کا راز ہو جائے نہ افشا کہیں یوانے کا
 شوقِ تکمیل مجھے کچھ کس کے لایا ویر میں بھی تھا شاہِ فطرت کسی کا شانے کا
 دل میں آتشکدہ کا عشق اٹھانا بابوں شمع دیکھے تو ذرا حوصلہ پر ورنے کا
 جرمِ زوقِ خودی میں ہے سرورِ جاوید بخودی نام ہوا ہوش میں آجانے کا
 سوطِ نقیوں سے وہ ہر وزنتا ہے میں مجھے نازِ بے ایک بہانہ ہے تم ڈھانے کا
 سن کے کیا کوئی کہے دور کی آواز ہوں میں ایک عنوانِ ساہوں شوق کے نہانے کا

عیش و عشرت پہ ترانے وہ کیوں کر حافظا

جس نے دیکھا ہونظرِ کبھی ویر لے کا

ہر قسم کے غزلیات کا راز خانہ صہفر علی محمد علی تاجر عطر کائنات خرید کیجئے

آزاد انصاری

آج دل سے ضبطِ غم کا حوصلہ جاتا رہا آج دل ہم سے گیا گزرا ہوا جاتا رہا
آج تاجِ نظر خوش رنگِ نظر ہیں تو بولنا جس سے دلچسپی تھی وہ رنگِ رضا جاتا رہا
آج سوسانِ عشرت جلوہ گستر ہیں تو بولنا اک خوشی تھی چل بسی اک لطف تھا جاتا رہا
عالمِ حسرت ہوں کیا مسرور ہوں کیا شاد ہوں جو بنائے شوقِ تھادہ سلسلہ جاتا رہا
بہشتِ دل سونہ گھراؤں تو آخر کیا کروں جس سے لطفِ زیتِ تھادہ شغل جاتا رہا
ایک خوش وقتی کی صورت کیا مٹی دل مر گیا ایک دل مر گیا۔ ہر حوصلہ جاتا رہا
کام کیا بگڑا کہ دل حرفِ ہجومِ یاس ہے آس کیا ٹوٹی کہ جینے کامزا جاتا رہا
مر جائے دوستانِ بادِ فاصدِ مر حبا وہ وفا نہیں کیں کہ سودا کر دیا جاتا رہا

اب سرا آزاد ہے اور قید انکارِ جان

اب وہ آزادی کا سچا ادعا جاتا رہا

جگر بہیلوی

دل سے نکلی جو درد کی آواز کھل گیا مجھ پہ زندگی کا راز
خوگرِ لطف کر دیا تم نے کون اٹھائے سنگری کے ناز
نہیں اچھی ہے بنج دی غم کی کھل نہ جائے کہیں کسی کا راز
رکھ دیا سر کسی کے قدموں پر کاش نکلتے ہی طریقِ نیاز
اُن چین میں نہ چھوڑا اے صیاد توڑتا ہے اگر پر پر داز
ہنستے ہنستے رلا دیا تم نے چھیسڑ کر میرا ماجراے نیاز
دمِ قفس میں نکل گیا آخر ہائے میں اور حسرت پر داز

بندگی کرنے پر جب آئے تو کیا

کہیں رکھ دی جگرِ جبین نیاز

فرخ بنارسی

اس عشقِ تیرے ہاتھوں گھر گھر ہوئی بربادی
 پردہ کی طاقت بھی تاحد معین ہے
 کیا دیکھ ماضی پر موقوف رہا فی ہے
 اندر کے بندوں نے، شہساز بندوں کو
 بندہ ظلم کوئی ذرہ جنبش نہیں کر سکتا
 تیرے توتیا صمت پر افسانہ افسانہ رکھا
 توڑ اپنے ہی ہاتھوں کو یار عناصر کو
 انسانِ عالم کو عبرت سے سنے کوئی
 کوئے جو جہانیں بھی پردوں میں دغاؤں کے
 تقصیرِ قرآن پر الزام ادھر رکھا
 عیا دہی کچھ دن رہنے دے اسیر نہیں
 کیا روتے ہوا الفت میں ہوتا ہی فرخ
 ہاں گورغیاں کی بڑبڑتی گئی آبادی
 بھجوا سے مجبوری کسے کو ہے آزادی
 یہ قیدِ نفسِ بلبل ہوئی نہیں عیادی
 کیا جانتا کیا سمجھا کسوا سٹے اندادی
 اگر راز ہے سرسبز باجندری و آزار
 منظرِ کھوکھ سے دنیا میں ہونے فریادی
 پھر سیرِ حقیقت کر اسے طالبِ آزادی
 اس منظر و دلکش کا ہر نقش ہے فریادی
 کیا خوب مکانی ہے طرزِ رسمِ عیادی
 قسمت کے ترشتہ میں لکھی ادھر آزادی
 لاٹگی نفس میں پھر مجھ کو مری آزادی
 رسوائی پر رسوائی بربادی پر بربادی

مژدہ جنگوی

مری پہلی پہ ترس نہ کھا تو خیال مرا ذرا نہ کر
 کہوں کیوں ستم کو ترسے ستم ہے دلیلِ عشرت جانِ نغز
 یہ خلش بھی میری؟ وہ خلش جسے کیے مایہ عاشقی
 ہو خیال تیرا شریکِ غم مے حال سے نہ ہوئے خبر
 یہ حیا فریب و خانے کی کسی طرح کی یہ خلش رہی
 یہ اگر جگر سے الگ ہوا نہ خلش نہ کچھ مزا
 مجھے رہنے دے یونہی مضطرب مے دردِ دل کی دوا نہ کر
 ترسے ظلم میں ہیں نگاہیں میں یہ کیوں کہوں کہ جفا نہ کر
 مجھے زخمِ دل سے لگاؤ ہے مے چارہ اگر تو دوا نہ کر
 یہ تقاضا ایک اداسی مگر اس قدر بھی روا نہ کر
 اب اگر کرم کا خیال ہے مرا حال مجھ سے سنا نہ کر
 میں تیار تیرے نگاہ کے مے دل سے اسکو جلا نہ کر
 ارے او مژدہ! یہ بیخبریت لٹے شکوے بیاں نہ کر
 ہے امیدِ رسم و فا اگر کبھی ان سے عرض و فنا نہ کر

ہر قسم کا عطر مہر علی محمد علی تاجو عطر لکھنؤ سے ملگا کر استعمال کیجئے

۱۸	بنت الوقت	مولوی عبدالغنی	برام کی عزت داری	شوق دولتی مرحوم	۱۰۲	افغانو	۱۸	الذی
۱۸	ظلمات اشک	مولوی عبدالغنی	مولوی عبدالغنی	تراہ شوق	۱۰۲	ایم عرب	۱۸	بغلول
۱۸	عروس کر بلا	مولوی علم انسانی	مولوی عبدالغنی	قاسم دہرہ	۱۰۲	قیس دینی	۱۸	ی دنیا
۱۸	یاسین خام	برکے کا خلفہ	مولوی عبدالغنی	نیرنگ جمال	۱۰۲	یوسف و نجمہ	۱۸	چلٹ
۱۸	تخ کمال	مولوی عبدالغنی	مولوی عبدالغنی	خواجہ عبدالغنی	۱۰۲	زوال بقاد	۱۸	چیری
۱۸	ماہ عجم	مولوی عبدالغنی	مولوی عبدالغنی	زندان	۱۰۲	مینا بازار	۱۸	دار لوندی
۱۸	عجمہ خادند	مولوی عبدالغنی	مولوی عبدالغنی	اصلاح زبان	۱۰۲	مقدس تازنین	۱۸	ی فانوس
۱۸	سوؤ دہ	مولوی عبدالغنی	مولوی عبدالغنی	قواعد میر	۱۰۲	رہمتہ الکبری	۱۸	منصور موہنا
۱۸	مولانا حالی مرحوم	مولوی عبدالغنی	مولوی عبدالغنی	اصل اردو	۱۰۲	قلیان	۱۸	من انجیلنا
۱۸	مقدمہ شرواعی	مولوی عبدالغنی	مولوی عبدالغنی	شاعری کی پہلی کتاب	۱۰۲	خوفین ملک	۱۸	ملک العزیز و رحمتا
۱۸	دیوان حالی	مولوی عبدالغنی	مولوی عبدالغنی	دوسری کتاب	۱۰۲	منصور موہنا	۱۸	فردوس برین
۱۸	تاریخ دہلی	مولوی عبدالغنی	مولوی عبدالغنی	تیسری	۱۰۲	حسن کاڈاکو	۱۸	حسن کاڈاکو
۱۸	دہلی کی تاریخ	مولوی عبدالغنی	مولوی عبدالغنی	چوتھی	۱۰۲	دربار حرام پور	۱۸	غیب ان دہلی
۱۸	سرابیش	مولوی عبدالغنی	مولوی عبدالغنی	میرولی الشبلی	۱۰۲	غیب ان دہلی	۱۸	بدلتاں
۱۸	بالشک شہزادی	مولوی عبدالغنی	مولوی عبدالغنی	بندگی	۱۰۲	بدلتاں	۱۸	خونگک محبت
۱۸	شہید وفا	مولوی عبدالغنی	مولوی عبدالغنی	کاس الکرام	۱۰۲	سیرۃ عمر بن الخطاب	۱۸	سیرۃ عمر بن الخطاب
۱۸	منازل بیکم	مولوی عبدالغنی	مولوی عبدالغنی	سان انیب جلالہ	۱۰۲	انقلاب الامم	۱۸	انقلاب الامم
۱۸	شعلہ رنگین	مولوی عبدالغنی	مولوی عبدالغنی	دوم	۱۰۲	خاکات نجر	۱۸	خاکات نجر
۱۸	یامہ پیرس	مولوی عبدالغنی	مولوی عبدالغنی	سوم	۱۰۲	حکایات ہشتا	۱۸	حکایات ہشتا
۱۸	شیخ چلی	مولوی عبدالغنی	مولوی عبدالغنی	چہارم	۱۰۲	نظرت نسوانی	۱۸	نظرت نسوانی
۱۸	بہادر ترک	مولوی عبدالغنی	مولوی عبدالغنی	نکولان فصاحت	۱۰۲	شورالند و جلد	۱۸	شورالند و جلد
۱۸	برام کی دہلی	مولوی عبدالغنی	مولوی عبدالغنی	یادہ تاب	۱۰۲	مولوی عبدالغنی	۱۸	مولوی عبدالغنی
۱۸	انقلاب فراش	مولوی عبدالغنی	مولوی عبدالغنی	ظفر عمری	۱۰۲	سیر الصواب جلد اول	۱۸	سیر الصواب جلد اول
۱۸	حسن بنارس	مولوی عبدالغنی	مولوی عبدالغنی	چہارم	۱۰۲	دوم	۱۸	دوم
۱۸	فخری جاسوس	مولوی عبدالغنی	مولوی عبدالغنی	نیل چھتری	۱۰۲	منازل سارہ	۱۸	منازل سارہ
۱۸	ٹرکی حرم سما	مولوی عبدالغنی	مولوی عبدالغنی		۱۰۲		۱۸	
۱۸	جنگ طرابلس	مولوی عبدالغنی	مولوی عبدالغنی		۱۰۲		۱۸	
۱۸	برہم چور	مولوی عبدالغنی	مولوی عبدالغنی		۱۰۲		۱۸	
۱۸	زیر پست	مولوی عبدالغنی	مولوی عبدالغنی		۱۰۲		۱۸	

کنجی کارانه
عبد الرحمن ناصر
عروس مهر
سیاحات
کرشمه
دخا دار دلین
طواف زمین
سیاحت زمین
سیاحت هوا
تازنین مراکش
سمندر کی سحر
اسرار باشو کرم
روح لیلی
امین بک
حاج بن یوسف
یوسف پاشا
انقلاب عثمانی
نیلچی چتری
بهرام کی آزادی
بهرام کی گرفتاری
بهرام کی مرکزیت
پراسرار قتل
ادبی کتابیں
کمال شمع دیوان غالب
بزم خیال
مشاطہ سخن
انشار نسوان
مکاتیب حسن الملک
لیلی مجنوں ڈراما

شعری قاسم دہرو
فساد جوش
تاریخی کتابیں
تاریخ اندھ
تاریخ عرب
اسرار رنگون
خباہت لکھنؤ
سرخ اودھ
ارض ہنرین
تفوق الاذکیا
تاریخ نجیب الد
مراۃ الکونین
الہدیر
قصص الانبیاء
صمصام الاسلام
فتوح الشام
تذکرۃ الکرام
مہناج النبوة
حیات العلما
تذکرۃ الاسلام
روقتہ العصفاء
تاریخ اودھ
خواتین رنگون
سیر المتاخرین
اعمال نامہ روس
تاریخ مصر

سلاطین اودھ
صحفہ زرین
تاریخ دربار
تاریخ ایران
نصوف و اخلاق
سیر الطبیات
علم الاخلاق
خدا کی ہستی
نابینا علماء
مختارات صوفیہ
حیات ابدی
افراد کاسب
عوارف المعارف
بوستان معرفت
شجرۃ معرفت
مراثی
مراثی دبیر
مراثی انیس
مراثی غمیر
مراثی مونس
مراثی دلگیر
تذکرۃ اشعرا
تذکرۃ حصینی
گلشن بختار

سرپاس سخن
سراغ نظر اکبر آبادی
دوا دین فارسی
دیوان شمس تبریز
کلیات عراقی
دیوان حافظ
دیوان نوحہ خاں علی
کلیات انوری
دیوان مبدل
کلیات سعدی
دیوان عرفی
کلیات جامی
کلیات غائب
کلیات صائب
کلیات حزین
دیوان غفری
دیوان نظیر فایانی
دیوان غنی کشمیری
دیوان ناصر علی
دیوان ہلالی
کلیات جلال ابرار
دوا دین اردو
دیوان حسن ہلالی
کلیات ظفر
کلیات ہوسن

دیوان نایخ
کلیات چمر
کلیات سودا
کلیات انشا
کلیات نظیر اکبر آبادی
گلزار داغ
دیوان رند
دیوان ذوق
کلیات بہار
مراۃ العیب
مستغنیۃ عشق
قریاد طریغ
دیوان قاضی
دیوان شہیدی
فن شعر و عروض
زر کمال انبیاء
ترجمہ حقائق البلاغت
عروض سیفی
شجرۃ العروین
عجائب و غرائب
عجائب الخلق
عجائب الاساطیر
جمع لغزوں
طلم فرنگ
کارخانہ عالم

نادر
ادب و ادب
قریب صبر
سوز و غم
ہفت العیش
خط اسرار
شام جواہر
طلسی خانہ
زناہ نگار
شوکت آرا
دیس حایہ
خاقان جو
پیری کی
بہشتی زیور
بہشتی گوہ
اقبال دہ
حسن سجا
جواہر دیزہ
عشقون کو
پیری کی تو
ترتیب اظہار
اصلاح
شع ہادیہ
اصلاح
جان آرا
پیر کی
آر سی
سدا
توسیع

نگار بک بکینی نظیر آبا و لکھنؤ

(طبعہ نگار دین رس نظیر آبا و لکھنؤ)

